اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی ادبی، ثقافتی، سیاسی و سماجی صورتحال کی عہد بہ عہد عکاسی

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اردو)

مقالہ نگار:

محمد طاہر صابر

رجسٹریشن نمبر: 765/PHD/URD/F18

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۵ء

اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی ادبی، ثقافتی، سیاسی و سماجی صورتحال کی عہد بہ عہد عکاسی

مقالہ نگار:

محمد طاہر صابر

یہ مقالہ

پی ایچ ڈی (اردو)

کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا۔

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۵ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیرِ دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مندرجہ ذیل مقالہ پڑھا اور مقالے کے دفاع کو جانچا ہے۔ وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں:لاہور کی ادبی، ثقافتی، سیاسی وسماجی صورتحال کی عہد بہ عہد عکاسی**

پیش کار: محمد طاہر صابر رجسٹریشن نمبر:765/PHD/URD/F18

ڈاکٹریٹ آف فلاسفی

شعبہ: اردو زبان وادب

ڈاکٹر بشریٰ پروین ____________________

نگران مقالہ

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی ____________________

ڈین فیکلٹی آف لینگویجز

میجر جنرل شاہد محمود کیانی (ہلال امتیاز ملٹری)(ر) ____________________

ریکٹر

تاریخ: ________________

اقرار نامہ

میں محمد طاہر صابر حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف لینگویجز اسلام آباد کے پی ایچ ڈی (اردو) سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر بشریٰ پروین کی نگرانی میں مکمل کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا اور نہ آئندہ کروں گا۔

محمد طاہر صابر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

فروری، ۲۰۲۵ء

فہرست ابواب

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم		iii
اقرار نامہ		iv
فہرست ابواب		v
Abstract		vii
اظہار تشکر		x
باب اول: لاہور کی ثقافتی، ادبی اور سیاسی سماجی روایت		۱۲
الف	**تمہید**	۱۲
ا۔	موضوع کا تعارف	۱۲
۲۔	بیان مسئلہ	۱۲
۳۔	مقاصدِ تحقیق	۱۳
۴۔	تحقیقی سوالات	۱۳
۵۔	نظری دائرہ کار	۱۳
۶۔	تحقیقی طریقہ کار	۱۴
۷۔	مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق	۱۵
۸۔	تحدید	۱۵
۹۔	پس منظری مطالعہ	۱۶
۱۰۔	تحقیق کی اہمیت	۱۶
ب۔	لاہور کی تاریخ : قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد (۵۰ کی دہائی، ۶۰ کی دہائی، ۷۰ کی دہائی، ۸۰ کی دہائی اور مابعد)	۱۷
ج۔	لاہور کی ثقافت	۴۰
د۔	لاہور کی سیاست، سماج اور لاہور بطور ادبی دبستان	۵۴

باب دوم: لاہور کی سیاسی سماجی صورتحال: اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں ۷۴

الف۔ قیامِ پاکستان سے قبل کی آپ بیتیاں اور یادداشتیں ۷۴

ب۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادبی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی تاریخی ادوار میں بدلتی صورتحال ۸۴

ج۔ قیامِ پاکستان کے بعد سیاسی و سماجی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی تاریخی ادوار میں بدلتی صورتحال ۱۲۹

باب سوم: لاہور کی ثقافتی صورتحال: اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں ۱۵۵

الف۔ لاہور بطور ثقافتی مرکز: اجمالی جائزہ ۱۵۵

ب۔ لاہور کی ثقافتی صورتحال: ادبی آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں ۱۷۲

ج۔ سیاسی سماجی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی ثقافت ۲۰۹

باب چہارم: لاہور کی ادبی صورتحال: اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں ۲۲۹

الف۔ لاہور بطور ادبی مرکز: اجمالی جائزہ ۲۲۹

ب۔ قیامِ پاکستان سے قبل کی آپ بیتیاں اور لاہور کا ادب ۲۴۱

ج۔ قیامِ پاکستان کے بعد ادبی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کا بدلتا ادبی تناظر ۲۸۰

باب پنجم: مجموعی جائزہ / ماحصل / نتائج سفارشات ۳۰۷

الف۔ مجموعی جائزہ ۳۰۷

ب۔ نتائج ۳۱۷

ج۔ سفارشات ۳۱۸

کتابیات ۳۱۹

ABSTRACT

"Urdu Autobiographies and Memoirs: A Reflection on Lahore's Literary, Cultural, Political, and Social Landscape across Eras"

The present research explores the socio-political, cultural, and literary landscape of Lahore as depicted in Urdu autobiographies and memoirs. Throughout history, Lahore has been recognized as an ancient hub of politics, society, and literature, continuously expanding its grandeur with the passage of time. Historical records spanning thousands of years suggest that Lahore's political, social, and cultural prominence can be traced back to the Ghaznavid era. The Ghaznavid rule profoundly influenced Lahore in multiple aspects, including its linguistic landscape, leading to the widespread adoption of Persian. The fusion of Hindu and Muslim cultures during this period endowed Lahore with a distinct cultural identity.

Lahore continued its political and cultural growth under the Ghurid dynasty and the Delhi Sultanate. The reigns of Akbar, Jahangir, Shah Jahan, and Aurangzeb are considered the golden periods of Lahore's history. However, the Sikh rule marked a phase of intellectual, literary, and cultural decline. With the advent of the British, Lahore witnessed not only political transformations but also significant changes in its literary and intellectual atmosphere. The introduction of a new language further reshaped the city's cultural fabric.

Urdu autobiographies and memoirs provide more than just personal experiences of their authors; they offer deep insights into the socio-political and cultural conditions of their respective eras, thereby helping us understand Lahore's evolving cultural identity. This study examines how Urdu autobiographies and memoirs portray Lahore's cultural evolution and its role as a cultural epicenter. It also investigates how these texts, independent of conventional historical narratives, document Lahore's socio-political dynamics. Moreover, the research explores how Lahore's

changing literary landscape has been represented in these accounts, separate from conventional literary histories.

This study employs documentary, historical, and thematic research methods. To understand Lahore's transformation through Urdu autobiographies and memoirs, texts that specifically highlight Lahore's image have been analyzed. These autobiographies, written by notable literary, political, and social figures of the 20th and 21st centuries, serve as primary sources. The events, impressions, and observations documented in these writings have been critically examined to uncover Lahore's socio-political, cultural, and literary elements.

Given the nature of this research, it was imperative to explore Lahore's cultural heritage, political fluctuations, and literary developments through Urdu autobiographies rather than conventional historical texts. The study's significance lies in its structure: the first chapter provides a historical analysis of Lahore's political, social, and literary transformations from the Ghaznavid era to post-independence, using traditional historical sources. The subsequent chapters examine Lahore's socio-political and literary landscape before and after the partition, as portrayed in Urdu autobiographies and memoirs.

The research concludes that autobiographies are not merely personal narratives; rather, they transcend individual experiences to illuminate broader historical identities and societal transformations. Through these autobiographies, this study sheds light on Lahore's cultural evolution, socio-political shifts, and literary development across different eras. Before the Partition, Lahore stood as a vibrant intellectual, literary, cultural, and political hub, where literary gatherings flourished, and the city remained a focal point for political activities. However, after the creation of Pakistan, Lahore embarked on a new cultural journey, experiencing shifts in its political and literary dimensions. The narratives recorded in Urdu autobiographies and memoirs document this political

transition, revealing the multifaceted nature of Lahore’s politics, society, and literary traditions over time.

اظہارِ تشکر

تمام تر حمد و ثنا اس ذات کے لیے جو تمام جہانوں کو پیدا کرنے والا، ساری مخلوقات کو خلق کرنے والا، ہر ایک کے رزق کا اہتمام کرنے والا، ہر ایک چیز پر قدرت رکھنے والا، مختارِ کل اور سب سے زیادہ رحم و کرم کرنے والا ہے وہی ہے جس کی مدد شامل ہو تو ہر مشکل آسان ہو جاتی ہے بے شک وہی میرا مولا، مددگار اور کارساز ہے۔ میں اپنے رب، خالق و مالک اور پالنہار کا بے حد شکر گزار ہوں کہ جس نے اس مشکل سفر کی ہر راہ کو آسان بنایا۔ اگر اس کا لطف و کرم شاملِ حال نہ ہوتا تو شاید میں اس علمی سفر کو مکمل کرنے میں کامیاب نہ ہو پاتا۔ دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ مجھے علم نافع عطا فرمائے اور اسے عام کرنے میں ہمیشہ میرا مددگار رہے۔

میں اپنی زندگی کی قیمتی متاع، اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔ بچپن سے آج تک میرے علمی سفر میں میرے مددگار، رہبر و رہنما رہے۔ ہر مشکل گھڑی میں میرا حوصلہ بڑھایا، میرا ہاتھ تھاما اور اپنی ضروریات کو نظر انداز کر کے میری ضروریات کو پورا کیا۔ اس علمی سفر کی تکمیل ان کی دعاؤں اور بے لوث محبت کا ہی نتیجہ ہے۔ دعا گو ہوں کہ رب کریم انہیں صحت و سلامتی عطا فرمائے اور ان کا سایہ شفقت تا دیر مجھ پر قائم رکھے۔

میں اپنے تمام اساتذہ کرام کا بھی احسان مند ہوں جو پی۔ایچ۔ڈی کے دوران میرے معلم رہے۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم، ڈاکٹر عابد سیال، ڈاکٹر عنبرین تبسم شاکر جان، ڈاکٹر شفیق انجم اور ڈاکٹر ظفر احمد کا دل سے شکر گزار ہوں، جنہوں نے میرے علمی سفر میں رہنمائی کی۔ خصوصی طور پر میں نگران مقالہ ڈاکٹر بشریٰ پروین کا شکر گزار ہوں جن کی شفقت اور رہنمائی کی وجہ سے مقالے کی تکمیل مکمل ہوئی۔ اساتذہ کی فہرست میں ڈاکٹر کامران کاظمی اور ڈاکٹر خالد محمود سنجرانی کو بھولا نہیں جا سکتا، جن سے میں دلی عقیدت رکھتا ہوں۔ رب کریم تمام اساتذہ کی عزت و توقیر میں اضافہ فرمائے۔

میں اپنے پی ایچ ڈی کے تمام ہم جماعت کا شکر گزار ہوں جن کے ساتھ اس علمی سفر کا آغاز ہوا۔ خصوصاً حامد محمود کا تہہ دل سے احسان مند ہوں جو میرا حوصلہ بڑھاتے رہے اور ماخذات کی رسائی کے لیے شہر لاہور تک میرے ہم سفر بھی رہے۔ محترم زاہد کاظمی کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اپنی لائبریری کو میرے لیے کھلا رکھا اور جب بھی ان کے ہاں جانا ہوا انھوں نے پورے دل کے ساتھ میزبانی کی۔

آخر میں، اپنی فیملی اور ان عزیز و اقارب کا بھی دلی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہر موڑ پر میری جذباتی اور مالی مدد کی اور میرے لیے ہر ممکن سہولت فراہم کرنے کی کوشش کی۔ خاص طور پر اپنی شریکِ حیات اور جگر گوشوں آرزو فاطمہ اور محمد عبد اللہ کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میری کامیابی کے لیے دعائیں کیں۔ ان کے بغیر شاید میں اس علمی سفر کو مکمل نہ کر پاتا۔ رب کریم ہمارا حامی و مدد گار رہے۔ امین

محمد طاہر صابر

باب اول

لاہور کی ثقافتی، ادبی اور سیاسی سماجی روایت

الف۔ تمہید:

ا۔ موضوع کا تعارف

لاہور کا شمار دنیا کے بیس بڑے شہروں میں ہوتا ہے اور یہ پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے دوسرا بڑا شہر ہے۔ تاریخی پس منظر کے حوالے سے لاہور کا شمار ان شہروں میں ہوتا ہے جس کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ مختلف مذہبی شناختوں کی وجہ سے لاہور کے نام تبدیل ہوتے رہے۔ لوہ پور، لوہ کوٹ، لھور، لھاوار، لہاور سے لاہور سے جانا جانے والا راوی کنارے آباد یہ شہر مختلف حملہ آوروں کی گزر گاہ رہا ہے۔

ہندو مسلم شناختوں کے ساتھ ساتھ اس شہر پہ سکھوں کا قبضہ بھی رہا۔ ابتدائی دور میں یہاں ہندو راجاؤں اور راجپوتوں نے حکومت کی۔ غوری، غزنوی سے ابدالی تک یہ شہر مسلمانوں کے اثرورسوخ میں رہا۔ رنجیت سنگھ کی سکھ حکمرانی کا دور لگ بھگ ایک صدی قائم رہا۔ جس کے بعد سامراجی طاقتوں نے تسلط حاصل کیا اور تقسیم ہندوستان تک وہی قابض رہے۔یوں اس شہر کی ثقافت اور سماج میں کہیں نہ کہیں ان سب شناختوں کا تھوڑا یا زیادہ عکس اب بھی موجود نظر آتا ہے۔

لاہور ادبی، ثقافتی اور سیاسی سماجی مرکز رہا ہے اس لحاظ سے اس زرخیز شہر نے ادبی، سیاسی اور سماجی حوالوں سے کئی بڑے نام، تحریکیں اور رجحانات پیدا کیے۔ ان لوگوں کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کا ان تمام حوالوں سے ذکر ملتا ہے۔ عمومی تاریخ کے ساتھ ساتھ یہ ضروری ہے کہ ایسے ادیبوں اور دانشوروں کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کیا جائے۔

۲۔ بیان مسئلہ

تاریخی، ثقافتی، ادبی اور سیاسی و سماجی حوالوں سے لاہور کو پاکستان کا دل بھی کہا جاتا ہے۔ لاہور کی ایک تاریخ وہ ہے جو مورخین نے لکھی ہے اور تاریخ کا ایک خاکہ سماج سے جڑے دانشوروں اور ادیبوں نے

اپنی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں مرتب کیا ہے۔ تاریخی دستاویز کے ساتھ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ دانشوروں اور ادیبوں نے آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے بارے میں کیا لکھا ہے۔ان اشاروں کی موجودگی اس امر کی متقاضی ہے کہ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے ثقافتی، ادبی، سیاسی و سماجی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے۔

۳۔ مقاصد تحقیق

۱۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کو بطور ثقافتی مرکز ثقافت کے عہد بہ عہد ارتقا کو دیکھنا

۲۔لاہور کے سیاسی سماجی حالات کا آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں جائزہ لینا

۳۔لاہور ایک بڑا ادبی مرکز ہے آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں اس امر کا جائزہ لینا

۴۔ تحقیقی سوالات

۱۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی ثقافتی شناخت اور اس کے عہد بہ عہد ارتقا کی عکاسی کس طرح سامنے آتی ہے؟

۲۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی سیاسی و سماجی کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کی عکاسی کس طرح بیان ہوئی ہے؟

۳۔ادبی تاریخ سے قطع نظر آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے بدلتے ادبی منظر نامے کا کس طرح جائزہ لیا گیا ہے؟

۵۔ نظری دائرہ کار

لاہور اپنے علمی و ادبی، تہذیبی و ثقافتی حوالے سے اہمیت رکھتا ہے۔ تقسیم سے پہلے اور بعد یہ شہر ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کا مرکز رہا ہے۔یوں ادبی بیٹھکوں میں فکری اور فنی حوالوں سے تحریریں اور تخلیقی صلاحیتیں پروان چڑھیں۔ جہاں ادب میں جدید رجحانات آئے وہیں ثقافتی، سیاسی اور سماجی سطح پہ

تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ مقالہ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں موجود واقعات پر سماج، سیاست اور ادب کے حوالے سے بحث کرے گا۔

ادب کی ہر صنف میں سماجی نفسیاتی مطالعے موجود ہیں یوں کہیں کہ ادب سماج سے جڑا ہے سماج ہندی زبان کا لفظ ہے اور اردو میں اس کے لیے عربی زبان کا لفظ **معاشرہ** مستعمل ہے۔ سیاست سماج کا ایک اہم ستون ہے۔ سماج یا معاشرہ انسانوں کے ایسے بڑے گروہ کو کہتے ہیں جسے تہذیبی اور ثقافتی حوالوں سے دوسرے ملتے جلتے گروہوں سے امتیاز حاصل ہو۔ تہذیبی اور ثقافتی قدروں میں تبدیلی سے معاشرے میں بھی ارتقائی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں جس کی بنیاد پہ کوئی معاشرہ اور اس میں بسنے والے انسان دوسرے معاشروں سے جدید کہلاتے ہیں۔ معاشرتی وجود میں ثقافت دھڑکن کی سی حیثیت رکھتی ہے۔رسوم و رواج، علم و فن، عقیدے اور فکر کو مجموعی طور پر ثقافت کہا جاتا ہے۔ اگر ہم لاہور کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہاں ثقافتی اور تہذیبی اقدار ہمیشہ غالب رہی ہیں۔

اس تحقیق میں بطورِ نظریاتی اساس نئی تاریخی تنقید(New Historicism) کو اختیار کیا گیا ہے۔ یہ تنقیدی نظریہ امریکی محقق اسٹیفن گرین بلاٹ نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں متعارف کروایا۔ نئی تاریخی تنقید کی بنیاد اس تصور پر ہے کہ ادبی متون اپنی داخلی ساخت کے ساتھ ساتھ اپنے خارجی سماجی، سیاسی اور ثقافتی سیاق و سباق کے آئینہ دار بھی ہوتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق ادبی تحریر کو محض ایک انفرادی تخلیقی اظہار کے طور پر نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ یہ اپنے عہد کی فکری جہتوں، طاقت کے ڈھانچوں اور نظریاتی تشکیل سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔ اس تنقید میں مصنف کی ذات اور اس کا بیانیہ ایک اجتماعی و تاریخی عمل کا حصہ تصور کیا جاتا ہے۔ جس میں انفرادی تجربہ دراصل عہد کے وسیع تر سماجی و ثقافتی مظاہر سے جڑا ہوتا ہے۔ آپ بیتیوں کے مطالعے میں یہ نظریہ اس امر کو ممکن بناتا ہے کہ ان متون کو ذاتی سوانحی اظہار کے ساتھ ساتھ عہد بہ عہد ادبی فضا، سیاسی و سماجی صورتحال اور ثقافتی رویوں کے معتبر ماخذ کے طور پر بھی برتا جائے۔

۶۔ تحقیقی طریقہ کار

اس مقالے کی تیاری کے لیے دستاویزی یا تاریخی طریقہِ تحقیق اپنایا جائے گا۔ دورانِ تحقیق بنیادی ماخذات لاہور کے حوالے سے آپ بیتیوں اور یادداشتوں پر مشتمل ہوں گے۔ موضوع کی مناسبت سے

بنیادی ماخذات کی فہرست میں مزید آپ بیتیوں اور یادداشتوں کی گنجائش موجود ہے جن کو تحقیق کے دوران مقالے کا حصہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کی ثقافتی، ادبی، سیاسی و سماجی صورتحال تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سیاسی و ادبی تاریخیں، متعلقہ مضامین، رسائل و جرائد اور دیگر ثانوی ماخذات سے بھرپور استفادہ کیا جائے گا۔

۷۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق

اس موضوع پر ماقبل تحقیقی مواد روایت اور آپ بیتیوں کے تعارف کا احاطہ کرتا ہے جیسے ڈاکٹر اطہر قسیم نے "اردو ادب کی آپ بیتیاں۔ تحقیقی و تنقیدی جائزہ" کے عنوان سے اردو آپ بیتیوں کا مجموعی طور پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ اس مقالے کی ابواب بندی کی فہرست میں آپ بیتی کی روایت، تقسیم ہند سے قبل اردو ادب کی اہم آپ بیتیاں، بیسویں صدی کے نصف آخر میں اردو ادب کی اہم آپ بیتیاں، اردو ادب میں خواتین کی اہم آپ بیتیاں، بیسویں صدی میں اردو ادب کی دیگر مقبول عام آپ بیتیاں، اکیسویں صدی کے اوائل میں اردو ادب کی آپ بیتیاں، ارتقا و ماحاصل شامل ہیں۔ اس سے قبل جتنی تحقیق آپ بیتیوں پہ کی گئی ہے ان میں آپ بیتیوں کا مجموعی اجمالی جائزہ پیش کیا گیا ہے یا اسلوبیاتی حوالوں سے منتخب آپ بیتیوں پہ تحقیق کی گئی ہے۔ جب کہ زیر نظر موضوع میں لاہور کی ثقافتی، ادبی، سیاسی سماجی صورتحال کی عہد بہ عہد عکاسی پیش کی جائے گی جو اس سے پہلے کسی کا موضوعِ تحقیق نہیں رہا۔ اس حوالے سے تحقیقی کام لاہور کے منظرنامے کو سمجھنے میں مددگار ہو گا۔ اردو آپ بیتیوں پر لکھے گئے پی ایچ ڈی کے تحقیقی مقالات کی تفصیل درج ذیل ہے:

اردو کی آپ بیتیاں: تحقیقی و تنقیدی جائزہ، اطہر قسیم، نمل یونیورسٹی اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

اردو کے تین فکشن نگاروں (سلیم اختر، رشید امجد، نثار عزیز بٹ) کی آپ بیتیوں کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ، لبنیٰ نصیر، بہاوالدین زکریا یونیورسٹی، ملتان، ۲۰۰۵ء

۸۔ تحدید

اس مقالے کی تحدید مقالے کے موضوع اور لاہور کے حوالے سے ہی ممکن ہے اس لیے مجوزہ تحقیق کے دوران صرف ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں کو مقالے کا حصہ بنایا جائے گا جن میں موضوع کی مناسبت

سے لاہور کا تذکرہ موجود ہے جن آپ بیتیوں میں سر سری ذکر ہے وہ موضوع کا حصہ نہیں ہوں گی۔ لاہور کی سیاسی سماجی اور ادبی مورخین کی تاریخوں کا ذکر بطور امدادی وسائل کے تو کیا جا سکتا ہے لیکن یہ موضوع کے بنیادی دائرہ کار میں موجود نہیں ہے۔ اسی طرح منظوم یادداشتیں بھی اس تحقیق کا حصہ نہیں ہوں گی۔

9۔ پس منظری مطالعہ

لاہور کی تاریخی کتب کے ساتھ ساتھ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے ایسی تمام آپ بیتیاں اور یادداشتیں زیر مطالعہ رہیں گی جن میں لاہور کسی بھی حوالے سے موضوع بنا ہو۔ اس کے علاوہ مجوزہ موضوع کے حوالے سے تحریر کیے گئے مضامین، تجزیے، تبصرے اور تحقیقی و تنقیدی مواد بھی پسِ منظری مطالعہ کا حصہ ہوں گے۔

۱۰۔ تحقیق کی اہمیت

اردو میں آپ بیتی لکھنے کا رواج عام ہے اور ان کی تعداد بھی سینکڑوں میں ہے ان آپ بیتیوں میں اکثر ایسی ہیں جن کو واقعات کا ریکارڈ تو کہا جا سکتا ہے لیکن آپ بیتی کے فن پہ وہ پورا نہیں اتر تیں۔ سیاسی سماجی، ادبی اور ثقافتی حوالے دیگر اصناف سخن میں موجود ہوتے ہیں جو بیان کرنے والے کی فکر کا پر تو سمجھے جاتے ہیں لیکن آپ بیتی وہ صنف ہے جس میں درج واقعات کو فکشن کا لبادہ نہیں پہنایا جاتا۔ یوں ان کی واضح شکلیں آپ بیتی نگار کے قلم سے صفحات پہ نقش ہوتی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ اپنے عہد کے ممتاز ادیبوں اور دانشوروں کے سیاسی سماجی اور ادبی شعور کا پتہ لگانے کی کوشش جائے جو لاہور کے بدلتے منظر نامے کو واضح کرتا ہو۔ یہ مقالہ لاہور کے ثقافتی، ادبی، سیاسی و سماجی منظر نامے کے حوالے سے ایک دستاویز کی حیثیت رکھتے ہوئے لاہور کی ثقافتی، ادبی، سیاسی سماجی صورتحال کو سمجھنے میں مددگار ہو گا۔

ب۔ لاہور کی تاریخ: قیام پاکستان سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد:

تاریخی اعتبار سے لاہور برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ کا ایک ایسا روشن باب ہے جو صدیوں سے سیاست ،تجارت ،روحانیت اور علم و فن کا مرکز رہا ہے۔راوی کنارے آباد یہ قدیم شہر مختلف ادوار میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے حکمرانوں کے زیر اثر رہا۔ جس سے لاہور کی طرزِ زندگی، فنِ تعمیر اور معاشرت میں تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ لاہور کی تاریخ صرف عمارتوں، قلعوں اور باغات کی داستان نہیں سناتی بلکہ یہ بدلتے ادوار میں لاہور کے باسیوں کی جدوجہد، معاشرت اور تخلیقی اظہار کا عکس بھی واضح کرتی ہے اس تاریخ کا مطالعہ ہمیں نہ صرف ماضی کے عظیم ورثے سے روشناس کراتا ہے بلکہ موجودہ دور میں اپنی تہذیبی شناخت کو سمجھنے کا شعور بھی فراہم کرتا ہے۔جیسا کہ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> تاریخ کسی قوم یا علاقہ کے صرف اہم واقعات بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ ان اہم و غیر اہم واقعات کے پیچھے جو قوتیں، جو عوامل، جو اسباب کام کر رہے ہیں ان کو سمجھنے اور تجزیہ کرنے کا کام ہے۔ جدید مورخ تاریخ نویسی کو یہی معنی سمجھتا ہے ۔ تاریخ ہر نسل کے لیے ایک سبق، ایک عبرت کا کام کرتی ہے۔ تاکہ اس کی روشنی میں ظاہر اور باطن میں بہنے والے مختلف دھاروں کا تجزیہ کر کے ہر نسل اپنے حالات و عوامل کا جائزہ لے کر انسانیت کے وسیع تر مفاد میں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے عمومی مفاد میں اپنی حکمت عملی متعین کر سکے۔(۱)

برصغیر پاک و ہند وہ خطہ ہے جہاں مسلمان صدیوں پہلے فاتح کے طور پر داخل ہوئے اوراس خطے میں نہ صرف سکونت اختیار کی بلک یہاں کے تمدن، سماج اور ثقافت پہ بھی اثر انداز ہوئے۔برصغیر پاک وہند پہ مسلمان سپہ سالاروں کے حملوں کا آغاز حضرت عمر کے دور سے ہوتا ہے۔"تاریخ ہند" میں درج ہے کہ:

> اہل اسلام میں سے اول ہی اول جس نے ہند پر حملہ کیا۔ ابو العاص عامل یمن تھا۔ اس نے حضرت عمر کے عہد میں ۱۵ ہجری مطابق ۶۳۲ء کے اندر بمبئی کے قریب مقام تھانہ پر فوج کشی کی۔(۲)

حضرت علی کے دور میں کچھ علاقہ فتح ہوا۔ اس کے بعد محمد بن قاسم کی کمان میں مسلمان آٹھویں صدی کے آغاز میں سندھ کے راستے اس خطے میں داخل ہوئے اور فتح یاب ہوئے۔ یہ وہی زمانہ ہے جب مسلمانوں کا اثر و رسوخ یورپ تک پھیل گیا تھا اور انہیں فتوحات حاصل ہو رہی تھیں۔ ابتدا میں مسلمان سندھ کے علاوہ کسی دوسرے راستے سے برصغیر پاک و ہند میں داخل نہ ہوئے۔ اس بارے میں نور احمد چشتی لکھتے ہیں:

> تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت اہل اسلام سوائے راستہ سندھ کے کوئی اور راہ ہندوستان میں آنے کا نہ جانتے تھے۔ بعد اس کے ہند کے کئی قلعے سبکتگین نے افغانوں کو کسی طرح اپنے ساتھ ملا کر فتح کیے اور لاہور اور ملتان کو اپنے قبضہ میں کر لیا اور ان سے بہت سی غنیمت لے کر اپنے ملک کو چلا گیا۔(۳)

اسلام کے ابتدائی زمانہ میں مسلمان برصغیر پاک و ہند میں سندھ کے راستے سے آئے اور محمد بن قاسم ۷۱۱ عیسوی میں سندھ کے راجہ کو شکست دے کر ملتان تک آیا۔ بعد کے ادوار میں، ترک اور افغان حملہ آوروں نے اس خطے میں داخل ہونے کے لیے زیادہ تر پشاور کے راستے خیبر پاس کو چنا۔ لاہور کی طرف رخ کرنے والے پہلے مسلمان حملہ آور سلطان محمود غزنوی تھے۔ ابتدائی حملے میں غزنوی نے لاہور پر حملہ کیا اور یہاں کے راجہ کو شکست سے دوچار کیا اور مال اسباب لے کر واپس غزنی روانہ ہو گیا۔ یوں اسلام کی پہلی گزر گاہ سندھ کو سمجھا جاتا ہے اور پشاور کو مسلمان حملہ آوروں کے لیے مرکزی داخلی راستے کی حیثیت حاصل رہی۔ "تاریخ ہند" میں لکھا ہے کہ:

> پہلا حملہ ۱۰۰۱ء– یہ حملہ راجہ جے پال اول والئے لاہور پر ہوا۔ جس میں راجہ کو شکست ہوئی اور محمود قلعہ ویہند فتح کر کے غزنی کو الٹا پھر گیا راجہ جے پال غیرت کے مارے زیست سے بیزار ہو کر چتا میں بیٹھ کر مر گیا۔ (۴)

لاہور اس وقت میں ایک ایسے علاقے کے طور پر استعمال ہوتا تھا جسے فتح کر کے حملہ آور ہندوستان کے دوسرے بڑے شہروں کو فتح کرنے کے لیے اپنی قوت میں اضافہ کرتے۔ زیادہ تر تاریخی روایات میں لاہور کی شہرت اور ترقی کو محمود غزنوی کے حملوں سے جوڑا جاتا ہے لیکن یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ

لاہور کی شناخت اس سے پہلے سے بھی موجود تھی اور اس پہ راجپوتوں کی حکومت رہی اس لیے لاہور، برصغیر پاک وہند کے قدیم ترین شہروں میں شامل ہے۔ اسی بات کو ماسٹر امرناتھ یوں بیان کرتے ہیں:

> کشمیر اور راجپوتانہ کی پرانی کہانیوں میں لاہور ایک ہندو صوبہ بتایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ پہلے پہل جن مسلمان بادشاہوں نے آ کر پنجاب پر حملہ کیا۔ وہ اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ لاہور اس وقت ہندو راجاؤں کے قبضہ میں تھا اور بہت سی ریاستیں اس کے ماتحت تھیں۔(۵)

غزنویہ سلطنت سے پہلے بھی لاہور جغرافیائی اعتبار سے تجارتی قافلوں کی گزر گاہ رہا اور پنجاب پہ حملہ آور ہونے والوں کے لیے مرکز کا کام کرتا رہا۔ قافلوں کی گزر گاہ ہونے کی وجہ سے لاہور کی سیاسی سماجی صورتحال میں تبدیلی آتی رہی۔ ان ابتدائی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ لاہور ایک قدیم شہر ہے اور اس کا تذکرہ راجپوتانہ تاریخ کی پرانی کتابوں میں بھی ملتا ہے یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ اس تاریخی شہر کو عروج غزنوی عہد سے ملتا ہے لیکن اس کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت اپنی جگہ صدیوں پہلے بھی مسلم تھی۔ یوں لاہور کی قدامت کے حوالے سے مختلف آرا پائی جاتی ہیں اور کسی حتمی تاریخ کا ذکر نہیں کیا جاسکتا کہ لاہور کب آباد ہوا؟

سلطان محمود غزنوی نے ہندوستان پر متواتر حملے کیے۔ ان پے در پے ۱۷ حملوں کے بعد غزنوی کی سلطنت کو وسعت ملی اور اس نے پنجاب کو اپنی سلطنت میں داخل کر لیا۔ غزنوی نے پہلا حملہ لاہور پر ہی کیا۔ غزنویوں نے اس علاقے پر اپنی حکمرانی قائم کی اور اسلامی ثقافت، فن تعمیر اور طرز حکمرانی کو متعارف کرایا۔ لاہور جغرافیائی، تاریخی اور تمدنی حوالے سے پہلے ہی اہمیت کا حامل تھا لیکن غزنوی دور میں اس شہر کو چار چاند لگ گئے۔ یہی وہ دور تھا کہ لاہور ایک ممتاز مسلم شہر بن گیا۔ ۔ غزنوی کے لاہور پر تصرف کے بعد کئی صدیاں لاہور مسلمانوں کے ہی کے زیر اثر رہا۔ غزنوی اور اس کے بعد کے ادوار میں، مسلمانوں نے نہ صرف حکومت کی بلکہ کئی صدیاں یہاں سکونت بھی اختیار کی۔ حکمرانوں کے نام بدلتے رہے، ان کے خاندان تبدیل ہوتے رہے لیکن غزنوی سے آخری مغل حکمران تک لاہور تجارتی حوالوں سے اہم رہا، دفاعی اعتبار سے مرکزی حیثیت رہی، مذہبی اور روحانی حوالوں سے صوفیاء اور اہل علم کا مسکن رہا۔

غزنوی دور میں لاہور کی سیاسی سماجی اور ثقافتی صورتحال میں نمایاں تبدیلیاں واقع ہوئیں۔ گیارہویں صدی میں ہندوستان پر کئی حملوں کے بعد غزنوی نے ۱۰۲۱ء میں لاہور فتح کیا اور اسے سلطنت کے صدر مقام کا درجہ دیا تو اس شہر کی سیاسی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ غزنویوں نے اسلامی ثقافت اور فنون کو فروغ دیا جس کے نتیجے میں مساجد، مدارس اور علمی مراکز قائم کیے گئے۔ اس دور میں لاہور مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا مرکز رہا جہاں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ہندو اکثریت میں تھے پھر مسلمان، ہندو اور دیگر مذاہب کے لوگ اس خطے میں بسنے لگے۔ محمود غزنوی کی فتوحات کے باعث لاہور کے معاشرتی ڈھانچے میں بھی بدلاؤ آیا اور اسلامی اثرات بڑھے۔ علی محمد خان نے لکھتے ہیں:

> غزنی خاندان کا دار لسلطنت اگرچہ غزنی تھا تاہم غزنوی سلطنت کا دوسرا بڑا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی خاص اہمیت کا حامل تھا بلکہ اس خانوادے کے آخری تین بادشاہوں نے تو لاہور کو اپنی سلطنت کا صدر مقام قرار دے کر یہیں مستقلاً اقامت اختیار کی۔ غزنوی خاندان کا یہ دور علما اور فضلا کا دور تھا۔ ایک طرف تو غزنی ان کا مسکن و ماویٰ تھا اور دوسری طرف لاہور(۶)

یہ بات اپنی جگہ اہمیت رکھتی ہے کہ کسی غیر علاقے سے کوئی فاتح کسی ملک میں داخل میں ہوتا ہے اور وہاں آباد ہوتا ہے تو اس کے رہن سہن اور زبان میں نئے علاقے کی نسبت سے کافی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس علاقے کے رہنے والے ان تبدیلیوں کو چاہتے یا نہ چاہتے ہوئے اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوں کہ حکمرانوں کی زبان فارسی تھی اس وجہ سے فارسی زبان و ادب کو فروغ ملا جس کا سلسلہ مغلیہ دور تک جاری رہا۔ دوسری صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ نئے وارد ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہو اور وہ کسی مضبوط تہذیب سے تعلق رکھتے ہوں تو اس کا اثر بھی مقامی زبان اور رہن سہن کے طور طریقوں پہ پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب محمود غزنوی پنجاب آیا تو اس وقت یہاں کی زبان پنجابی تھی اور رفتہ رفتہ زبان نے اظہار کے طریقے بدلے اور ایک نئی شکل اختیار کی۔ اس کا بیان تبسم کاشمیری یوں کرتے ہیں:

> غزنوی عہد کی پنجاب کی زبان لاہوری (پنجابی) تھی جو پورے علاقے کا ذریعہ اظہار تھی۔ اس زبان پر فتوحات اور حملوں کے بعد نئے لسانی اثرات مزید بڑھنے

لگے تھے اور جب ۱۰۲۱ء میں غزنوی دور میں لاہور مرکز قرار پایا تو یہ اثرات مزید گہرے ہوتے ہوئے ایک نیا لسانی عمل ظاہر کرنے لگے۔ ترکی، عربی، فارسی، پنجابی اور اپ بھرنش کے باہمی ملاپ سے زبان کا ایک ایسا اسلوب تیار ہونے لگا جو مقامی آبادی اور نئے آباد کاروں کے لیے نیا ذریعہ اظہار بنتا گیا۔(۷)

بارہویں صدی کے آخر میں غزنوی سلطنت زوال پذیر ہونا شروع ہوئی تو اس کے بعد غوری حکمرانوں نے برصغیر میں اپنا اثرورسوخ بڑھانا شروع کیا۔ شہاب الدین غوری نے لاہور کا اقتدار غزنویوں سے لیا اور اسے اپنی سلطنت کا حصہ بنایا۔ یہیں سے غوری سلطنت کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ غوریوں نے بھی لاہور کی طرف بحیثیت مرکز خصوصی التفات کیا جس کی بدولت، لاہور ایک فوجی اور انتظامی مرکز بن کے ابھرا اور اس سے لاہور کی سیاسی اہمیت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اس طرح غوری سلطنت کی سرحدیں شمالی ہندوستان تک پھیل گئیں۔ غوری نے لاہور کو بنیاد بنا کر دلی کی طرف بڑھنے کا سوچا لیکن عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ بعد ازاں اس خواب کو قطب الدین ایبک نے دہلی کو مرکز بناتے ہوئے برصغیر میں اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ قطب الدین ایبک نے پرتھوی راج چوہان کو زیر کرتے ہوئے شمالی ہندوستان کے کئی علاقوں اور دلی پر اپنا تصرف قائم کیا۔ اس جیت نے ہندوستان میں مسلم حکومت قائم کرنے کے حوالے سے درپیش مشکلات کو آسان کر دیا۔ لاہور نے سیاسی مرکز کا کردار ادا کرتے ہوئے مسلم ریاست کو دلی تک وسعت دی۔ قطب الدین ایبک لاہور کی دفاعی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھا۔ اِس لیے لاہور کو دفاعی حوالوں سے مضبوط کرنے کے لیے قطب الدین ایبک نے لاہور میں خود قیام کیا۔ اس بارے "تاریخ فرشتہ" میں یوں بیان کیا گیا ہے:

> سلطان قطب الدین کو ہر وقت تاج الدین یلدوز کی طرف سے خطرہ رہتا تھا کہ کہیں وہ لاہور پر حملہ نہ کر دے۔ لہٰذا اس نے دشمن کو اس کے ارادے سے باز رکھنے کے لیے چند سال تک لاہور میں قیام کیا۔ اس دوران میں وہ اہل لاہور سے بڑی مہربانی کا برتاؤ کرتا رہا اور انھیں اپنے جود و سخاوت سے مالامال کرتا رہا۔(۸)

تیرھویں صدی ،لاہور کی تاریخ میں اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں لاہور کی تاریخ میں متعدد اتار چڑھاؤ کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ اسی دور میں لاہور، دہلی سلطنت کا مرکز بنا۔ داخلی حوالے سے نہ صرف لاہور کے استحکام کو مسائل کا سامنا کرنا پڑا بلکہ بیرونی حملہ آوروں کی وجہ سے بھی اس کی مشکلات میں اضافہ ہوا۔ یوں یہ دور لاہور کے استحکام اور زوال کے ملاپ کی عکاسی کرتا ہے۔اس کی حکمرانی میں لاہور، دہلی سلطنت کے نمائندہ شہر کے طور پر سامنے آتا ہے جو سیاسی اور تجارتی حوالے سے ایک اہم مرکز قرار پایا۔ قطب الدین ایبک کے دور میں لاہور کی طرف خاص توجہ کی گئی۔ قطب الدین ایبک کی وفات کے بعد لاہور میں منگولوں کے حملے شروع ہوئے اور تیرھویں صدی کے چوتھے عشرے میں ان حملوں کی شدت میں اضافہ ہوا۔ منگولوں کے بارے مشہور ہے کہ جب وہ کسی شہر کا رخ کرتے تھے تو اس کی تباہی کا سبب بنتے تھے۔ لاہور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لاہور جو ترقی کی راہ پہ گامزن تھا اسے ان پے درپے حملوں سے نقصان پہنچا۔ تاریخی عمارات اور ثقافتی مراکز بھی ان حملوں سے متاثر ہوئے۔ لاہور کی ترقی دیکھتے ہوئے پہلے لوگ یہاں کا رخ کر رہے تھے لیکن ان حملوں کی وجہ سے اس میں نہ صرف کمی آئی بلکہ جو لوگ لاہور میں پہلے سے آباد تھے وہ بھی نقل مکانی کرنے لگے۔ کیوں کہ منگولوں کے حملوں کی وجہ سے ان کے جان و مال یہاں محفوظ نہ رہے۔

منگولوں کے حملوں اور دیگر بیرونی عوامل کے ساتھ ساتھ اندرونی طور پر لاہور کو سیاسی مسائل درپیش رہے۔ مختلف حکمرانوں کے درمیان اقتدار کے حصول کی جنگ جاری رہی۔ یوں اندرونی سیاسی اختلافات نے بھی لاہور کو کمزور کیا جس سے لاہور کی ساکھ متاثر ہوئی۔ لاہور اس سے پہلے تیزی سے ترقی کر رہا تھا اب وہ محدود ہو کر رہ گئی۔ "نقوش" میں اس دور کے لاہور کی پیش کش یوں کی گئی ہے:

> ان اسباب کی بنا پر شہر لاہور کی رونق اور عظمت جو غزنوی اور غوری دور سلاطین کے زمانے سے اوج کمال پر پہنچی ہوئی تھی خاک میں مل گئی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت لاہور ایک معمولی قصبہ تھا جسے سیاسی نقطہ نظر سے کوئی اہمیت حاصل نہ تھی اور نہ اس دور کی سیاسی تاریخوں میں اس کا ذکر آیا ہے۔ (۹)

تیرھویں صدی کا یہ دور لاہور کی تاریخ میں تباہی اور تعمیر نو دونوں حوالوں سے اہم سمجھا جاتا ہے۔ منگولوں کے حملوں سے جہاں شہر کو تجارتی حوالوں سے نقصان پہنچا اور سیاسی طور پر بھی غیر مستحکم ہوا۔ وہیں

اس دور میں بھی لاہور نے اپنی روحانی شناخت برقرار رکھی اور سلطنتِ دہلی کے لیے یہ شہر اہم رہا۔ یہی وجہ ہے کہ آنے والے دنوں میں اس شہر نے دوبارہ اپنے آپ کو مستحکم کیا اور جنوبی ایشا کی تاریخ میں ایک اہم مرکز کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔

لاہور کے سیاسی منظر نامے پر چودھویں صدی عیسوی میں بھی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ لاہور اس دور میں مقامی حکمرانوں کی چپقلشوں کی زد میں رہا۔ اس صدی میں تغلق حکمران رہے۔ لاہور کو بیرونی حملہ آوروں کی گزر گاہ ہونے کی وجہ سے سیاسی عدم استحکام کا سامنا رہا۔

چودھویں صدی کے شروع میں دہلی اور لاہور پر تغلق خاندان حکمران رہا۔ لاہور اس دور میں بھی سلطنت کا اہم صوبہ رہا اور اپنے محل و قوع اور غیر معمولی جغرافیائی اہمیت کی وجہ سے تغلق دور میں بھی اس شہر کی طرف خاص التفات کیا گیا اور دفاع کے حوالوں سے لاہور کو مضبوط کرنے لیے خاطر خواہ توجہ کی گئی۔ لیکن محمد بن تغلق کے دور میں کئی ایسی متنازع اصطلاحات نافذ کی گئیں جس کی وجہ سے عوام میں مخالفت پیدا ہونے لگی اور اس کی وجہ سے کئی بار سلطنت کو بغاوتوں کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ جن کو سلطنت کسی نہ کسی طرح دبانے میں کامیاب ہوتی رہی۔ فیروز شاہ تغلق کے چار دہائیوں پر مشتمل اقتدار کو باقی حکمرانوں کی نسبت پر امن سمجھا جاتا ہے لیکن اس کے بعد تھوڑے ہی عرصے میں یکے بعد دیگرے کئی حکمران تبدیل ہونے کی وجہ سے سلطنت کا زوال شروع ہوا۔

تیموریوں کے ہندوستان پر حملوں کے دوران، باقی شہروں کی طرح لاہور بھی متاثر ہوا۔ تیمور نے چودھویں صدی کے آخر میں ہندوستان پر حملہ کر کے بشمول دہلی کئی شہروں کو لوٹا۔ لاہور شہر اگرچہ تیمور کے براہ راست حملے کی زد میں نہیں رہا لیکن سلطنت کا اہم شہر ہونے کی وجہ سے متاثر اور غیر مستحکم ہوا۔ امیر تیمور (جسے "تاریخ فرشتہ" میں جلی ہوئی لکڑی کہا گیا ہے) ایک جنگجو اور سخت دل آدمی تھا لیکن بزرگان دین کی عزت و توقیر کا خیال اس قدر تھا کہ جب وہ لاہور کی طرف پیش قدمی کرتا ہوا ملتان، تلمبہ اور دیپال پور کے علاقوں کو زیر کر کے پاکپتن پہنچتا ہے تو اس کے بارے میں سید محمد لطیف اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> جلد ہی تیمور خود بھی شہزادے سے آن ملا۔ اجودھن (پاک پتن شریف) کو اس لیے چھوڑ دیا گیا کہ وہاں حضرت شیخ فرید الدین شکر گنجؒ کا مزار شریف تھا، لہذا اس

> احترام میں اسے نہ چھیڑا گیا، اگرچہ حملہ آوروں کی آمد پر وہاں کے باشندوں نے شہر کو مکمل طور پر خالی کر دیا تھا۔(۱۰)

مقامی حکمرانوں اور سرداروں نے اس سیاسی افراتفری کا فائدہ اٹھایا اور انہوں نے مقامی خود مختاری کی کوششیں کیں۔ سلطنت دہلی نے کئی بار اس شورش کو دبایا اور اپنا اثر و رسوخ قائم رکھا۔ یہ صدی لاہور کے لیے ایک غیر یقینی صورتحال کی صدی رہی۔ جس میں دہلی سلطنت کے تغلق خاندان کے زوال، تیموریوں کے حملے اور مقامی سرداروں اور حکمرانوں کی خود مختاری کی کوششیں زیادہ قابلِ ذکر ہیں۔

پندرھویں صدی، لاہور کے سیاسی افق پر مسلسل تبدیلیوں کا زمانہ ہے۔ اس دور میں مقامی حکمرانوں کو عروج حاصل ہوا اور سلطنت دہلی زوال کا شکار رہی۔ یہ زمانہ مغل سلطنت کے ابتدائی اثرات کا بھی گواہ ہے۔ پندرھویں صدی کے آغاز سے ہی دہلی سلطنت اپنا اثر و رسوخ کھو چکی تھی اور اس کی طاقت لاہور جیسے دور دراز کے علاقوں میں کمزور پڑ چکی تھی۔ اس لیے زیادہ دیر تک لاہور کو اپنے تصرف میں رکھنا اُس کے لیے محال ہو گیا جس کی بنا پر مقامی حکمرانوں نے اپنا قبضہ جمایا۔

سادات کے دورِ حکومت میں لاہور کی سیاسی اہمیت ویسی نہ رہی جیسی اسے پہلے حاصل تھی کیوں کہ سید خاندان دہلی کی حکمرانی بچانے میں مصروف تھا۔ وہ لاہور کی طرف توجہ نہ کر پائے البتہ لودھی خاندان کے دورِ حکومت میں لاہور دوبارہ دہلی سلطنت میں شامل ہوا۔ اسے سیاسی حوالے سے مضبوط کیا، انتظامی حوالے سے بہتر کرنے اور دفاعی اعتبار سے مضبوط کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ کیوں کہ لاہور کو محل وقوع کے اعتبار سے اہمیت حاصل تھی۔ سید محمد لطیف لکھتے ہیں:

> سیاسی نقطہ نظر سے قدرت نے پنجاب کو جزیرہ نمائے ہند میں نمایاں مقام عطا کیا ہے۔ اس کو حقیقی معنوں میں اس عظیم سلطنت کے نیزے کا فولادی پھل اور شمال میں ہندوستان کی نگران چوکی کہنا زیادہ مناسب ہو گا ابتدائی ادوار سے پنجاب نے غیر ملکی حملہ آوروں کے مقابلے میں فصیل اور میدان جنگ میں بیرونی چوکی کا کام کیا ہے اور اس نے مشرق میں سب سے زیادہ فوج جمع کرنے کا ثبوت بھی فراہم کیا ہے۔(۱۱)

لاہور ہر گزرتی صدی کے ساتھ سیاسی تبدیلیوں کا شکار رہا اور مختلف خاندان اس پر حکمرانی کرتے رہے۔ سولہویں صدی کا عہد بھی لاہور میں سیاسی تبدیلیوں کا زمانہ ہے لیکن اس دور کی اہم بات یہ ہے کہ باقی ادوار کی نسبت یہ صدی لاہور کے لیے سیاسی حوالوں سے اہم اور فیصلہ کن رہی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس دور میں ہندوستان پہ حکمرانی کا تاج مغلوں نے اپنے سر پہ سجایا جو آنے والی صدیوں میں بھی انہی کے خاندان کی زینت رہا۔ ظہیر الدین بابر نے ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے مقام پہ فیصلہ کن لڑائی میں سلطنت دہلی کو زیر کر کے مغل سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

> چنانچہ بابر نے ۱۵۲۴ء میں کابل سے آ کر لاہور پر تسلط کیا اور پھر دو سال بعد ۱۵۲۶ء میں پانی پت کے میدان پر ایک مشہور معرکے میں ابراہیم لودھی کو شکست دی یہ پانی پت کی اول لڑائی کہلاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کی سلطنت سلاطین افغانیہ کے ہاتھ سے نکل کر سلاطینِ مغلیہ کے قبضے میں چلی گئی۔(۱۲)

ظہیر الدین بابر (۱۵۳۰ء-۱۵۲۶ء) نے کابل کی بجائے آگرہ کو مغل دار لحکومت کا درجہ دیا۔ لاہور بھی مغلوں کے زیر تسلط آ گیا مگر مغل حکمرانوں سے چند سالوں کے لیے یہ سلطنت چھن بھی گئی جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کی۔ شیر شاہ سوری کا مختصر دور لاہور اور پنجاب کے دیگر علاقوں کے لیے اہم رہا۔ شیر شاہ سوری نے گرینڈ ٹرنک روڈ (جی ٹی روڈ) بنوایا۔ اس روڈ کو، سڑک شیر شاہ، سڑک اعظم، شاہراہ اعظم، بادشاہی سڑک جیسے ناموں سے بھی جانا جاتا رہا ہے۔ لگ بھگ ۲۳۰۰ میل طویل یہ سڑک نہ صرف لاہور کو ہندوستان کے دیگر شہروں سے جوڑتی ہے بلکہ اس کا دوسرا کنارہ پشاور کے راستے کابل سے ملتا ہے۔ اس سے سفر اور تجارت کے ذرائع آسان ہوئے۔ نصیر الدین محمد ہمایوں نے مغل سلطنت کی بحالی کی تگ و دو جاری رکھی اور دوبارہ حکمرانی کا تاج اپنے سر سجایا۔ مغل سلطنت دہلی کے دوبارہ حکمران ٹھہرے اس طرح لاہور بھی دوبارہ مغل سلطنت کے دائرہ اختیار میں آ گیا۔ شیخ محمد اکرام شیر شاہ سوری کے مختصر دورِ حکومت میں کیے جانے والے ترقیاتی کاموں کے حوالے سے یوں بیان کرتے ہیں کہ:

عہد مغلیہ کے مورخین نے عام طور پر شیر شاہ سے انصاف نہیں کیا۔ لیکن پھر بھی جو حالات ہم تک پہنچے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ شیر شاہ بڑا بیدار مغز بادشاہ تھا اور اگر موت اسے کچھ مہلت دیتی تو شاید آج ہندوستان کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔(۱۳)

ظہیر الدین بابر کے بعد جلال الدین محمد اکبر کا دور (۱۶۰۵ء-۱۵۵۶ء) ، مغل حکمرانی کا دورِ زریں اور مستحکم دور رہا۔ معاشی، اقتصادی اور تجارتی حوالوں سے نہ صرف لاہور بلکہ پورا ہندوستان اس کے دور میں مستحکم ہوا۔ اکبر نے لاہور کی تعمیر و ترقی پر خصوصی توجہ دی۔ اس دور نے لاہور کی تاریخ کو ہر حوالے سے متاثر کیا اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ اکبر کے دور اور بعد میں کچھ عرصہ نورالدین جہانگیر کے دور میں لاہور مغل حکومت کا دار لحکومت بھی رہا۔ مغلوں کی سلطنت میں دارالحکومت تبدیل ہوتے رہے۔ جیسے کابل موسم گرما میں دار لسلطنت ہوتا تھا اسی طرح ہندوستان میں بھی کئی بار ایسا ہوا کہ ایک ہی وقت میں دو دارالحکومت رہے۔ تعمیرات کے حوالے سے شاہی قلعہ کی صورت میں اکبر کی یادگار آج بھی موجود ہے۔ مجموعی طور پر سولہویں صدی لاہور کی ترقی کی شاہد رہی۔ لاہور جو پہلے بھی جغرافیائی حوالے سے اہم رہا ہے وہ اس دور میں ایران، ہندوستان اور دیگر وسطی ایشیا کے ممالک کے درمیان ایک اہم تجارتی گزر گاہ بھی بن گیا۔ محمد دین فوق، اکبر کے دور میں لاہور کی تجارتی ترقی کے زمانے کا بیسویں صدی سے تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> لاہور میں شالبافی اور پشمینہ کا کام اس کثرت سے ہوتا تھا کہ لاہور اس زمانہ میں چھوٹا کشمیر معلوم ہوتا تھا۔۔۔ اسی لاہور میں جہاں سولھویں صدی عیسوی میں ایک ہزار سے زیادہ شالبافی کے کارخانے تھے وہاں آج بیسویں صدی میں ایک بھی نہیں ہے۔(۱۴)

سترھویں صدی میں لاہور کے سیاسی حالات پہلے کی نسبت مستحکم رہے۔ مرکز میں مغلوں کی ہی حکومت رہی البتہ مختلف دہائیوں میں حکمران تبدیل ہوتے رہے۔ ان حکمرانوں کی پالیسیوں میں بدلاؤ کے زیر اثر شہر بھی بدلاؤ کا شکار رہا۔ نور الدین جہانگیر نے ۱۶۰۵ء میں حکومت سنبھالی تو اکبر کی لاہور کے حوالے سے پالیسیوں کو برقرار رکھا۔

نورالدین جہانگیر (۱۶۲۷ء-۱۶۰۵ء) نے نہ صرف لاہور بدستور سلطنت کا دارلحکومت رہا۔ یہیں دربار سجا کرتا اور اہم اجلاس بھی یہیں منعقد کیے جاتے۔ نورالدین جہانگیر کے ۲۵ سالہ دورِ حکمرانی میں لاہور سیاسی حوالے سے مضبوط ضرور ہوا لیکن اس کی حکمرانی کے آخری چند سالوں میں سلطنت کو قبائلی بغاوتوں کا بھی سامنا رہا۔ لاہور ان مغربی سرحدوں کی بغاوتوں کا سر کچلنے کے لیے ایک فوجی چھاؤنی کے طور پر استعمال ہوتا رہا۔ جہانگیر کثرت شراب کا عادی تھا اور اس بنا پر وہ بیمار ہو چکا تھا، امور سلطنت ملکہ نور جہاں کے ہاتھ میں تھے اس وجہ سے سیاسی معاملات میں خلل پڑا اور ان اندرون خانہ سیاسی کمزوریوں سے لاہور کے سیاسی حالات متاثر ہوئے۔ جہانگیر کی وفات کے بعد شہاب الدین محمد خرم شاہجہان نے (۱۶۵۸ء-۱۶۲۷ء) میں اقتدار سنبھالا۔ شاہجہان کے اپنے باپ جہانگیر سے تعلقات کشیدہ رہے۔ اقتدار کے حصول کے لیے اس نے باقی شہزادوں کو قتل کروادیا۔ محمد دین فوق لکھتے ہیں کہ:

> جہانگیر کی وفات (۲۷-صفر ۱۰۳۷ھ) کے وقت اس کا بیٹا شہریار لاہور میں تھا اور اس کے ساتھ اور بھی کئی شہزادے اسی قلعہ میں تھے۔ آصف جاہ نے لاہور آکر شاہزادوں کو باہم لڑوایا۔ اور ہزارہا آدمی ہلاک کرانے کے بعد ان تمام شہزادوں کو بھی ۲۶- جمادی الاول یعنی جہانگیر کی وفات کے تیسرے مہینے کے بعد تیغ کے گھاٹ اتار دیا۔ اور اپنے داماد شاہجہان کو تخت و سلطنت کی مبارکباد دی۔ (۱۵)

شہاب الدین محمد شاہجہان نے اقتدار کے لیے قتل گری کی ایک ایسی ہولناک رسم کی بنیاد ڈالی جس نے ظہیر الدین بابر کی اس طاقتور مغلیہ سلطنت کو کھوکھلا کیا اور اس رسم کو بعد میں آنے والوں نے بھی خوب نبھایا۔ شاہجہان نے جو کیا تھا ویسا ہی سلوک اس کے ساتھ بھی روا رکھا گیا۔

اکبر اور جہانگیر کے ادوار میں لاہور خصوصی توجہ کا مرکز رہا۔ شاہجہان نے اسے روش کو برقرار رکھتے ہوئے اس شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ شاہی قلعے میں دیوانِ خاص اور دیگر عمارتوں کا اضافہ بھی اسی دور میں ہوا۔ شاہجہان کے بیس سالہ دورِ حکومت میں لاہور نے ہر حوالے سے ترقی کی۔ سیاسی اعتبار سے لاہور اس دور میں اپنے عروج پر تھا جس کی وجہ سے لاہور ایک ترقی پذیر اور پر امن شہر بن گیا۔

اُدھر درباری اختلافات زور پکڑ رہے تھے اِدھر پیری کی وجہ سے شاہجہان کو صحت کے مسائل کا سامنا تھا۔ شاہجہان کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ جاری تھی اور شاہجہان کو انہی مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جو اس نے اقتدار کے حصول کے لیے روا رکھے تھے۔ سترھویں صدی کی چوتھی دہائی میں سیاسی اختلافات نے زور پکڑا اور محی الدین محمد اورنگزیب عالمگیر (۱۷۰۷ء-۱۶۵۸ء) نے اقتدار پر قبضہ جما لیا، باپ شاہجہان کو قید میں ڈالا اور بھائیوں کو قتل کروا دیا۔ لاہور اقتدار کے حصول کے لیے رشتوں کی پامالی اور اس سیاسی تبدیلی کا بھی شاہد ہے۔

ملک میں موجود دیگر سیاسی قوتوں نے ایسے وقت میں سر اٹھانا شروع کیا۔ مراٹھوں اور سکھوں کی تحاریک نے مغل حکومت کے لیے مسائل پیدا کیے۔ سیاسی حوالے سے ایک اہم مرکز ہونے کی بنا پر، لاہور نے ان تحریکوں کے اثرات محسوس کیے۔ مغلوں نے ان تحاریک سے نمٹنے اور شہر لاہور کی حفاظت کے لیے اپنی فوجی قوت کو مزید تقویت دی۔ ساتویں دہائی میں لاہور فوجی مرکز کی صورت میں سامنے آیا اور یہیں سے سکھوں اور شمال مغربی سرحدوں پہ درپیش بغاوتوں کے خلاف کارروائیوں کا آغاز ہوا۔ شہر کے منتظمین نے علاقے کو باہر کے حملہ آوروں سے بچانے کے لیے ہر ممکن اقدامات کیے لیکن اندرونی طور پر شورششیں سر اٹھاتی رہیں۔ اورنگزیب کی سخت سیاسی حکمت عملیوں اور کئی محاذوں پر عسکری مہمات نے مغلیہ حکومت کو کمزور کیا۔ لاہور جو تیزی سے ترقی کی راہ پہ گامزن تھا حکومت کی ان پالیسیوں کی وجہ سے سیاسی طور پر عدم استحکام کا شکار ہوا اور اقتصادی حوالے سے بھی لاہور کو متاثر کیا۔

یہ صدی مغل حکومت کی لاہور کے حوالے سے عروج و زوال کی عکاس ہے۔ اس میں لاہور نے ترقی کا زمانہ بھی دیکھا۔ سیاسی حوالے سے اندرونی خطرات کا سامنا بھی کرنا پڑا اور ان مسائل سے نمٹنے کے لیے عسکری قوت میں اضافہ بھی کیا گیا۔ لاہور بطور فوجی مرکز بھی استعمال ہوتا رہا اور اس صدی میں لاہور کو اقتصادی حوالے سے بھی مختلف مسائل درپیش رہے۔

طول و عرض پہ پھیلی ہوئی مغلیہ سلطنت کے لیے اٹھارھویں صدی اہم صدی ہے جو ہمیں لاہور پہ مغل سلطنت کے زوال اور سکھوں کے عروج کی داستان سناتی ہے۔ اس صدی میں لاہور سیاسی حوالے سے عدم استحکام کا شکار رہا، اندرونی سازشوں اور بیرونی دراندازی سے نمٹنے کے لیے مصروف عمل رہا۔ لاہور ایک

عرصے سے مغلیہ حکومت کے زیر اثر تھا اور مختلف ادوار میں سیاسی حوالے سے تبدیلیوں کا شکار بھی ہوتا رہا۔ اسی طرح کئی سالوں تک مرکزی سلطنت کا دارلحکومت بھی رہا اور فوجی مرکز کے طور پر بھی کام کرتا رہا۔ لیکن لاہور اس صدی کے اوائل سے ہی ایسی سیاسی تبدیلیوں سے گزرا جو پہلے پیش آنے والی تبدیلیوں سے کسی قدر مختلف تھیں۔ شیخ عزت اللہ بنگالی مغلوں کے زوال کے ساتھ لاہور کے زوال کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مغلوں کے زمانے میں شمال مغربی گزر گاہوں اور پنجاب کی وسطی شاہراہوں کے یہاں پر مل جانے سے لاہور نے بڑی شان حاصل کی اور ان کے زوال پر یہ شہر بھی بے چارگی کے عالم میں جا پڑا۔ (۱۶)

اورنگ زیب کی وفات تک لاہور مغلوں کے تصرف میں تھا۔ مراٹھوں اور سکھوں کی سیاسی تحریکوں نے اورنگ زیب کے دور میں ہی زور پکڑ لیا تھا لیکن مغلیہ حکومت کسی نہ کسی طرح انہیں قابو کرنے اور ان کی قوت کم کرنے میں کامیاب ہوتی رہی۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مغل سلطنت اندرونی طور پر کمزور ہوتی گئی۔ اقتدار کی ہوس میں مغل شہزادوں کی لڑائیوں نے مرکز کو کمزور کیا۔ لاہور جو پہلے ہی سکھوں کی طرف سے مسائل کا سامنا کر رہا تھا۔ اس پہ مرکزی حکومت کی اس سیاسی کمزوری کا زیادہ اثر ہوا۔ مغلوں کی مرکزی حکومت کی طرف سے کم فوجی امداد ملنے کی وجہ سے لاہور کی دفاعی حکمت عملی کمزور ہوتی چلی گئی۔ اسی اثنا میں سکھ رہنماؤں نے مغل سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا اور اپنی سیاسی قوت ظاہر کرتے ہوئے پنجاب کے کئی علاقوں پہ قابض ہو گئے۔ پنجاب کا مرکزی شہر ہونے کی بنا پر، لاہور اس سیاسی تبدیلی کا مرکز رہا۔ مغلوں نے سکھوں کی طاقت کو دبانے کے لیے ممکنہ اقدامات کیے اور سکھوں کو زیر کرنے میں بھی کامیاب ہوتے رہے لیکن ان لڑائیوں کی وجہ سے شہر کی امن و امان کی صورتحال متاثر ہوئی۔ صدی کی دوسری دہائی کے اختتام تک مغل حکومت کا لاہور میں اثر و رسوخ کمزور پڑ گیا۔ مرکزی حکومت سے دوری کی بنا پر لاہور پر مغل حکومت کی گرفت کمزور ہوئی تو سکھوں نے اس عرصے میں اپنی سیاسی ساکھ کو مضبوط کیا۔ اندرونی خطرات میں کروٹیں بدلتے لاہور کو بیرونی حملہ آوروں نے بھی بے چین کیے رکھا۔ نادر شاہ نے لاہور کی اس سیاسی صورتحال کو بھانپتے ہوئے حملہ آور ہونے کے لیے تیاریاں شروع کیں۔

نادر شاہ ۱۷۳۹ء میں حملہ آور ہوا تو اس نے مرکزی سلطنت کے صدر مقام دہلی کے ساتھ ساتھ لاہور پہ بھی چڑھائی کی اور لاہور پہ قابض ہوا۔ نادر شاہ کا یہ حملہ اور اس کا لاہور پہ قابض ہونا مغل سلطنت کے طویل دور اقتدار کے زوال کی ابتدا تھی اور اس سے لاہور میں بھی سیاسی بحران پیدا ہوا۔

> محمد شاہ کے زمانہ سے انیسویں صدی کے شروع تک لاہور پر نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملے ہوتے رہے اور عالیشان دارالخلافہ صرف ٹوٹے پھوٹے کھنڈرات اور اینٹوں کا ڈھیر سارہ گیا۔(۱۷)

نادر شاہ کے حملوں کے ایک سال بعد اس کا جانشیں احمد شاہ ابدالی لاہور پر حملہ آور ہوا۔ لاہور سمیت پنجاب کے دیگر شہروں پر احمد شاہ ابدالی نے پے در پے کئی حملے کیے اور لاہور کو اپنی سلطنت میں شامل کیا۔ ابدالی کے ان حملوں کے بعد مغلیہ سلطنت کا لاہور سے خاتمہ ہوا۔ مسلسل خانہ جنگی کی وجہ سے لاہور کی سیاست تو متاثر ہوئی اس کے ساتھ ساتھ شہر اقتصادی طور پر بھی کمزور ہوا اور لاہور اب مکمل طور پر افغان حاکمین کے قبضے میں آ گیا۔ نادر شاہ کا دور لاہور کی تاریخ میں ناپسندیدہ دور سمجھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے گوہر نوشاہی لکھتے ہیں کہ:

> پنجاب کے غیور اور وطن پرست عوام نے نادر شاہ کے حملے کے خلاف جس غم و غصے اور نفرت کا اظہار کیا اس کا اندازہ اس دور کی بعض تصانیف سے لگایا جا سکتا ہے۔ عوام تو ایک طرف اس دور کے صوفیا اور اہل اللہ نے بھی نادر شاہی حملے کو فتنۂ دجال سے تشبیہ دی ہے۔(۱۸)

اس دوران سکھ بھی خود کو سیاسی اور دفاعی حوالے سے مضبوط کرتے رہے۔ افغانوں کے لاہور پر ایک دہائی قبضے کے بعد ۱۷۵۰ء میں سکھوں نے افغان حکومت کے خلاف ابھرنا شروع کیا اور تھوڑے ہی عرصے میں انہوں نے پنجاب کے کچھ علاقوں پہ قبضہ بھی کر لیا۔ ان کا اگلا ہدف لاہور تھا۔ ۱۷۵۰ء سے ۱۷۶۰ء کے درمیان سکھ، لاہور پر بھی کئی بار حملہ آور ہوئے۔ اگرچہ انہیں خاطر خواہ کامیابی تو حاصل نہ ہوئی۔ لیکن پے درپے حملوں کی وجہ سے لاہور پر افغان حاکموں کی طاقت کمزور ہوتی رہی۔ صدی کی ساتویں دہائی میں سکھوں نے افغان حاکمین سے لاہور چھین لیا۔

لاہور عرصہ دراز سے سیاسی تبدیلیوں کا شکار رہا تھا لیکن یہ تبدیلی اپنی نوعیت میں اس طرح انفرادیت رکھتی تھی کہ کئی صدیوں سے لاہور پر غیر ملکی حکمران مسلط تھے اور ایک مدت بعد لاہور پر ان کو حکمرانی ملی تھی جو اس دھرتی سے تعلق رکھتے تھے۔ البتہ سکھوں کو حکومت کی تبدیلی کے دوران یہ مشکل درپیش رہی کہ مغلوں کی طرح ان کے درمیان بھی اقتدار کی رسہ کشی جاری رہی اور لاہور کو سکھ کنفڈریسی میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن مرکزی حکومت نہ ہونے کے باعث لاہور میں بد انتظامی جیسے مسائل میں کمی واقع نہ ہوئی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کا نام سکھ رہنماؤں کی تاریخ میں بڑا نام ہے۔ اس نے اس صدی کی آٹھویں دہائی میں عسکری طور پر اپنی قوت میں اضافہ کیا اور لاہور پر قدم جمانے کے لیے لائحہ عمل ترتیب دینے لگا۔ اس دہائی میں اس نے اپنا اثر و رسوخ بڑھایا لیکن لاہور پہ قابض ہونے میں کامیاب نہ ہوا۔ اٹھارویں صدی کے آخری سال میں مہاراجہ رنجیت سنگھ لاہور پہ قابض ہونے میں کامیاب ہوا اور شہر لاہور کو اپنی سلطنت کا صدر مقام بنایا۔ یہاں سے لاہور کے نئے سیاسی سفر کا آغاز ہوا۔ اگرچہ اس نے مسلمانوں کے مقبروں اور ثقافتی شناختوں کو بہت نقصان پہنچایا لیکن اس کی حکومت میں شہر لاہور سیاسی حوالے سے مستحکم ہوا۔ لاہور کی تاریخ میں انیسویں صدی کی بنیاد سکھ سلطنت کے قیام سے رکھی گئی۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ اچھا جنگجو تھا لیکن انتظامی امور میں اس قدر فعال نہ تھا۔ اس کے دور میں فوج کی لوٹ مار عام تھی جس کو چاہتے لوٹ لیتے ۔

یہی وجہ ہے لاہور سیاسی طور پر مستحکم ہونے کے باوجود انتظامی حوالے سے اس طرح اپنا سیاسی سماجی تشخص بحال کرنے میں کامیاب نہ ہوا۔ جو اسے اکبر اور اس کے بعد مغل بادشاہوں کے دور میں حاصل تھا۔ رنجیت سنگھ نے پہلے سے موجود تاریخی عمارتوں کو کافی نقصان پہنچایا اور ان کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا۔

چوں کہ لاہور سکھوں کی حکومت کے مرکز کے طور پر کام کر رہا تھا اس لیے عسکری طور پر بھی اسے وہی مقام حاصل ہوا جو مغلوں کے دور اقتدار میں حاصل تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی سلطنت کو وسیع کرنے کے لیے فوجی مہمات کا آغاز بھی لاہور سے کیا۔ دوسری دہائی تک رنجیت سنگھ کی سلطنت مضبوط ہو چکی تھی ۔

سکھوں کی اپنی ریشہ دوانیوں اور اقتدار کی ہوس سے رنجیت سنگھ کی سلطنت متاثر ہوتی رہی اور یہ رنجیت سنگھ کی وفات(۱۸۳۹ء) میں ایک سیاسی بحران کی صورت اختیار کر گئی۔

رنجیت سنگھ کے بعد ان کے جانشینوں میں اقتدار کی کشمکش اور برطانوی سامراج کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی وجہ سے سکھ سلطنت زوال پذیر ہوئی اور صدی کی چوتھی دہائی کے آخر تک سکھ سلطنت اپنا وقار کھو چکی تھی۔ ۱۸۴۰ء کی دہائی کے دوران سکھوں اور انگریزوں کے مابین کئی بار لڑائیاں ہوئیں۔ انگریز جو اس عرصے میں ہندوستان میں اپنے قدم مضبوط کر چکے تھے اور ان کا اثر و رسوخ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ بالآخر انیسویں صدی کے نصف میں انگریزوں نے سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کر لیا اور لاہور برطانوی راج میں پنجاب کا دارالحکومت بن گیا۔ ڈاکٹر طاہر طیب اس بارے لکھتے ہیں:

> انگریزوں نے جب ہندوستان کو مکمل طور پر زیر کر لیا تو اس کے بعد انہوں نے حکمت عملی کے تحت مقامی لوگوں کے ساتھ اچھے برتاؤ کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا۔ لاہور کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ لاہور میں ترقی اور جدت کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ اس طرح عہد غزنوی سے باقاعدہ طور پر شہرت اور حیثیت پانے والا یہ شہر انگریزوں کے زیر تسلط آنے تک صدہا مرتبہ لٹا، صدہا مرتبہ پھر منظم ہوا اور پھر ایک جدید شہر بننے کی طرف گامزن ہو گیا۔ (۱۹)

نو آبادیاتی تناظر میں لاہور کے سیاسی منظر نامے پر یہ بڑی تبدیلی تھی۔ انگریز اپنے ساتھ نیا سیاسی نظام لائے تھے جو اس خطے کے لیے بالکل نیا تھا۔ نئے سیاسی نظام کے ساتھ ساتھ تعمیر و ترقی کے منصوبے بھی لائے۔ برطانوی راج میں دیگر شہروں سمیت لاہور میں بھی ریل اور مواصلات کے بہترین اور اپنے دور کے لحاظ سے جدید منصوبے شروع کیے گئے۔ یہ لاہور شہر کی ترقی کا نیا دور تھا کیوں کہ انگریز حکومت نے امن و امان کو برقرار رکھنے کے ساتھ سیاسی حوالے سے بھی شہر کو ترقی دی۔ کنہیالال ہندی انگریز دور میں لاہور کے سیاسی اثر و رسوخ کے پھیلاؤ کے حوالے سے لکھتے ہیں: "انگریز عہد میں یہی شہر دارالحکومت پنجاب کا قرار پایا بلکہ دہلی اس صوبہ کے ماتحت ہو گئی۔" (۲۰)

یہ وہ دور تھا جب برطانوی راج میں انڈین نیشنل کانگریس ایک سیاسی جماعت کے طور پر برصغیر پاک و ہند کی پہلی بڑی سیاسی جماعت کے طور پر اپنی شناخت بنا رہی تھی۔ لاہور میں انگریز حکومت نے کئی تعلیمی ادارے قائم کیے جس کی وجہ سے طلبا میں سیاسی سمجھ بوجھ بڑھنے لگی۔ ان اداروں کے قیام کے بعد مسلمان جو انگریزی تعلیم سے دور تھے، انگریزی تعلیم کی طرف راغب ہوئے۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات نے بھی لاہور کی زمین کو متاثر کیا۔ ان عوامل کی وجہ سے انیسویں صدی کے آخر تک لاہور سیاسی طور پر پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور اب سیاسی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ انڈین نیشنل کانگریس کے پلیٹ فارم سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی دوسری چھوٹی بڑی تنظیموں نے آزادی کے لیے آواز بلند کرنا شروع کی تو لاہور سیاسی مرکز ہونے کے ناطے ان جذبات کی آبیاری کرتا رہا اور آزادی کے خیالات یہاں پروان چڑھتے رہے جو آنے والے دنوں میں ایک بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔

بیسویں صدی کے آغاز سے ہی ہندوستان کے باسیوں میں انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت بڑھنے لگی۔ ہندوستان کی سرزمین کئی صدیوں سے غیر ملک سے حملہ آور ہونے والوں کے دیے گئے زخموں کو سہتی آ رہی تھی۔ چوں کہ انگریز اس مٹی سے تعلق نہ رکھتے تھے، وہ اپنے تئیں جس قدر بھی ترقی پسند سوچ رکھنے والے تھے یہاں کے باسیوں کو پسند نہ آئے۔ یوں ان کے خلاف مختلف تحاریک جنم لیتی رہیں۔ انڈین نیشنل کانگریس جو ایک عرصے سے ملک کی بڑی سیاسی جماعت کے طور پر کام کر رہی تھی اس کی سرگرمیاں بھی پنجاب تک پھیل گئیں اور لاہور پنجاب کا مرکز ہونے کی بنا پر ان سیاسی تبدیلیوں کا مرکز رہا۔ اس دوران مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اگرچہ مسلم لیگ کا قیام ڈھاکہ میں ہوا لیکن مسلمانوں کی جماعت ہونے کے سبب اس کے اثرات کا دائرہ لاہور تک پھیل گیا۔

پہلی جنگ عظیم میں ہندوستانیوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے ان سے یہ وعدہ کیا گیا کہ ہندوستان میں اصلاحات کی جائیں گی لیکن جیسے ہی جنگ ختم ہوئی انگریز حکمرانوں نے آنکھیں پھیر لیں۔ ہندوستان کی عوام جو پہلے ہی حکمرانوں سے بددل ہو چکی تھی۔ ان کی حکومت سے ناراضی میں اضافہ ہوا۔ جلیانوالہ باغ واقعہ نے جلتی پہ تیل کا کام کیا۔ سارا ہندوستان اس پہ سراپا احتجاج تھا۔ لاہور میں بھی اس واقعے کے بعد مظاہرے کیے گئے۔ اسی دوران تحریک خلافت کا آغاز ہوا تو اس میں بھی لاہور نے اپنا سیاسی کردار ادا کیا۔

دوسری دہائی میں تحریک خلافت اور تحریک عدم تعاون کا آغاز ہوا تو سیاسی شعور کا حق ادا کرتے ہوئے لاہور ان تحاریک کا مرکز رہا۔ مسلمانوں نے ان تحاریک میں شمولیت اختیار کی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر ان تحاریک کی ناکامی کی وجہ سے مسلمان رہنما مایوسی کا شکار ہوئے۔ تحریک خلافت کے خاتمے پر ہندوستان کی دو بڑی سیاسی جماعتوں کانگریس اور مسلم لیگ کے تعلقات خراب ہونا شروع ہوئے۔ دونوں سیاسی جماعتیں مل کر آزادی کی جنگ لڑ رہی تھیں۔ یہاں ان کی راہیں واضح طور پر جدا ہونا شروع ہوئیں۔ پنڈت نہرو نے مکمل آزادی کا نعرہ لگایا تو مسلمانوں میں اپنے سیاسی تشخص اور شناخت کے سوال نے زور پکڑا۔ مسلم لیگ جو اس سے پہلے کانگریس کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑ رہی تھی۔ اس نے اپنے سیاسی قد میں اضافہ کیا اور سیاسی تنظیم نو کا آغاز کیا۔

یہی وہ زمانہ تھا جب لاہور مسلمانان پاک وہند کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بن کے ابھرا۔ علامہ اقبال نے الٰہ آباد کے خطبے میں مسلمانوں کے لیے الگ ریاست کے حوالے سے گفتگو کی اور الگ ریاست کی یہ بات خواص سے چلتی چلتی زبان زدِعام ہو گئی۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۰ء میں لاہور میں ایک تاریخی جلسے کا نعقاد ہوا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ شاندار جلسہ اپنی نوعیت میں یہ انفرادیت رکھتا تھا کہ اس میں قرار دادِ پاکستان پیش ہوئی۔ یہی قرارداد آگے چل کر مسلمانوں کے الگ وطن "پاکستان" کے قیام کی بنیاد بنی۔

اس دہائی میں مقامی اور غیر ملکی بڑی سیاسی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ ملکی سطح پر عام انتخابات کا ہونا اور ہندو اکثریت والے علاقوں میں کانگریس اور مسلم اکثریتی علاقوں میں مسلم لیگ کو ووٹ ملنا یہ ثابت کرتا تھا کہ دونوں قوموں کے لیے جو ایک عرصے سے اکٹھی رہ رہی تھیں اب الگ ہونا ناگزیر ہو چکا تھا۔ عالمی سطح پر جنگ عظیم دوم کا آغاز ہوا جس میں برطانیہ کا اہم کردار تھا۔ اس وجہ سے برصغیر کی سرزمین بھی اس جنگ کے اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد حکومت برطانیہ سے نالاں سیاسی قوتیں اب سبق سیکھ چکی تھیں۔ اس مرتبہ برطانوی سرکار کو دو محاذوں پر مخالفت کا سامنا تھا۔ ایک جنگ برصغیر میں دو بڑی سیاسی قوتوں کانگریس اور مسلم لیگ کے خلاف لڑ رہی تھی اور دوسری طرف اسے عالمی جنگ میں بھی مشکلات کا سامنا تھا۔ برطانوی حکومت نے برصغیر میں سیاسی حوالے سے صورتحال کو بہتر کرنے اور اپنے قابو میں رکھنے کے لیے اقدامات کیے لیکن یہ دیرپا ثابت نہ ہوئے۔ اس دوران لاہور نے سیاسی بیداری کا مظاہرہ کیا

اور جب ضرورت ہوئی حکومت کی ناروا پالیسیوں کے خلاف احتجاج کیا۔ اس ضمن میں پروفیسر محمد خلیل اللہ لکھتے ہیں:

> ۶ مارچ ۱۹۴۶ء کو سارے پنجاب میں مسلمانوں نے عام ہڑتال کی۔ لاہور کے طلبا نے احتجاجی جلوس نکالا جس پر پہلے ہندوؤں نے پتھراؤ کیا اور پھر پولیس نے فائرنگ کی۔ مسلمانوں کے احتجاج کو دبانے اور کچلنے کے لیے حکومت کی پوری مشینری حرکت میں آگئی مگر یہ طوفان تھم نہ سکا اور ایک سال کے اندر اندر ہی خضر حیات وزارت کا خاتمہ ہو گیا۔ (۲۱)

آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۴۶ء میں منعقد ہونے والے انتخابات میں بھی کامیابی سمیٹی۔ لاہور اس دوران مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا گڑھ رہا۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان اور ہندوستان کے قیام کے بعد بھی لاہور ایک اہم اور مرکز کے طور پر ابھرا۔ مہاجرین کا تبادلہ لاہور اور واہگہ کے راستے ہوتا رہا۔ جس کی وجہ سے لاہور ہجرت کے ان واقعات میں بھی مرکزی کردار ادا کرتا رہا۔ قیام پاکستان تک کے لاہور کے بیان کردہ حالات کو دیکھا جائے تو ڈاکٹر ایس ایم ناز کے الفاظ سچ معلوم ہوتے ہیں کہ:

> لاہور کی تاریخی کڑیاں پیش نظر ہوں تو یہ حقیقت تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ اس شہر کی تاریخ صدیوں پرانی ہے۔ اس شہر نے سینکڑوں نقوش بنتے اور بگڑتے دیکھے ہیں۔ کئی انقلابات یہاں آئے۔ خون کی ندیوں سے یہاں کی سرزمین لالہ زار بنی۔ یہ شہر کئی بار اجڑا اور آباد ہوا۔ لیکن اس کی عظمت اور انفرادیت برقرار رہی۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور اب بھی لاہور ہے۔ (۲۲)

قیام پاکستان سے قبل لاہور کا شمار ہندوستان کے بہترین شہروں میں ہوتا تھا اور کانگریس چاہتی تھی کہ بٹوارے میں لاہور ان کو ملے لیکن قائداعظم کی کوششوں سے یہ پاکستان کے حصے میں آیا۔ لاہور کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے شری پرکاش لکھتے ہیں: "بٹوارہ کرنے والوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان کو کلکتہ اور لاہور دونوں نہیں ملنا چاہیے" (۲۳)

قیام پاکستان کے بعد لاہور، پاکستان کے سیاسی افق پر جگمگاتا رہا۔ لاہور کی ۱۹۵۰ء کی دہائی میں پاکستان کی سیاسی تاریخ میں مرکزی حیثیت تھی۔ اس دوران نہ صرف یہاں سیاسی سرگرمیاں عروج پر تھیں بلکہ شہر لاہور نے کئی اہم تحاریک کو بھی جنم دیا۔ پاکستان کے قیام کے بعد لاہور نے اپنی سیاسی اور سماجی شناخت میں اضافہ کیا۔ مختلف تحاریک اور مظاہروں نے ملک کی سیاسی صورتحال پر اثر ڈالا۔ اس دور میں احمدیہ مخالف تحریک سیاسی منظرنامے کا اہم حوالہ ہے۔

اس دہائی کی تحریکوں کی رہنمائی زیادہ تر وہی کر رہے تھے جو تحریک پاکستان میں بھی شامل رہے۔ ۱۹۵۵ء میں ون یونٹ پالیسی متعارف ہونے پر سیاسی حلقوں کی طرف سے ملا جلا رجحان سامنے آیا۔ کوئی اس پالیسی کے حق میں کھڑا ہوا تو کوئی اس کے خلاف آواز اٹھا رہا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں پہلے آئین کے نفاذ کے بعد جمہوری قوتوں کی سیاسی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا۔ سول سوسائٹی اور طلبہ کی طرف سے آئین کی بالادستی اور سیاسی آزادی کے حق میں جلسے، جلسوں کا انعقاد کیا گیا۔ لیکن دو سال بعد ۱۹۵۸ء میں پہلے مارشل لا کے نفاذ کے بعد عوام اور سیاسی حلقوں میں بے چینی دیکھی گئی۔ اگرچہ سیاسی افق پر یہ ایک بڑی تبدیلی تھی لیکن کسی بڑی مزاحمتی تحریک نے جنم نہ لیا۔

قیام پاکستان کے بعد ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ملکی سیاست کا زیادہ تر حصہ فوج کی کمان میں رہا۔ یہ ۹۵۸ء کے مارشل لا کا تسلسل تھا جس میں جنرل ایوب نے حکمرانی سنبھالی اور ۱۹۶۲ء میں ملک کے لیے ایک صدارتی آئین پیش کیا۔ یہ پارلیمانی نظام کی بجائے صدارتی نظام کی بنیاد تھا۔ لاہور،، جو پہلے ہی سیاسی سرگرمیوں کا محور تھا۔ اس نئے نظام کے متعارف ہونے کے بعد ملکی سیاست کا مرکز رہا۔ کیوں کہ اس دوران ایوب خان کی پالیسیوں اور صنعتی حوالوں سے اصلاحات کے اثرات لاہور شہر پر براہ راست پڑے۔ صنعتی حوالوں سے یہ عہد ترقی کی داستان سناتا ہے۔ اسی دوران ۱۹۶۵ء کی جنگ چھڑ جاتی ہے۔ یہ قیام پاکستان کے بعد پہلا موقع تھا کہ ۱۹۴۷ء کی تقسیم کے بعد دونوں قومیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوئیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کے دوران فسادات کی وجہ سے دونوں طرف جانی و مالی نقصانات کی داستان پہلے ہی موجود تھی۔ تباہی کی یہ داستان بھی اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ جنگ کے اثرات دونوں طرف محسوس کیے گئے۔ لاہور نے اس جنگ کے اثرات بارڈر کے قریب واقع ہونے اور ہندوستانی پنجاب سے زمینی تعلق اور رابطے کی وجہ سے محسوس

کیے۔ اس جنگ کے بعد لاہور کے عوامی حلقوں کے حکمرانوں کے درمیان خلیج بڑھی۔ لاہور میں اس کی وجہ سے طلبہ کی تحریکیں، مزدوروں کی یونین اور سیاسی جماعتیں اپنے اپنے حوالوں سے متحرک ہوئیں۔ ۱۹۶۸ء میں ایوب خان کے خلاف ایک ملکی سطح کی تحریک شروع ہوئی جس کا مرکز لاہور تھا۔ یہاں ذوالفقار علی بھٹو نے جلسے کیے اور طلبہ تنظیموں کے احتجاج کی وجہ سے لاہور میں ایوب خان کے خلاف سیاسی سرگرمیاں بڑھ گئیں جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۶۹ء میں ایوب خان کو رخصت ہونا پڑا۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں ملکی سیاست ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے اور ۱۹۷۰ء میں نئے انتخابات ہوتے ہیں لاہور اس سیاسی گہما گہمی کے دوران ملکی سیاست کا محور رہا۔ لاہور کے شہری حلقوں میں جماعت اسلامی نے کامیابی سمیٹی لیکن مجموعی طور پر پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی۔ ڈاکٹر صفدر محمود ۱۹۷۰ء کے انتخابات کی صورتحال کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

> ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پیپلز پارٹی نے مشرقی پاکستان میں کوئی امیدوار کھڑا نہ کیا لیکن مغربی پاکستان میں پارٹی نے ۱۱۹ امیدوار کھڑے کئے اور قومی اسمبلی کی مغربی پاکستان کے لیے کل ۱۳۸ نشستوں میں سے ۸۱ نشستیں حاصل کیں۔ اس طرح پیپلز پارٹی مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے ابھری۔ بعد ازاں خواتین کی اور دوسری نشستوں ملا کر پیپلز پارٹی نے ۸۸ نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ صوبائی سطح پر صوبہ پنجاب میں ۱۱۳ نشستوں کے جیتنے سے پنجاب اسمبلی میں پیپلز پارٹی کو بڑی اکثریت حاصل ہو گئی۔(۲۴)

پیپلز پارٹی کی کامیابی لاہور سے تعلق رکھنے والے مزدور طبقہ کے سیاسی فہم کی عکاس تھی۔ کیوں کہ ۱۹۷۲ء میں صنعتی اصلاحات کے تحت کئی صنعتیں قومی تحویل میں لینے کا فیصلہ کیا گیا جس سے مزدور اور غریب طبقہ خوش ہوا۔ البتہ کاروباری طبقے اور سرمایہ دار حلقے اس حکومتی پالیسی سے ناخوش تھے۔ لاہور صنعت و حرفت کے حوالے سے بھی پنجاب کا مرکزی شہر تھا۔ اس لیے ان اصلاحات سے براہ راست متاثر ہوا۔ ۱۹۷۳ء میں متفقہ طور پر آئین پاس کرانے کا سہرا بھی پیپلز پارٹی کے سر ہے۔

۱۹۷۷ء کے دوران لاہور میں ایک پھر سیاسی گہما گہمی عروج پر تھی۔ پیپلز پارٹی کامیاب ہوئی۔ حکومت کے خلاف اتحادیوں نے دھاندلی کا الزام لگایا اور ایک تحریک شروع کی۔ لاہور میں اس تحریک کے احتجاجی مظاہروں کے دوران کئی کارکنان گرفتار کیے گئے۔ اس احتجاج میں تاجر اور دیگر مذہبی جماعتوں سے تعلق رکھنے والوں کی بڑی تعداد شریک ہوئی جو حکومت کی پالیسیوں سے خوش نہیں تھی۔ لاہور شہر سمیت ملک میں بدامنی پھیلی اور ان حالات کو دیکھتے ہوئے جنرل ضیاالحق نے ۱۹۷۷ء میں مارشل لا نافذ کیا۔ مارشل لا کے خلاف فوری اور بڑی نوعیت کی مزاحمتی تحریک سامنے نہ آئی کیوں کہ لوگ حکومتی پالیسیوں سے پہلے ہی نالاں تھے۔ البتہ ادبی حلقوں میں اس سیاسی تبدیلی کو نہ سراہا گیا۔

لاہور کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۸۰ء کی دہائی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسا دور تھا جب عسکری حکمرانی عروج پر تھی۔ نظریاتی اور مذہبی رجحانات اپنے گہرے اثرات مرتب کر رہے تھے۔ لاہور، جس طرح قیام پاکستان سے پہلے اور بعد سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ اس دہائی کے دوران بھی لاہور مرکزی حیثیت سے مختلف سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا مشاہدہ کرتا ہے۔

اس دہائی کے دوران سیاسی جماعتوں کو حکومت کی طرف سے مختلف پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی طرح ادبی حلقوں کے خلاف بھی سخت گیر رویہ اختیار کیا گیا۔ آزادی اظہار کو دبایا گیا اور اختلاف رائے کرنے والوں کو سزائیں ہوئیں۔ چوں کہ لاہور سیاسی مرکز کے علاوہ پاکستان کا ادبی مرکز بھی رہا ہے اس وجہ سے اس دہائی کے دوران، لاہور کو سیاسی اور ادبی حوالوں سے مختلف مشکلات کا سامنا رہا۔ اس بارے میں حمیرا ماجد لکھتی ہیں:

> مارشل لاء کا نفاذ بھی اسی دور میں ہوا جس نے معاشرے پر بڑے بُرے اثرات مرتب کیے تمام اداروں کو بہت سی حدود اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔(۲۵)

مارشل لا کے خلاف تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) شروع کی گئی جو سندھ میں زیادہ موثر ثابت ہوئی لاہور میں اس کے زیر اثر کوئی بڑا احتجاجی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں انتخابات کے بعد محمد خان جونیجو وزیراعظم بنے۔ لیکن سیاسی افق پر بڑی تبدیلی ۱۹۸۶ء میں بے نظیر بھٹو کی وطن واپسی تھی۔ لاہور ایر پورٹ پر ان کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ عوام کی طرف سے ایسا استقبال ایک بڑی سیاسی تبدیلی کی نوید سنا رہا تھا۔ ۱۹۸۸ء

میں جنرل ضیاالحق کے طیارے کو حادثہ پیش آیا اور ان کی جان چلی گئی۔ جس سے مارشل لا کا اختتام ہوا اور نئے جمہوری سفر کے لیے راستہ بنا۔

۱۹۹۰ء کی دہائی کا آغاز جمہوریت کی بحالی سے ہوتا ہے لیکن اختتام مارشل لا پہ ہوا۔ اس صدی میں دو سیاسی قوتوں پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (نواز) کے درمیان اقتدار بدلتا رہا۔ مسلم لیگ (نواز) لاہور سے ہی تعلق رکھنے والی جماعت ہے اس وجہ سے، اس دہائی میں اور اس کے بعد کے سیاسی ادوار میں لاہور کی اہمیت ملکی سیاسی منظر نامے پر بڑھی۔ ۱۹۹۳ء میں پیپلز پارٹی نے کامیابی سمیٹی اور مسلم لیگ (نواز) اپوزیشن جماعت کے طور پر فعال رہی۔ ۱۹۹۶ء میں بے نظیر کی حکومت کے برطرف ہونے کے بعد ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں مسلم لیگ (نواز) نے بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی۔ اس دوران لاہور سمیت ملک کے دیگر حصوں میں ترقیاتی کام ہوئے۔ لاہور میں سڑکوں کو کشادہ کیا گیا، نئی تعمیرات ہوئیں۔ اسی طرح موٹرویز بنائے گئے جن سے سفری سہولتیں بڑھیں۔ ۱۹۹۹ء میں کارگل جنگ کے بعد حکومت اور عسکری حلقوں کے تعلقات میں دراڑ آئی اور جنرل پرویز مشرف نے ۱۹۹۹ء میں مارشل لا لگا دیا۔ مارشل لا کے خلاف لاہور میں کچھ مزاحمتی مظاہرے بھی ہوئے لیکن زیادہ تر عوام نے اس حکومتی تبدیلی کو خوش دل سے قبول کر لیا۔

ب۔لاہور کی ثقافت:

لاہور بر صغیر کی تہذیبی تاریخ میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔اس شہر کی ثقافت اپنی تاریخی وسعت اور تنوع کے باعث مختلف ادوار میں اجتماعی یادداشت، سماجی روایتوں اور فنونِ لطیفہ کی ترجمانی کرتی رہی ہے۔ لاہور محض ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ یہاں کے بازار، میلوں ٹھیلوں، زبان، ملبوسات اور خوراک ایسے عناصر ہیں جو اسے ایک ہمہ جہت تہذیبی شناخت فراہم کرتے ہیں۔ اس امر سے واضح ہوتا ہے کہ لاہور کی ثقافت محض ماضی کا ورثہ نہیں بلکہ حال اور مستقبل کی تشکیل میں بھی بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔یوں ثقافت اور لاہور ایک دوسرے کے آئینہ دار ہیں۔ دونوں ایک دوسرے میں ڈھلے، ایک دوسرے سے روشن اور ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔

لاہور کی ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے لاہور اپنی مثال آپ ہے۔ یہ شہر آج بھی اپنے خوبرو کل کا آئینہ دار ہے۔ شہر لاہور کی ثقافت اور سماج کا جائزہ پیش کرنے کے لیے ہمیں اس کے تاریخی حقائق کا جاننا ضروری ہے۔ شہر لاہور جو آج ایک ترقی یافتہ شہر کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ یہ شہر آج کے مقابلے میں نویں صدی میں کسی قدر کم ترقی یافتہ تھا۔نویں صدی میں لاہور کے علاقے کا انحصار زراعت پر تھا۔ بہتر زندگی، اناج کی بہتر پیداوار پر ہی منحصر تھی۔ تجارت اگرچہ بڑے پیمانے پر موجود نہ تھی بحر حال ہاتھ سے بنی ہوئی چیزوں، کپڑے اور برتن سازی کو فروغ حاصل تھا۔

چوں کہ اس وقت تک مسلمانوں کی سندھ آمد کے اثرات لاہور تک نہ پہنچ پائے تھے اس لیے اس دورانیے میں بدھ مت اور ہندومت ہی بڑے مذاہب تھے اور انہی کو غلبہ حاصل تھا۔ بدھ مت سے بھی زیادہ ہندومت معاشرے میں رواج پذیر تھا۔بدھ مت اگرچہ موجود تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنی افادیت کھو رہا تھا۔ اور اسی دوران مذہب اسلام، صوفیاء کے ذریعے ملتان اور سندھ سے آگے کا سفر طے کرتا ہوا لاہور کی سرزمین تک پہنچتا ہے۔ڈاکٹر حفیظ الرحمن اسے بارے لکھتے ہیں کہ:

> صوفیاء کی آمد سب سے پہلے سندھ اور ملتان میں ہوئی۔اس کے بعد لاہور صوفیاء کا اہم مرکز بنا۔ تاریخی کتابوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں آنے والے پہلے صوفی شیخ ابو علی السندھی آٹھویں صدی عیسوی میں سندھ میں آئے۔۔۔اس کے بعد شیخ اسماعیل

لاہوری، جو محمود غزنوی کے دور میں ۱۰۰۵ء میں لاہور آئے۔ ان کے آنے کے بعد لاہور میں صوفیا اور علماء کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ (۲۶)

کہا جاتا ہے کہ کوئی مذہب اپنے ماننے والوں میں طبقاتی تقسیم کا پرچار نہیں کرتا اور اس مذہب کے ماننے والے ہی اس کو اپنے مطابق بدلتے رہتے ہیں اور اس کی شناخت کا باعث بنتے ہیں اسی بنا پر اُس وقت بھی سماج کی حد بندی کرنے والوں نے قومیت اور ذات پات کے حوالے سے تقسیم کر رکھی تھی۔ جو ہندو مذہب کا حصہ اور شناخت بن گئی۔ ہندو مت کے سماجی نظام کے مطابق چھوٹی ذات سے تعلق رکھنے والوں کو معاشرے میں وہ مقام حاصل نہ تھا جو بڑی ذات کے لوگوں اور حاکمین کو تھا۔

دینی مراکز علم کی ترویج کا کام کرتے تھے۔ زیادہ تر عوام کا مذہب ہندو مت تھا اس وجہ سے پنڈت اور مذہبی پیشوا تعلیم دیا کرتے تھے۔ باقاعدہ طور پر کوئی تعلیمی درسگاہ موجود نہ ہونے کے باعث دیگر علوم کو اس درجہ فروغ حاصل نہ ہوا البتہ سنسکرت کے ساتھ ساتھ دیگر مقامی بولیوں کو ترویج ہوئی۔ علی محمد خان اپنے مقالہ "لاہور کا دبستان شاعری" میں البیرونی کا سنسکرت اور دیگر علوم حاصل کرنے کی سعی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> برہمن اپنے علوم مسلمان تو درکنار کسی غیر برہمن کو بھی پڑھانے کے روادار نہ تھے بلکہ ہندو قوم کا اکثریت کے لیے لکھنا پڑھنا ایک مہا پاپ تھا کسی اچھوت یا شودر کے کان میں سنسکرت کا کوئی لفظ پڑ جاتا تو اس کے کان میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا۔ (۲۷)

فن تعمیر ثقافت کی ایک اہم علامت ہے اس کا اظہار مذہبی عمارات کی تعمیر میں بھی نظر آتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوؤں کی عبادت گاہ مندروں اور بدھ مت کی عبادت گاہ اسٹوپا (جسے بدھ کی قبر بھی کہا جاتا ہے) اپنی اپنی مذہبی شناختوں کے ساتھ مذہب کی علامت سمجھے جاتے تھے اور مذہب کی ترویج کے لیے کام کر رہے تھے۔ یہ جگہیں جہاں عبادت کے لیے استعمال ہوتی تھیں وہیں سماجی میل جول اور مذہبی تہواروں کے دوران لوگوں کے اکٹھ اور دیگر رسومات کے لیے بھی مرکز کا کام کرتی تھیں۔ مذہبی رسومات کی بجا آوری اور میل جول کے دوران موسیقی اور رقص کو اہمیت حاصل تھی اور زیادہ تر تقریبات میں ان کو شامل کیا جاتا تھا

اسی طرح سماجی میل جول کے دوران لوک کہانیوں، داستان گوئی اور شعر و شاعری کو بھی رواج حاصل تھا۔ لکھنے کا رواج اگرچہ نہ تھا البتہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتے ہوئے قصے ایک سے دوسرے تک پہنچتے تھے۔ لاہور کے باشندوں کی خوراک اور لباس سادہ تھے۔ عوام کی زندگی کا دارومدار زرعی اجناس پر ہی تھا جن میں سبزیاں اور دال چاول شامل تھے۔

اسی صدی میں سیاسی اعتبار سے تبدیلی کے ساتھ ساتھ ثقافتی حوالے سے بھی تبدیلی آئی۔ نویں صدی میں مسلمان حملہ آوروں کی وجہ سے جہاں اس علاقے کی سیاست نے نیا رخ اختیار کیا وہیں ہندو مسلم سماج کے ملاپ سے ایک نئے کلچر کو پروان چڑھنے میں مدد ملی۔ جس نے آنے والے دنوں میں ہندو مسلم سماج کی صورت میں اپنی شناخت بنائی جو زمانے کے ساتھ اپنا رخ بدلتی اور راہیں متعین کرتی رہی۔

نویں صدی میں لاہور ایک زرعی خطہ تھا جو مذہبی اور طبقاتی رنگوں میں اپنی شناخت بنائے ہوئے تھا لیکن مسلمانوں کی آمد نے اس خطے کی ثقافت کی نئ صورت گری کی جس سے آئندہ صدیوں میں لاہور ایک تاریخی اور ثقافتی مرکز بن کے ابھرا۔ نویں صدی کا اختتام ہوتا ہے تو لاہور ہندو حکمرانوں کے زیر اثر ہی تھا۔ اگرچہ یہاں تینوں مذاہب (ہندو مت، بدھ مت اور اسلام) کے نام لیوا موجود تھے جن میں زیادہ تعداد ہندو مذہب کی تھی اور حکمرانی بھی ہندوؤں کی تھی لیکن لوگ امن پسند تھے اور امن و آشتی سے گزر بسر کرتے تھے۔ اسی دوران مسلمان مبلغین کی اس خطے میں آمد ہوتی ہے اور ان کی تعلیمات کی وجہ سے اسلام پھیلتا پھولتا ہے اور یوں مسلمانوں کی تعداد میں بھی بتدریج اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اگرچہ اسلام تیزی سے پھیل رہا تھا اور مسلمان حکمران اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہے تھے لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب دوسرے مذاہب کے لوگ بھی ایک دوسرے کے سماجی تہواروں اور دیگر رسوم میں شامل ہوتے رہتے تھے۔

محمود غزنوی کی حکومت نے لاہور پر گہرے اثرات مرتب کیے اور اس نے ایسا نظام متعارف کرایا کہ اسلامی قوانین کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ مندروں اور اسٹوپوں کے بعد مساجد اور مدارس کی تعمیر ہونے لگی۔ اسلام کے اس بڑھتے ہوئے سماجی اثر و رسوخ کی وجہ سے لاہور کی معاشرت اور لوگوں کی زندگی میں نمایاں تبدیلی آنے لگی۔ محمد زمان چیمہ لکھتے ہیں:

> غزنوی دور میں پنجاب میں کئی غیر ملکی حاکم، فوجی اور تاجر اپنے خاندانوں سمیت یہاں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اس طرح مقامی تمدن میں کچھ نئے اثرات داخل ہونے لگے جس کے نتیجے میں یہاں کے آداب و رسوم، تعلیم و تعلم، خوراک و پوشاک، گفت و شنید غرض سبھی میدانوں میں تبدیلی ہوئی۔(۲۸)

دسویں صدی کے لاہور کی معاشرت اور سماجی انتظام جو اب بھی زیادہ تر ہندومت کے زیر اثر تھا اور ان کے ہاں طبقاتی تقسیم مختلف ذاتوں کی بنیاد پر ویسی ہی رہی جو انہوں نے پیشے اور سماج میں حیثیت کے بنا پر کر رکھی تھی۔ ہندومت کے پیروکاروں کے ہاں اس پر سختی سے عمل کیا جاتا رہا البتہ بدھ مت کے پیروکاروں کے ہاں ایسی تقسیم نہیں تھی اور اس مذہب کے ماننے والے آزاد زندگی بسر کرتے تھے۔

سلطان محمود غزنوی کے عہد کو لاہور کی سیاسی، معاشرتی اور ادبی تاریخ کے حوالے سے ایک رجحان ساز دور سمجھا جاتا ہے جس نے سیاست، سماج ثقافت اور شہری ترقی پر گہرے نقوش مرتب کیے۔ غزنوی کی آمد کے بعد جب یہاں اسلامی نظام متعارف ہوا تو اسلامی مساوات اور اسلامی معاشرت کے اصولوں کے تحت سماجی ڈھانچے میں محدود لیکن نمایاں بدلاؤ آیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہندو معاشرت کے تحت پروان چڑھنے والے طبقاتی تقسیم کے رویے میں کسی قدر نرمی ہوئی۔ لیکن ہندومت کے ماننے والوں کے ہاں یہ معاشرتی تقسیم ویسی ہی رہی۔

زبان انسان کی ضرورت ہے اور ہر نئی زبان اپنے ساتھ وطن کی دیگر یادگاروں کے ساتھ ثقافت بھی منتقل کرتی ہے۔ اسی وجہ سے اس خطے میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ فارسی اور عربی زبانیں آئیں تو اپنے ساتھ ایک طرز معاشرت بھی لائیں۔ چوں کہ یہ حکمرانوں کی زبانیں تھیں اس لیے پہلے سے موجود زبانوں پر حکمرانی کرنے لگیں۔ دربار کی زبان بدلی تو اس کا اثر لاہور کی معاشرت پر بھی پڑا۔ فارسی زبان کے ساتھ فارسی ادب بھی منتقل ہوا تو شاعری کو نیا رخ ملا۔ یوں لاہور کی ثقافتی شناخت میں فارسی زبان و ادب اور معاشرت کے تحت بدلاؤ آیا۔

لاہور شہر اس صدی میں علم و آگہی کا مرکز رہا۔ مسلمان فاتحین سے پہلے یہاں بدھ مت اور ہندومت کے تعلیمی مراکز سرگرم عمل تھے۔ بدھ مت کے پیروکار پالی زبان میں اپنے مذہب کے فروغ کے لیے علمی

اور ادبی کتب لکھ رہے تھے اور ہندو مت کے پیرو کار سنسکرت میں ادب تخلیق کر رہے تھے۔ لیکن اس صدی کے آخر میں جب مسلمان یہاں آئے تو انہوں نے فارسی کو رواج دیا۔ تاریخ، شاعری اور دیگر علمی و ادبی کتب فارسی میں لکھنے کا رواج بڑھا۔ اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ اسلامی علوم جیسے حدیث، تفسیر اور فقہ بھی درس و تدریس میں شامل ہوئے۔ اسی دور میں اسلامی مبلغین نے بھی ہندوستان کے دیگر شہروں کے ساتھ ساتھ لاہور کا رخ کیا۔ علم و ادب سے تعلق رکھنے والے علماء نے فارسی اور عربی میں کتابیں تحریر کر کے خطے میں اسلامی فکر اور ثقافت کو فروغ دیا۔

چوں کہ اس صدی کی معاشرت پہلے سے موجود مذاہب ہندو مت اور بدھ مت کے زیر اثر تھی اور اسی دوران اسلامی تعلیمات بھی معاشرے میں پنپ رہی تھیں۔ اس بنا پر معاشرے میں خواتین کا کردار بھی مذاہب کے اختلاف کی وجہ سے مختلف رہا۔ ہندو مت کے ہاں خواتین کا سماجی تعلق گھر یا پھر زیادہ سے زیادہ خاندان تک محدود تھا۔ البتہ بدھ مت کے ہاں خواتین ہندو مت سے زیادہ سماجی طور پر فعال تھیں۔ اسلام کے زیر اثر معاشرتی حوالے سے یہ تبدیلی واقع ہوئی کہ خواتین کو علمی رسائی تو دی گئی لیکن سماجی حوالے سے ان کی خدمات میں دیگر مذاہب سے زیادہ بدلاؤ نہ آیا۔

اسی طرح لاہور میں اس دوران بدھ اور ہندو مذاہب کی سماجی تقریبات میں رقص اور موسیقی کو بھی زیادہ دخل تھا۔ اسلام اور بالخصوص غزنوی عہد میں اس میں یہ تبدیلی آئی کہ اب موسیقی میں فارسی کو بھی شامل کر لیا گیا۔ یوں اس صدی کی صورتحال سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس صدی کے دوران جہاں سیاسی منظر نامے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ وہیں اس شہر کی ثقافت بھی بدلی۔ معاشی طور پر لاہور مضبوط ہوا، تعلیم کو فروغ حاصل ہوا اور مذہبی تنوع میں ایک ایسا معاشرہ تشکیل پایا جو بعد میں اس علاقے کی تاریخی اور تہذیبی سمت کو واضح کرتا ہے۔

گیارھویں صدی عیسوی کے دوران جنوبی ایشیا کی حکومتوں میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور یہ اسلامی مملکتوں کی ترقی کا دور تھا۔ ہندوستان اور ایران کے تجارتی اور جغرافیائی سنگم پر واقع ہونے کی وجہ سے لاہور معاشی استحکام کی طرف گامزن تھا۔ لاہور پر ہندو مت اور بدھ مت کے تحت پروان چڑھنے والی معاشرت کی

چھاپ کمزور اور اسلامی طرزِ فکر، ثقافت اور مذہب کی گرفت مضبوط ہوتی جارہی تھی۔ اسلام خطے کے طول و عرض میں نشوونما پا رہا تھا۔ بالخصوص غزنوی کے عہد میں یہ غلبہ نمایاں رہا۔

صوفیا معاشرتی اور مذہبی ہم آہنگی کا پرچار کر رہے تھے۔ دینِ اسلام کے بنیادی افکار کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرت کے بنیادی ارکان مساوات اور برابری کا درس بھی پھیلایا جارہا تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر ہندو مت اور بدھ مت کے زیرِ اثر سماج میں اسلام کو بھی پذیرائی ملی۔ معاشرہ جو طبقاتی طور پر منقسم تھا۔ اسلام کے مبلغین اور صوفیا کے معاشرتی بھائی چارے کی تعلیمات اور اسلامی مساوات کے پرچار کی وجہ سے ہندو مذہب کے پیروؤں نے اس نئی مذہبی تبدیلی کو دل سے قبول کیا اور اسلام کی کشش سے وہ اس طرف راغب ہوئے۔ لاہور جو تجارتی اور دفاعی حوالے سے مرکز کا کام کر رہا تھا اب روحانی، مذہبی اور علمی حوالوں سے بھی مرکز کی حیثیت اختیار کر گیا۔

جس طرح بڑی زبان چھوٹی زبانوں پہ اثر انداز ہوتی ہے اور چھوٹی زبانیں بڑی زبانوں کے الفاظ کو جگہ دیتی ہیں۔ اسی طرح ایک طاقتور معاشرے کی اقدار اپنے سے کمزور معاشرت پر اثر انداز ہو کر اس میں تبدیلی کا سبب بنتی ہیں۔ ہندو معاشرے نے اسلام کے اثر کو قبول کرنا شروع کر دیا۔ ہندو مت کے بعض تہواروں پر اسلامی رنگ چڑھنے لگا۔ اسی طرح کچھ رسموں کی چھاپ ہندو مت سے اسلامی تہواروں میں منتقل ہونے لگی ایک ایسی ہم آہنگی کی فضا قائم ہوئی۔ جس سے ایک نیا ہند اسلامی معاشرہ تشکیل پانے لگا۔ طرزِ تعمیر میں بھی تبدیلی ہونے لگی۔ مسجدوں اور مقبروں کی تعمیر ہوئی۔ لاہور قلعہ اسی عہد میں تعمیر ہوا۔ جس کی مزید توسیع اور از سرِ نو تعمیر مغل باشاہ اکبر کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ اسی طرح مندروں اور اسٹوپوں کے ساتھ ساتھ اسلامی فنِ تعمیر کا بھی اضافہ ہوا۔ گنبد، مینار اور محراب اسلامی فنِ تعمیر کی شناخت سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی تعمیر سے شہر کی شناخت بھی بدلنے لگی اور یہ اسلامی عمارات ثقافتی ورثے میں اہم اضافہ کرتی رہیں۔ غافر شہزاد اپنی کتاب "لاہور کے مینار" میں گنبد اور مینار کو اسلامی علامت کے طور پر ایسے بیان کرتے ہیں:

> اسلامی فنِ تعمیر میں گنبد کے برعکس مینار واضح طور پر اپنا ایک الگ تشخص رکھتا ہے۔ اس کا مضبوط رشتہ عملی ضرورت کے ساتھ استوار ہے اور اس کی حیثیت ایک علامت کی بھی ہے۔ گبند تو محض کمرے کی چھت کی ہی ایک شکل ہے جس

> کی تزئین و آرائش اس کو دلکش اور جاذب نظر بناتی ہے اس کے برعکس مینار کی تشکیل ایک لازمی ضرورت کے پیش نظر ہوئی۔ بعد ازاں یہی مینار اسلام اور مسلمانوں کی موجودگی کی علامت کا مظہر قرار پایا اور اس کو ارفع وبلند مقام کا امتیاز حاصل ہوا۔(۲۹)

بارھویں سے چودھویں صدی کے دوران مسلم حکمران اس خطے پر حکمران رہے۔ البتہ ان کا تعلق مختلف علاقوں یا خاندانوں سے تھا۔ اس دور میں شہر لاہور کی تہذیب نے فروغ پایا۔ زبانیں تبدیل ہوئیں۔ رسوم و رواج بدلے اور نئی تعمیرات سے علاقے کی ہیت تبدیل ہوئی۔ اس زمانے کے لاہور میں کئی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی تھیں جو اس بات کی دلیل تھیں کہ لاہور کئی ایک علاقوں کی ثقافت کا مظہر تھا۔ اس عہد میں فارسی زبان کو سرکاری زبان کا رتبہ حاصل تھا اور ادبی زبان بھی یہی تھی۔ سلاطین دہلی کے حاکمین بھلے وہ غزنوی ہوں یا غوری۔ انہوں نے انتظامی اور ثقافتی حوالوں سے فارسی زبان کی پرداخت کی۔ اس دور میں جہاں فارسی شعر و ادب تخلیق کرنے والے کثیر تعداد میں موجود تھے۔ وہیں علما اور صوفیا نے دینی تصانیف فارسی زبان میں لکھ کر اپنی ذمہ داریاں نبھائیں۔ عربی چوں کہ مسلمانوں کی دینی زبان ہے اس بنا پر عربی زبان کو دینی تعلیم اور مذہبی علوم سکھانے کے لیے رواج دیا جاتا تھا یوں مسجدوں اور مدرسوں میں جو زبان پڑھائی جاتی تھی وہ عربی تھی۔

سیاست اور سماج کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دوران لاہور کی سماجی زندگی حکمرانوں کے ذوق کے تحت پروان چڑھی۔ سلاطین نے لوگوں کا معیارِ زندگی بہتر بنانے کے لیے امن و امان قائم کیا۔ ملکی انتظام بہتر کیا جس سے عوام خوشحال ہوئی۔ لاہور دارالسلطنت کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اس وجہ سے یہاں مختلف طبقات کے لوگ آباد تھے جن میں علما، تاجر، حکومتی امور چلانے والے اور عام آدمی شامل تھے۔ تجارت کی غرض سے آنے والوں کی وجہ سے لاہور کی معاشرت کا حلقہ بڑھتا چلا گیا اور شہر لاہور کے سماجی انتظام میں تنوع آیا۔ پہلے سے موجود مذہبی تنوع کے ساتھ ساتھ سماجی تنوع نے شہر کی زندگی پہ اچھا اثر ڈالا اور لاہور مختلف علاقوں کی ثقافت کو اپنے دامن میں جگہ دیتا گیا۔ شہر میں جہاں مسلم حکمرانوں کے زیر اثر مساجد کی تعمیر کی جارہی تھی وہیں دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کو بھی تحفظ حاصل تھا اور عبادت گاہوں کی

تعمیر پر بھی پابندی نہیں تھی۔ مسلمانوں کی عبادت گاہوں میں حضرت داتا گنج بخش کا مزار اور مسجد اس دور کی یاد گار ہے۔ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے اس کو یوں بیان کیا ہے:

> حضرت داتا گنج بخشؒ کا مزار واقع بیرون بھاٹی دروازہ شہر لاہور میں بہت مشہور زیارت گاہ ہے۔ ہزاروں زائرین یہاں فاتحہ خوانی کے لیے آتے ہیں جب آپ کا انتقال ہوا تو لاہور میں اس وقت سلطان ظہیر الدولہ رضی الدین بن مسعود بن محمود غزنوی (۴۹۰ھ۔ ۴۵۰ھ) بر سرِ اقتدار تھا۔ اس نے نہایت اہتمام سے آپ کا مزار تعمیر کرایا۔(۳۰)

اس صدی میں دہلی سلطنت کے عروج کا سورج غروب ہونے لگا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور بحیثیت مرکز کمزور ہوا۔ تیمور کے ہندوستان پر حملے کے دوران، لاہور براہ راست اس کے ہدف پر نہ تھا۔ البتہ ان حملوں کے دوران اس نے یہاں سے مال اسباب لوٹا اور لاہور کو نقصان اٹھانا پڑا۔ کئی لوگ جان کی بازی ہار گئے۔ بہت سارے بے گھر ہوئے اور شہر چھوڑنے پر مجبور ہوئے۔ جس کی وجہ سے لاہور کی آبادی میں کمی واقع ہوئی۔ تجارت اور معاش کو نقصان پہنچا۔بے روز گاری اور غربت بھی پہلے کی نسبت بڑھ گئی۔

تیمور کے حملوں کے دوران کئی ہندو اور باقی مذاہب سے تعلق رکھنے والے نقل مکانی کر گئے اور شہر کی مسلم آبادی میں اضافہ ہوا۔ شہر لاہور میں مسلمانوں کی آبادی بڑھنے کے دو محرکات تھے۔ایک باہر سے ہجرت کر کے آنے والے مسلمان یہاں مقیم ہوتے گئے۔ دوسرا ہندو اور دیگر مذاہب کے لوگ ہندوستان کے باقی شہروں میں نقل مکانی، لاہور میں مسلمانوں کی آبادی میں اضافے کا سبب بنی۔ لیکن اس دوران بھی مذہبی انتہاپسندی نے فروغ نہ پایا بلکہ مذاہب میں رواداری کی فضا برقرار رہی۔

تیمور کے حملے کی وجہ سے فنون لطیفہ نقصان کی زد میں آیا۔ خطاطی، مصوری اور موسیقی سے جڑے فن کاروں نے شہر چھوڑ کر دوسری جگہوں کا رخ کرنے میں امان پائی۔ علم کی تلاش میں لاہور کا رخ کرنے والوں نے حالات کی خرابی کی وجہ سے شہر چھوڑنے کو ترجیح دی اور علمی سرگرمیاں پہلے کی نسبت محدود ہو گئیں۔ تیمور کے حملوں سے ایک بڑی سیاسی سماجی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ مختلف مذاہب اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے زیادہ تر شہر چھوڑ گئے اور مسلمان باقی رہ گئے تو شہر کی ثقافت نے یک رخا انداز اپنایا۔ اس دوران

اسلامی طرزِ تعمیر اور ثقافت نے بڑھوتری پائی لیکن مذہبی اور ثقافتی تنوع میں کمی واقع ہوئی۔ حملوں نے شہر کی سیاسی سماجی ساخت تبدیل کر کے رکھ دی اور شہر تباہ حالی کا منظر پیش کرنے لگا۔ یہ دور شہر لاہور کی تاریخ میں ایک مشکل کل کی داستان سناتا ہے۔

پندرھویں صدی کی شروعات ہوتی ہے تو لاہور، افغانستان سے تعلق رکھنے والے حکمران لودھی خاندان کی حکومت میں شامل تھا۔ بہلول لودھی کے بعد سکندر لودھی حکمران ہوا تو اس نے عام عوام کی بہتری کے لیے اقدامات کیے۔ سکندر سادہ طبیعت تھا لیکن غصے کا تیز تھا۔ اسے غریبوں اور مساکین کی فہرست پیش کی جاتی اور وہ ان کی ضروریات جیسے کھانوں، وظیفے اور سردیوں میں گرم کپڑوں شالوں وغیرہ کا اہتمام کرتا۔ وفادار ہندوؤں کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ تھا لیکن طبیعت میں تیزی کے سبب مخالفین کے لیے سخت دل تھا۔ سکندر لودھی کے زمانے میں فارسی زبان کو فروغ حاصل ہوا اور ہندوؤں نے بھی فارسی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ اس بنا پر ہندو سرکاری ملازمتوں کے اہل قرار پائے۔ اس عہد میں کتب کے سنسکرت سے فارسی میں تراجم بھی ہوئے۔

سولہویں صدی میں مغل حکمرانوں کی خاص توجہ اور التفات کی وجہ سے لاہور دوبارہ ترقی کی راہ پہ چل پڑا۔ اگرچہ بابر اور ہمایوں کے دور میں لاہور مغل حکومت کا دار لحکومت نہ تھا لیکن اس لاہور کے روشن کل کا آغاز تھا جو اسے اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کے زمانے میں دیکھنا نصیب ہوا۔ مغل دوسری قوموں کے مقابلے میں زیادہ جنگجو تھے لیکن جب انہوں نے اقتدار سنبھالا تو انتظامی امور کی طرف متوجہ ہوئے اور تمام تر توانائی ریاست کو سیاسی طور پر مستحکم کرنے، فنونِ لطیفہ کو ترقی دینے اور تجارت کے فروغ میں صرف کی۔ جس کے اثرات دیگر شہروں کی طرح لاہور میں بھی نمایاں ہوئے۔ معیشت کے مستحکم ہونے سے لوگوں کا معیار زندگی بہتر ہوا۔ جس سے دیگر شہروں سے دوبارہ لوگ لاہور کا رخ کرنے لگے۔ مقامی آبادی کے ساتھ دیگر اقوام جن میں کشمیری، ترکی اور ایرانی یہاں آباد ہوئے اور لاہور اس وقت ہندوستان کے بڑے شہروں میں گنا جانے لگا۔

سترھویں صدی لاہور کے لیے ترقی اور عروج کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس عہد میں لاہور نہ صرف ہندوستان بلکہ اسلامی دنیا کی توجہ کا مرکز بنا رہا۔ اس دوران لاہور ایک اہم تجارتی مرکز بھی تھا شہر کے لوگ مختلف پیشوں اور صنعتوں سے وابستہ تھے زیادہ تر لوگ زراعت سے منسلک تھے کپڑا بُننے، زیورات بنانے اور

مٹی کے برتن بنانے کا کام بھی کیا جاتا تھا اسی طرح سے لکڑی کا کام بھی کیا جاتا تھا لاہور کے بازاروں میں اطراف سے آنے والے تاجر کپڑے، قالین، چمڑے سے بنی مصنوعات، قیمتی پتھروں اور مصالحہ جات فروخت کرتے تھے لیکن تجارتی اعتبار سے اس دور کی اہم پیشرفت لاہور میں نیل کی منڈی کا قیام عمل میں لانا ہے۔اس بارے عبدالحمید شیخ لکھتے ہیں:

اس عہد میں برصغیر میں نیل کی دو بڑی منڈیاں لاہور اور آگرہ میں تھیں۔ دیگر قابل ذکر منڈیاں ملتان، الہٰ آباد، سورت اور دلی میں تھیں۔ لیکن لاہور کی منڈی ان سب میں سب سے بڑی اور آگرہ کی معیار کے لحاظ سے دیگر منڈیوں پر سبقت رکھتی تھیں۔(۳۱)

اس صدی میں لاہور نے ثقافتی، سیاسی سماجی اور علمی حوالوں سے ترقی کی۔ سترھویں صدی میں مغل بادشاہوں جہانگیر، شاہ جہان اور اورنگزیب عالمگیر کی خصوصی توجہ سے لاہور میں فنِ تعمیرات کو بھی فروغ ملا۔ جہانگیر نے آگرہ اور لاہور کے راستے پر کوس مینار تعمیر کرائے۔اسی کے ساتھ مسافروں کو سہولت فراہم کرنے کے لیے اس نے ہر تین کوس کے بعد کنویں کھودنے کے احکامات صادر کیے۔" نقوش "لاہور نمبر میں تزک جہانگیری سے یوں نقل کیا گیاہے کہ:

چودھویں سال جلوس یعنی ۱۶۱۸ء میں بادشاہ نے حکم دیا کہ آگرہ سے لاہور تک شاہراہ اعظم پر کوس کوس کے فاصلے پر ایک مینار تعمیر کیا جائے اور ہر تین کوس کے فاصلے پر ایک کنواں کھودا جائے۔(۳۲)

یہ مینار جہاں مسافروں کی سفری آسانی کے کام آتے تھے وہیں فنِ تعمیر اور اسلامی ثقافت کے مظہر بھی تھے۔اکبر نے جس مذہبی ہم آہنگی کو فروغ دیا تھا۔جہانگیر نے اس روش کو برقرار رکھا۔ جہانگیر نے نہ صرف پہلے سے موجود مذاہب ہندو اور مسلمانوں کے درمیان رواداری برقرار رکھنے میں کردار ادا کیا بلکہ اس خطے میں نئے آنے والے عیسائی پادریوں کو بھی عزت دی۔اس حوالے سے محمد دین فوق لکھتے ہیں:

اکبر یورپین پادریوں کی بیحد عزت کرتا تھا۔ لیکن جہانگیر اس سے بھی دو قدم آگے نکلا۔ اس نے گوا کے پادریوں کو لاہور میں سب سے پہلے ایک گرجا تعمیر

کرنے کی اجازت دی۔ اور ان کے لیے خزانہ لاہور سے معقول وظائف بھی مقرر کیے۔(۳۳)

شہر لاہور اکبر کے عہد سے سیاسی سماجی اور ثقافتی حوالوں سے ترقی کی راہ پہ گامزن تھا۔ نور الدین جہانگیر کے بعد شاہ جہان کا عہد لاہور میں مغلیہ سلطنت کے عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے۔ شاہ جہان نے اکبر اور جہانگیر کی روش کو برقرار رکھا۔ شاہ جہان نے اسلامی تہذیب و ثقافت کو فروغ دیا لیکن اس نے اکبر کی طرح مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے درمیان معاشرتی ہم آہنگی کو قائم رکھا۔ شاہ جہان فنِ تعمیر کا بھی ذوق شوق رکھتا تھا۔ اسی بنا پر شاہ جہان کے عہد میں لاہور کی شناخت بننے والی اسلامی تعمیرات کو اہمیت حاصل ہے۔ شاہ جہان کے احکامات کی تکمیل کرتے ہوئے یہاں کئی ایک ایسی عمارات تعمیر ہوئیں جو آج بھی اپنے وسیع تہذیبی اور ثقافتی پس منظر کی عکاس ہیں۔ ان میں شاہی قلعہ کی بعض عمارات قابل ذکر ہے۔ قلعے کی توسیع میں انتہائی نفیس اسلامی طرزِ تعمیر کا خیال رکھا گیا۔ اس نفاست کی خاص جھلک شیش محل میں دکھائی دیتی ہے۔ اس محل کے اندرونی حصوں پر شیشے کا باریک کام کیا گیا ہے۔ شیشوں پر روشنی پڑنے سے منعکس ہوتی ہے اور ایک دیدہ زیب منظر پیش کرتی ہے یہ مغل فرمانرواشاہ جہان کے اعلیٰ تعمیری ذوق کی غماز اور یادگار ہے۔ دیگر عمارتوں کی طرح مساجد کی تعمیر میں بھی شاہجہان کے اسلامی فن تعمیر کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ شہر لاہور میں شاہ جہان کے دور کی یادگاروں میں مسجد وزیر خان بھی ہے۔ یہ مسجد سولہویں صدی کی تیسری دہائی میں تعمیر کی گئی اور یہ اس قدر خوبصورت ہے کہ کاشی کاری کے عمدہ نمونوں اور خوبصورتی کی بنا پر اسے لاہور شہر کے رخسار کا تل بھی کہا جاتا تھا۔ دیگر نمایاں تعمیرات میں شاہدرہ میں جہانگیر کا مقبرہ، زیب النسا کا دروازہ اور میاں میر کا مقبرہ شامل ہیں۔

شاہ جہان کا دور فنونِ لطیفہ، فن تعمیر، موسیقی اور خطاطی کے حوالوں سے یادگار اور عہد ساز دور تھا۔ اورنگزیب کے عہد میں مذہب اور سادگی کو فروغ حاصل ہوا اورنگ زیب عالمگیر دیگر مغل بادشاہوں سے زیادہ اسلام کا پابند تھا اس وجہ سے اس نے اپنے دورَ حکومت میں اسلامی ثقافت کو فروغ دیا۔ اورنگزیب خود بھی سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور عوام کو بھی اس کی ترغیب دلاتا تھا۔ اس کے اثرات ہمیں لاہور کی سماجی اور ثقافتی زندگی پہ واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ اورنگ زیب کے دور میں لاہور کی گلیاں اور بازار اسلامی اقدار کی

جھلک پیش کرتے تھے۔ غیر اسلامی طریقہ تجارت سمیت غیر اسلامی شعار پر بھی پابندی لگائی گئی۔ شریعت پر عمل درآمد کرایا گیا۔ لباس اور رہن سہن میں مذہبی رجحان اور اسلامی اقدار کو فروغ دیا گیا جس کی بنا پر لاہور کی ثقافت یکسر بدل گئی اور ایک نئے انداز میں ڈھل گئی۔ مغلوں کے دور میں جو تعمیرات لاہور میں ہوئیں وہ ہندوستان کے دیگر شہروں کے مقابلے میں کم ہیں اس کی نشاندہی کرتے ہوئے غافر شہزار اپنی کتاب "لاہور کے مینار" میں لکھتے ہیں کہ:

> مسلمانوں کے عہد میں اگر تعمیرات کے حوالے سے ہندوستان کے مختلف شہروں جیسے آگرہ، جے پور، دہلی وغیرہ کا لاہور کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہاں ان تعمیرات کا عشر عشیر بھی نہیں ہے۔(۳۴)

اورنگزیب نے بھی تعمیرات کروائیں لیکن وہ شاہجہان کے مقابلے میں کم ہیں۔ اورنگزیب کے عہد کی یادگار تعمیر بادشاہی مسجد ہے۔ یہ مغلیہ سلطنت کی چند آخری بڑی تعمیرات میں شمار کی جاتی ہے جو آج بھی موجود ہیں۔ اگرچہ یہ شاہی قلعہ کے ساتھ واقع ہے اور مغلیہ طرزِ تعمیر کے تسلسل کی نشانی ہے مگر شاہ جہان کی طرزِ تعمیر سے الگ ہے۔ سرخ اور سفید رنگوں کے پتھر اور سنگ مرمر سے تعمیر کردہ یہ مسجد سادگی اور جلال کا نمونہ ہے۔ یہ مسجد نہ صرف مسلمانوں کی عبادت گاہ تھی بلکہ یہ اسلامی تعلیم اور دینی علوم کا مرکز بھی رہی۔ اس مسجد کی تعمیر میں جہاں اورنگزیب کی اسلام سے محبت دکھائی دیتی ہیں وہیں کچھ اور آرا بھی سامنے آتی ہیں جیسے ایک کتاب "لاہور" میں بیان کیا گیا ہے کہ:

> کہا جاتا ہے کہ شہنشاہ نے بھائی داراشکوہ کو قتل کرنے کے بعد پچھتاوے میں یہ مسجد تعمیر کروائی جبکہ دیگر لوگوں کا خیال میں وہ مسجد وزیر خان کی خوبصورتی کو ماند کرنا چاہتا تھا۔(۳۵)

اورنگزیب کے عہد میں کئی دوسرے دینی مدارس بھی تعمیر کیے گئے جن میں اسلامی تاریخ، فقہ قرآن وحدیث اور دیگر علوم سکھائے جاتے تھے۔ دینی مراکز کے قیام کی وجہ سے فقہ اور اسلامی علوم کی تعلیم کا رواج بڑھا جس وجہ سے دین سے تعلق رکھنے والوں نے شہر میں ڈیرے ڈالے۔ صوفیا کا اثرورسوخ بڑھا مگر اس دوران ایک نئی بحث یہ چھڑ پڑی کہ اورنگزیب صوفیانہ زندگی اور درگاہوں کے انتظام کو اسلامی اصولوں

کے تابع دیکھنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس بنا پر بعض صوفی سلسلوں کو حکومت کی سرپرستی حاصل نہ رہی لیکن میاں میر جیسے بزرگانِ دین کے مزار اب بھی لوگوں کی توجہ کا مرکز تھے۔

مجموعی طور پر اورنگزیب کے دور میں شاہجہان جیسے دور کی ثقافتی نمو دیکھنے میں نہیں آتی ۔فنونِ لطیفہ اور تعمیراتی حسن میں پہلے جیسے رونق نہ رہی۔ البتہ انتظامی حوالوں سے یہ دور بھی بہتر رہا ، اسلامی تہذیب کو جلا ملی، اسلامی اقدار اور دینی تعلیم کو فروغ حاصل ہوا۔ اورنگ زیب کے بعد مغل سلطنت کا زوال شروع ہوتا ہے ایک تاریخی کتاب میں یوں درج ہے:

> اورنگ زیب (۱۶۵۸ء-۱۷۰۷ء) کی وفات کے بعد صرف بارہ برسوں میں تین دفعہ جانشینی کی جنگ نے مغلوں کے زوال کی رفتار تیز کر دی۔(۳۶)

لاہور، جو ایک عہد تک علم و فن، تجارت اور سیاست کا محور رہا۔ وہ رنجیت سنگھ کے حملوں کی وجہ سے کھنڈرات میں تبدیل ہونے لگا۔ آباد محلے ویران ہونے لگے۔ تجارت سے تعلق رکھنے والوں نے امرتسر کی طرف ہجرت کر کے پناہ لی۔ بعض ہندوستان کے دوسرے شہروں کا رخ کر گئے۔ جن کا تعلق کابل سے تھا وہ حملہ آور افواج کے ساتھ واپس کابل روانہ ہوئے۔ جو باقی رہ گئے انہوں نے اپنے آباد خرابے چھوڑ کر شہر میں اکبر کی بنائی گئی فصیلوں میں امان لی۔ شہر کا بیرونی حصہ حملوں کی زد میں تھا۔ رنجیت سنگھ کے دور میں مسلمانوں کی تاریخی عمارات کو نقصان پہنچا۔ مسلمانوں کی بنائی گئی عمارات سے پتھر اتروا کر اپنی عبادت گاہیں سجانے میں استعمال کروایا گیا۔ اس دور میں رقص اور موسیقی کو فروغ ملا۔

> جب مہاراجہ رنجیت سنگھ کا زمانہ آیا تو صرف حصار شہر کے اندر آبادی موجود تھی اور باقی محلے محض ویران کھنڈر پڑے ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں ان کی اینٹیں بکنی شروع ہوئیں اور چالیس سال تک کشمیری خشت فروشوں نے زمین کھود کر اینٹیں نکالیں اور بیچیں۔(۳۷)

انہی حالات کا تذکرہ کرتے ہوئے کنہیالال ہندی یوں لکھتے ہیں:

> ہر چند چالیس سال تک بیرونی آبادیوں کی بنیادیں سکھ عہد میں کھودی گئیں اور بیس برس تک انگریزی عہد میں کھدتی رہیں مگر اینٹیں ختم نہ ہوئیں۔(۳۸)

سکھوں سے لاہور کا اقتدار انگریزوں کو منتقل ہوا لاہور کی ثقافت مغربی حکمرانوں کے زیر سایہ پروان چڑھنے لگی۔ لاہور میں نئے تعلیمی اداروں کے قیام سے جہاں تعلیمی مشکلات میں کمی واقع ہوئی اور تعلیم کے ذرائع بڑھے وہیں جدید تعلیم کے ساتھ مغربی فکر بھی پروان چڑھی۔ گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اسی طرح مغربی طرز پر عمارات تعمیر کی گئیں جن میں ہائی کورٹ اور لاہور میوزیم وغیرہ شامل ہیں۔

ج۔ لاہور کی سیاست سماج اور لاہور بطور ادبی دبستان:

لاہور کی ادبی تاریخ بتاتی ہے کہ لاہور نے بدلتے زمانوں کے ساتھ سیاسی سماجی، ثقافتی اور ادبی نمو پائی ہے اور یہاں، فارسی، پنجابی اور اردو زبان میں ادب کی پرداخت ہوئی۔ شہر لاہور کئی صدیوں سے ادیبوں، دانشوروں اور شاعروں کا مسکن رہا ہے۔ مغل حکمرانی کے دور سے لے کر دورِ حاضر تک لاہور میں مختلف ادبی تحریکیں پروان چڑھیں۔ ان تحریکوں میں ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق اور جدیدیت و مابعد جدیدیت جیسے رجحانات کی آبیاری ہوئی۔ محمد حسین آزاد، اقبال فیض اور میر اجی اسی دبستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

پاکستان کے قیام سے قبل بھی لاہور ادبی سرگرمیوں کا محور تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد لاہور کی ادبی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ ہوا کیوں کہ تقسیم ہندوستان کے بعد بہت سے شعرا اور ادیبوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں سے ہجرت کر کے لاہور میں سکونت اختیار کی۔ یہاں کئی ادبی رسائل اور جریدوں کی اشاعت ہوتی رہی۔ سیمینار منعقد ہوتے رہے اور نئے ادبی نظریات پہ بحثیں ہوتی رہیں۔ پاک ٹی ہاؤس جیسے مقامات پر ادبی محفلوں کے انعقاد کی ایک طویل روایت موجود ہے اور یہ ادبی بیٹھک آج بھی لاہور میں سجائی جاتی ہے۔ اسی طرح ی لاہور میں اردو ادب کی ترویج و ترقی کے لیے دیگر ادارے بھی کام کر رہے ہیں۔

لاہور کے علمی، ادبی، سیاسی سماجی اور ثقافتی عروج کی داستان سلطان محمود غزنوی کے دور سے شروع ہوتی ہے غزنوی دور میں جب لاہور کو ثانوی پایہ تخت بنایا گیا تو لاہور کو شہرت حاصل ہوئی اور اسی دور میں لاہور ایک اہم علمی و ادبی مرکز قرار پایا۔ لاہور انتظامی اور فوجی مرکز بنا تو یہاں ماہرینِ فن کی آمد شروع ہوئی اور دارالحکومت بننے کی وجہ سے یہاں مختلف علوم و فنون اور ادب سے تعلق رکھنے والے ماہرین کی آمد میں اضافہ ہوا۔ یوں لاہور کی ادبی فضا نے ترقی اور شہرت کی جانب اپنا سفر شروع کیا۔ لاہور مختلف علوم و فنون کا مرکز قرار پایا۔ نقوش "لاہور نمبر" میں اس کے حوالے سے یوں درج ہے:

> معلوم ہوتا ہے کہ غزنوی سلطنت کا دوسرا شہر اور صوبہ پنجاب کا صدر مقام ہونے کے سبب لاہور بھی علم و فضل کا مرکز بن گیا۔ یہاں کے حکام کے درباروں میں علما کی تعداد کثیر نظر آنے لگی۔ (۳۹)

سلطان محمود غزنوی ایک ایسا حکمران تھا جس نے علم و ادب کی سرپرستی کی۔ اس کے دربار میں کئی فارسی شعراء کی موجودگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں ادب کو کس حد تک

اہمیت و فوقیت دی جاتی تھی۔ سلطان کے دربار میں فردوسی، عنصری، فرخی، اور اسدی طوسی نمایاں شعراء تھے۔ اگرچہ ان میں سے بیشتر غزنی میں تھے مگر ان کے اثرات لاہور تک بھی پہنچے کیوں کہ غزنی سلطنت میں لاہور کو ثانوی پایہ تخت کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ غزنی دربار کے اثرات تھے کہ لاہور میں فارسی ادب کا باقاعدہ فروغ غزنوی حکمرانوں کی سرپرستی میں ہوا اور کئی مقامی شعراء اور علما نے یہاں سکونت اختیار کی۔ اس کے علاوہ صوفیاء کی آمد نے اس شہر کو ایک نئی پہچان دی۔ محمد زمان چیمہ لکھتے ہیں:

> غزنوی دور میں لاہور پہلی بار شعر و ادب کے مرکز کے طور پر مشہور ہوا۔ شیخ علی ہجویری نے تصوف کے موضوع پر برصغیر کی پہلی شہرہ آفاق کتاب کشف المحجوب فارسی زبان میں اسی شہر میں بیٹھ کر لکھی۔ مسعود سعد سلمان (۱۰۴۶ء - ۱۱۲۱ء) نے اپنا "سہ لسانی دیوان" بھی اسی شہر کی فضاؤں میں رہ کر تخلیق کیا تھا۔ ابوالفرج رونی (م ۱۰۹۷ء) بھی اسی عہد میں لاہور کے نامور شاعر تھے۔ (۴۰)

سلطان محمد غزنوی اور اس کے جانشینوں کے عہد میں لاہور میں جس زبان نے فروغ پایا وہ فارسی زبان تھی۔ اس وقت یہاں علمی و ادبی اظہار کے لیے فارسی زبان ہی استعمال ہوتی تھی اور جہاں اس دور میں علم و ادب کے فروغ میں فارسی زبان کا کردار اہم رہا۔ وہیں فارسی میں علمی مباحث اور ادبی پیرایہء اظہار کی بدولت فارسی زبان و ادب کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ یہی وہ دور تھا جس میں کئی نامور شعراء، مورخین اور علماء نے شہر لاہور میں قیام کیا۔ سلطان محمود غزنوی علم و ادب کی سرپرستی کرنے والا بادشاہ تھا اس کے جانشینوں نے بھی علم و ادب کی سرپرستی کی اور یوں لاہور میں علم و ادب کی روایت ثروت مند ہوئی۔

غزنوی سلطنت میں غزنی مرکزی دارالحکومت تھا جبکہ لاہور کو ثانوی پایہ تخت کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی وجہ سے غزنوی کے زیر انتظام علاقوں میں لاہور علم و ادب کے دوسرے مرکز کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ فارسی کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا اور چونکہ سرکاری سطح پر علم و ادب کو سرپرستی حاصل تھی اس وجہ سے اسی زبان میں علمی مباحث اور ادبی زبان کو فروغ ملا۔ ہم یہاں کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں فارسی نے یہاں کی علمی و ادبی ترقی میں کلیدی کردار ادا کیا۔

لاہور جہاں علمی و ادبی مرکز قرار پایا وہیں عسکری، انتظامی اور تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے اس کی اہمیت میں اضافہ ہوا۔ علمی شخصیات کے ساتھ ساتھ شہر لاہور کو صوفیاء نے بھی مسکن بنایا۔ اس وجہ سے یہاں

کی ادبی سرگرمیوں میں بھی اضافہ ہوا۔ جیسا کہ بتایا گیا کہ اس دور میں فارسی زبان کو مرکزی حیثیت حاصل تھی اور فارسی ہی سرکاری زبان تھی اس لیے اکثر صوفیا نے اپنی بات کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے فارسی کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اس کی بڑی مثال "کشف المحجوب" ہے۔ غزنوی دور حکومت میں ثانوی پایہ تخت ہونے کی وجہ سے لاہور میں فارسی کو فروغ حاصل ہونا ایک لازمی امر تھا اور اسی بنا پر یہ شہر علم و ادب کے اہم مراکز میں شمار ہونے لگا۔

داتا گنج بخش علی ہجویری کا تعلق غزنی سے تھا لیکن انہوں نے لاہور کو تصوف کا مرکز بنایا۔ لاہور کے صوفیانہ ادب میں ان کی کتاب کو اولیت اور استناد کا درجہ حاصل ہے۔ لاہور کو علمی و فکری مرکز بنانے اور فارسی نثر کے فروغ میں اس کتاب کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ لاہور میں فارسی ادب اور خاص طور پر صوفی ازم کی بات کی جائے تو نمائندہ کتاب کشف المحجوب ہمارے سامنے آتی ہے۔ داتا گنج بخش علی ہجویری کی یہ کتاب تصوف ہی نہیں فارسی نثر نگاری میں بھی اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے صوفیانہ نظریات کو علمی اسلوب میں پیش کر کے فارسی نثر کو ایک منفرد عملی و ادبی اسلوب دیا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ الرحمن اس علمی سرمایے کو ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ان کی تصنیف کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ اس سے قبل جتنی بھی کتابیں تحریر کی گئیں وہ سب کی سب عربی زبان میں تھیں لیکن انہوں نے پہلی بار اپنی کتاب فارسی زبان میں تحریر کی، جس سے تصوف کو بڑے پیمانے پر عام کرنے کا موقع ملا۔(۴۱)

اس دور میں مسعود سعد سلمان لاہوری، لاہور کے ادبی منظر نامے میں ایک نمایاں شاعر بن کر ابھرتے ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر فارسی زبان میں شاعری کی بلکہ غزنوی دور میں فارسی شاعری کو عروج بخشا۔ وہ غزنوی بادشاہوں کے دربار سے وابستہ تھے اس لیے ان کی فارسی شاعری میں لاہور کے سیاسی سماجی حالات کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنی شاعری میں لاہور کے حسن و جمال کے ساتھ زندگی کے تجربات کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں لاہور بطور ایک علمی و ثقافتی منظر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ مسعود سعد کے بارے سبط حسن یوں لکھتے ہیں:

> غزنوی دور کا سب سے مشہور شاعر مسعود سعد سلمان ساؤجی تھا۔ (۱۰۴۶ء-۱۱۲۱ء) دراصل پاکستان کا پہلا فارسی شاعر وہی ہے۔(۴۲)

اس کے علاوہ ابوالفضل بیہقی کی شاعری میں لاہور کا ذکر ملتا ہے۔ چوں کہ غزنوی عہد میں غزنی کو پایہ تخت کی حیثیت حاصل تھی اور ثانوی پایہ تخت لاہور تھا اور لاہور عسکری، تجارتی اور علمی حوالے سے اہم مرکز تھا اس لیے غزنی دربار کا بلا واسطہ تعلق لاہور سے قائم تھا۔ انھی وجوہات کی بنا پر غزنی کے دربار سے وابستہ شاعروں کے ہاں لاہور کا ذکر بھی ملتا ہے۔ ابوالفضل بیہقی کی تاریخ بیہقی میں لاہور کا ذکر ملتا ہے۔

یہ وہ دور تھا جس میں مورخین نے لاہور کا رخ کیا اور یہیں انھوں نے تاریخ و تحقیق کا کام انجام دیا۔ فارسی میں تحریر شدہ تاریخی کتب اس دور میں لاہور میں مقبول ہوئیں جس میں سبکتگین، محمود غزنوی اور دیگر حکمرانوں کے کارناموں کا اظہار ملتا ہے۔

لاہور کے ادبی منظر نامے پر غزنوی دور کو اہمیت حاصل ہے۔ لاہور میں فارسی ادب کو اس دور میں فروغ ملا۔ تصوف، تاریخ اور شاعری پر اہم کام ہمیں اسی دور میں نظر آتا ہے اور یہ کام اتنا وقیع ہے کہ آج بھی یہ کام کسی طور صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ سبط حسن اس دور کے نامور شعرا کا ذکر یوں کرتے ہیں:

> تذکرہ نویسوں نے مسعود کے علاوہ کئی اور لاہوری شاعروں کا ذکر کیا ہے ان میں عبد اللہ روزبہ، ابوالفرج رونی اور مسعود بن سعد شالی زیادہ مشہور ہیں۔(۴۳)

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس دور میں لاہور کی ادبی صورت حال متحرک اور روشن نظر آتی ہے۔ غزنوی حکمرانوں کی علم و ادب کی سرپرستی نے اس شہر کو علم و ادب کا گہوارہ بنا دیا اور یہ شہر ثقافتی اور ادبی اعتبار سے نمایاں ہوا۔ یہی دور ہے جو برصغیر پاک و ہند کی علمی و ادبی تاریخ میں اہم باب کی حیثیت رکھتا ہے۔

غوری اور سلاطینِ دہلی کے دور میں لاہور کی ادبی ترقی مختلف نشیب و فراز کا شکار رہی۔ اس دور میں بھی اظہار کا پیرایہ فارسی ہی رہا۔ اس عہد میں سرکاری سطح پر تو فارسی زبان کی فروغ پایا لیکن نثر اور شاعری ثروت مند نہ ہو سکی۔ اس کی وجوہات میں سیاسی اور عسکری حالات ہیں یہی وجہ ہے اس دور میں ہمیں کوئی بڑی ادبی تحریک دکھائی نہیں دیتی۔

غوریوں کے حملے اور فتوحات کے باعث لاہور میں علمی و ادبی سرگرمیاں متاثر ہوئیں۔ ایک ایسی روایت جس کے جلو میں علم و ادب اور فنون کا ارتقا نمایاں تھا، متاثر ہوئی۔ محمد غوری کی حکومت کا مرکز دہلی

کے ساتھ غزنی تھا۔ لاہور عسکری حوالے سے اہم رہا لیکن اس کی علمی و ادبی روایت ضرور متاثر ہوئی۔ غزنوی عہد میں علم و ادب کی روایت نہ صرف شروع ہوئی بلکہ ثروت مند ہوئی وہ دم توڑ گئی۔ غوری دور میں لاہور میں کسی بڑے شاعر، مورخ یا علمی شخصیت کا ذکر نہیں ملتا، جو ظاہر کرتا ہو کہ یہ شہر اس دور میں علمی و ادبی سرگرمیوں کے لیے زیادہ نمایاں تھا۔

غوری کے بعد دہلی میں خاندانِ غلاماں اور دیگر ترک و افغان سلاطین کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ خاندانِ غلاماں کے علاوہ خلجی خاندان، تغلق خاندان، سید خاندان اور لودھی خاندان نے حکومت کی۔ ان کو سلاطین دہلی کہا جاتا ہے۔ سلاطینِ دہلی کے دور میں لاہور ایک اہم صوبائی دارالحکومت تھا لیکن دہلی کے مقابلے میں یہاں ادبی سرگرمیاں محدود رہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دہلی مرکزی دارالحکومت تھا۔ علمی و ادبی سرگرمیاں بادشاہوں کی دلچسپیوں کے مرہون منت ہوتی ہیں اور انہی وجوہات پر اس دور میں دہلی میں علم و ادب کی روایت مضبوط ہوئی لیکن لاہور میں علم و ادب کو غزنوی عہد جیسا کمال حاصل نہ رہا۔ فارسی اس دور میں بھی دربار اور اعلیٰ طبقات کی زبان رہی لیکن اس کا مرکز دہلی اور دیگر علمی شہر تھے۔ لاہور میں بھی فارسی ادب کو سرکاری سطح پر رواج حاصل ہوا لیکن کسی بڑی ادبی تحریک یا نمایاں شاعر کا ذکر نہیں ملتا۔

البتہ سلاطینِ دہلی کے دور میں، لاہور تصوف کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ داتا گنج بخش علی ہجویری کی تصنیف پہلے ہی لاہور کا روحانی تعارف کرواچکی تھی۔ اس دور میں کچھ صوفی بزرگوں کی تحریریں تو سامنے آتی ہیں لیکن فارسی اور عربی کے علمی و ادبی مراکز دہلی اور دیگر شہروں میں زیادہ مستحکم رہے۔ سلاطینِ دہلی کے عہد میں لاہور کئی مرتبہ حملوں اور جنگوں کا شکار رہا۔ خاص طور پر منگولوں کے حملے نے شہر کو شدید نقصان پہنچایا۔ منگول حملوں کے باعث یہاں کی علمی و ادبی سرگرمیاں جو پہلے ہی زیادہ مضبوط نہ تھیں اب مزید زوال کا شکار ہوئیں۔ اسی دور میں سنسکرت اور مقامی زبانوں پر فارسی کے اثرات نمایاں ہونے لگے لیکن لاہور میں کوئی بڑی علمی تحریک نظر نہیں آتی۔ پنجابی زبان میں ابتدائی صوفیانہ شاعری کا آغاز ہوا۔ غوری اور سلاطینِ دہلی کے دور میں لاہور علمی و ادبی سرگرمیاں جاری تو رہیں لیکن لاہور اس حوالے سے کوئی بڑا مرکز بن کر سامنے نہیں آتا البتہ اس دور میں تصوف کی روایت ثروت مند ہوئی۔

ظہیر الدین محمد بابر نے ۱۵۲۶ء میں مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی تو لاہور سیاسی اور انتظامی حوالے سے پس منظر میں تھا۔ اس دور میں دہلی اور آگرہ سیاسی و ثقافتی مراکز تھے جب کہ لاہور کا زیادہ تر کردار ایک فوجی چھاؤنی کا تھا۔ اس دور میں لاہور تجارتی مرکز تو تھا لیکن علم و ادب نے ویسا فروغ نہ پایا۔ بابر کے دور میں قریب

قریب لاہور کی حیثیت وہی تھی جو سلاطین دہلی کے زمانے سے چلی آ رہی تھی لیکن بعد میں جلال الدین محمد اکبر اور جہانگیر کے زمانے میں لاہور کی حیثیت پھر تبدیل ہو گئی۔

برصغیر میں مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین محمد بابر خود ایک شاعر اور مصنف تھا۔ اس کی خودنوشت "بابر نامہ" ادبی لحاظ سے ایک اہم دستاویز ہے لیکن اس دور میں لاہور کے حوالے سے کسی خاطر خواہ علمی و ادبی سرگرمی کا پتہ نہیں ملتا۔ اس کی بڑی وجہ تو یہی ہے کہ یہ برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا ابتدائی دور تھا۔ جنگوں کی وجہ سے ملک عدم استحکام کا شکار رہا۔ مغلیہ سلطنت مستحکم نہیں تھی اس لیے بابر کی توجہ بھلا کیسے علم و ادب کی سرپرستی کی جانب مبذول ہو سکتی تھی۔ اس دور میں علم و ادب کی ترقی محدود رہی بلکہ یوں کہیے کہ سرکاری سرپرستی نہ تھی۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ سلاطین دہلی کے زمانے سے لاہور دارالحکومت نہیں تھا اس کی حیثیت محض عسکری اور تجارتی تھی اور بابر کے زمانے میں بھی برصغیر کے دارالحکومت آگرہ اور دہلی تھے اور وہیں علمی اور ادبی سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ دربار کی زبان اس وقت بھی فارسی ہی تھی۔ دربار کی سرپرستی کی بدولت دہلی اور آگرہ میں تو یہ زبان پھل پھول رہی تھی لیکن لاہور میں کوئی بڑی سرگرمی نظر نہیں آتی۔

بابر کا دور زیادہ تر جنگوں، سلطنت کے استحکام اور ابتدائی فتوحات میں گزرا۔ جس کی وجہ سے لاہور میں ادب اور ثقافت کو زیادہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ لاہور کی حیثیت عسکری اور تجارتی تھی۔ لاہور میں ثقافتی اور ادبی ترقی کا دور اکبر اور جہانگیر کے زمانے سے شروع ہوا۔ یہی وہ دور تھا کہ لاہور ایک بار پھر ادبی اور ثقافتی حوالوں سے نمایاں ہونے لگا۔ یہاں فارسی اور اردو زبان فروغ پانے لگی۔ مصوری اور دیگر فنون نے بھی عروج پایا۔

ہمایوں کا عہد انتشار اور جنگوں میں گزرا۔ اس نے شیر شاہ سوری کے ہاتھوں شکست کھائی اور جلاوطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوا۔ بعد میں اس نے دوبارہ اقتدار حاصل کر لیا لیکن ایک سال بعد ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ سیاسی عدم استحکام کا زمانہ تھا اس لیے لاہور میں کوئی بڑی علمی یا ادبی تحریک نظر نہیں آتی۔ ہمایوں خود فارسی ادب کا دلدادہ تھا اور اس کے دربار میں کئی فارسی شعراء اور مورخ موجود تھے مگر چونکہ دربار زیادہ تر دہلی اور آگرہ میں رہا، اس لیے لاہور میں اس کے اثرات کم تھے۔ حسب روایت لاہور میں علمی سرگرمیوں کے بجائے زیادہ تر فوجی اور انتظامی امور پر توجہ دی گئی۔

ہمایوں کی شکست کے بعد لاہور شیر شاہ سوری اور اس کے جانشینوں کے قبضے میں چلا گیا۔ اس دور میں لاہور ایک فوجی اور تجارتی مرکز رہا لیکن ادب و ثقافت پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔ سوری دورِ حکومت میں برصغیر میں عام انسانی فلاح کے کام ہمیں بکثرت نظر آتے ہیں لیکن علم و ادب کی صورت حال میں نمایاں ترقی نظر نہیں آتی۔ ان کی توجہ زیادہ تر شاہراہوں اور دیگر فلاح انسانیت کے متعلق کاموں کی طرف رہی اس لیے علم و ادب کی جانب زیادہ سرپرستی نظر نہیں آتی۔ فارسی زبان کو انتظامیہ میں استعمال کیا جاتا رہا مگر اس دور میں بھی علمی و ادبی سرگرمیوں کا مرکز زیادہ تر دہلی اور دوسرے بڑے شہر تھے۔ شیر شاہ سوری نے سڑکوں، قلعوں اور ڈاک کے نظام کو بہتر بنایا مگر لاہور میں کسی بڑی علمی تحریک کا آغاز نہ ہوا یہ مختصر سا زمانہ تھا اور یوں دوبارہ برصغیر میں مغلیہ سلطنت کا آغاز ہو گیا۔

ہمایوں نے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد فارسی ادب کو فروغ دینے کی کوشش کی، مگر اس کا دور بہت مختصر رہا۔ اس دوران بھی لاہور میں کوئی بڑی ادبی تحریک یا نمایاں علمی کام سامنے نہیں آیا۔ ہمایوں کے درباری شعراء اور مورخین زیادہ تر دہلی میں سرگرم رہے۔ اس دور میں فارسی زبان کو دربار کی سرپرستی حاصل تھی۔ ہمایوں کی حکومت کا زیادہ تر وقت بھی جنگوں اور جلاوطنی میں گزرا جس کی وجہ سے لاہور میں کوئی خاطر خواہ علمی ترقی نہیں ہوئی۔ لاہور کا ادبی اور ثقافتی عروج بعد میں اکبر اور جہانگیر کے دور میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

اکبر کے عہد میں لاہور مغلیہ سلطنت کے ایک بڑے علمی، ادبی اور ثقافتی مرکز کے طور پر ابھرتا ہے۔ اکبر نے فارسی اور دیگر زبانوں کے ادب کو فروغ دیا۔ اس دور میں لاہور نہ صرف ایک انتظامی اور فوجی مرکز تھا بلکہ یہ فارسی ادب کا بھی اہم گہوارہ بن گیا۔ یہی وہ دور تھا جس میں کئی مشہور شاعر، مؤرخ، مترجم، اور صوفی بزرگ لاہور میں مقیم رہے۔ اکبر نے لاہور کو مغلیہ سلطنت کا دارالحکومت بنایا۔ اس عرصے میں لاہور میں علمی و ادبی سرگرمیاں بھی عروج پر پہنچ گئیں۔ لاہور سمیت ہندوستان میں دیگر شہروں میں اکبر کی علم دوستی کے بارے میں سبط حسن یوں بیان کرتے ہیں:

> اکبر کے دورِ حکومت سے سلطنت مغلیہ میں نظام تعلیم کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ اکبر نے آگرہ، فتح پور سیکری، لاہور اور دوسرے مقامات پر نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج قائم کیے بلکہ نصاب میں بھی اہم اصلاحیں کیں۔(۴۴)

دربار سے وابستہ شعرا، مؤرخین، مترجمین، اور مذہبی علما یہاں قیام پذیر رہے۔فارسی زبان میں تاریخ، شاعری، مذہب، فلسفہ اور دیگر موضوعات پر بھی کام ہوا۔ محمد دین فوق، اکبر کے زمانے میں قلیج خان (جولاہور کا گورنر بھی تھا) کی علمی خدمات کے اعتراف میں رقم طراز ہیں:

> صاحب صلاح و تقویٰ تھا باوجود گورنر پنجاب ہونے کے طالبانِ علم کو خود درس دیتا تھا اس نے لاہور میں ایک دارلعلوم بھی اپنے ذاتی خرچ سے بنایا تھا جس میں فقہ اور حدیث و تفسیر کی تعلیم دی جاتی تھی اس کی کوشش سے پنجاب کے مختلف اضلاع میں علوم شرعیہ کی بہت کچھ اشاعت ہوئی۔(۴۵)

اکبر کے دربار میں فارسی زبان کو سرکاری حیثیت حاصل تھی اور لاہور میں کئی مشہور فارسی شاعر اور مصنفین نمایاں نظر آتے ہیں۔ جن میں ابوالفضل جو اکبر کے نورتنوں میں شامل تھا مشہور مؤرخ اور ادیب ہے۔ انھوں نے اکبرنامہ اور آئینِ اکبری جیسی شاہکار تصانیف لکھیں۔ ان کتب میں مغلیہ حکومت، قوانین، رسم ورواج اور معیشت پر تفصیل دی گئی ہے۔ آئین اکبری اس قدر مفصل کتاب ہے کہ ان معلومات کو رقم کرنے والے کی قابلیت پہ رشک آتا ہے صوبوں کی تفصیل لکھتے ہوئے وہ لاہور کا ذکر بھی تفصیل سے کرتے ہیں۔ انھوں نے لاہور میں قیام کے دوران دربار سے متعلق اہم تاریخی کام کیے۔ ان کے علاوہ فیضی جو اکبر کا درباری شاعر اور نورتنوں میں شامل تھا۔ اکبر کے عہد کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے فارسی شاعری کو نئے اسلوب سے آہنگ کیا۔ اس کے علاوہ اس نے عربی اور سنسکرت کی کئی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ اس نے لاہور میں قیام کے دوران علمی اور ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔علاوہ ازیں حکیم عبدالرزاق گیلانی لاہور میں اکبر کے دربار سے وابستہ طبیب، ادیب اور شاعر تھے۔ انھوں نے فارسی میں طبی علوم اور دیگر موضوعات پر کام کیا۔ ملاعبدالقادر بدایونی بھی اکبر کے درباری مؤرخ اور مترجم تھے۔ انھوں نے اکبر کی پالیسیوں پر تنقید بھی کی۔

اگرچہ اس دور میں اردو کو درباری حیثیت حاصل نہیں تھی لیکن لاہور میں اردو کا ارتقا ہونے لگا۔ اکبر کے دور میں ہی اردو نثر اور شاعری کے نمونے ملتے ہیں جن میں عوامی سطح کے قصے کہانیوں اور صوفیانہ شاعری کا رجحان نمایاں تھا۔لاہور میں ابتدائی اردو شعراء بھی سامنے آئے، جنہوں نے مقامی بولیوں میں شاعری کی۔

اکبر نے مختلف مذاہب کو قریب لانے کے لیے "دینِ الٰہی" کی بنیاد رکھی۔ اس مقصد کے لیے سنسکرت، عربی اور دیگر زبانوں کی کئی کتابوں کو فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ مذہبی گرما گرمی کا دور شروع ہوا۔ لاہور میں ہندو، جین، عیسائی اور مسلمان علماء کے درمیان علمی مباحثے منعقد ہوئے۔ ابوالفضل نے اکبر نامہ، آئینِ اکبری، فیضی نے فارسی شاعری، سنسکرت کتب کے تراجم، بدایونی نے منتخب التواریخ، حکیم عبدالرزاق گیلانی نے طبی علوم پر فارسی کتب لکھیں۔ اکبر کے دور میں لاہور پہلی بار ایک مکمل علمی و ادبی شہر کے طور پر ابھرا اور یہ روایت جہانگیر وشاہجہان کے دور میں مزید مضبوط ہوتی نظر آتی ہے۔

مغلیہ سلطنت کے چوتھے بادشاہ، نورالدین محمد جہانگیر کے عہد میں لاہور کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی۔ چوں کہ اکبر کے زمانے میں لاہور ایک مکمل علمی، ادبی اور ثقافتی حیثیت اختیار کر گیا تھا اور جہانگیر کے عہد میں بھی یہی روایت قائم رہی بلکہ مضبوط ہوئی اور لاہور نہ صرف ایک عظیم سیاسی اور ثقافتی مرکز بنا بلکہ یہاں ادب، فن، مصوری، موسیقی اور تصوف کو بھی زبردست فروغ ملا۔ اس دور میں بھی فارسی ادب کو شاہی سرپرستی حاصل رہی اور کئی نامور شعرا، مؤرخین اور صوفی بزرگوں نے فارسی میں اظہار کو ذریعہ بنایا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اردو کا ارتقاء بھی جاری رہا۔ جہانگیر کے عہد میں لاہور مغلیہ سلطنت کا ایک اہم شہر تھا اور اکثر بادشاہ خود بھی یہیں مقیم رہتا تھا۔ لاہور کو اس دور میں علمی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز بنانے میں کئی عوامل کارفرما تھے جن میں ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ خود فارسی ادب میں مہارت رکھتا تھا اور اس نے اپنی خودنوشت "تُزکِ جہانگیری" فارسی زبان میں تحریر کی۔ اس کتاب کی تاریخی اور ادبی اہمیت کو آپ بیتی کی روایت میں پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد نوشاد عالم لکھتے ہیں:

> اس کتاب میں جہاں ایک طرف اس کے اندازِ حکمرانی کا پتہ چلتا ہے وہیں علما فقراء کی قدردانی اور شوقِ مصوری وغیرہ کا بھی پتہ چلتا ہے۔ وہ نہ اپنی برائیوں پر پردہ ڈالتا ہے اور نہ ہی اپنی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے جھجکتا یا شرم محسوس کرتا ہے۔ وہ شراب پیتا ہے تو اس کا ذکر کرتا ہے اور اگر رات کو اٹھ کر خدا کی عبادت کرتا ہے تو اس کا بھی ذکر کرتا ہے۔ (۴۶)

جہانگیر کے دربار میں کئی ممتاز شاعر، مؤرخ اور فلسفی موجود تھے جنہوں نے فارسی ادب کی ترقی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس دور میں کئی صوفی بزرگ لاہور میں مقیم تھے جنہوں نے علمی و روحانی مباحث کو بھی

فروغ دیا۔ لاہور میں کئی مدارس اور کتب خانے قائم ہوئے جہاں فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کی تعلیم دی جاتی اور یہاں مذکورہ کتب کا ایک وسیع ذخیرہ تھا۔

جہانگیر خود ادب کا دلدادہ تھا اور ادب دوست بادشاہ تھا۔ خود نوشت میں جہانگیر نے اپنے عہد کی سیاسی، سماجی اور ثقافتی زندگی کا تفصیلی احاطہ کیا۔ اس میں لاہور کی خوبصورتی، یہاں کی علمی فضا اور دربار میں ہونے والی علمی و فکری سرگرمیوں کا ذکر بھی موجود ہے۔ ملا محمد صالح کنبو لاہور کے ایک نامور تاریخ دان اور ادیب تھے۔ ان کی مشہور تصنیف "شاہ جہاں نامہ" (جو بعد میں لکھی گئی) میں جہانگیر کے دور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ عبد الباقی نہاوندی فارسی زبان کے معروف تاریخ نویس تھے، انھوں نے جہانگیر کے دربار میں علمی خدمات انجام دیں۔ ان کی مشہور تصنیف "مآثر رحیمی" ہے جو مغل عہد کے علمی اور ادبی پہلوؤں پر ایک اہم ماخذ ہے۔ اگرچہ میر تقی میر جہانگیر کے عہد کے بعد مشہور ہوئے، مگر اس دور میں فارسی ادب کے فروغ نے اردو شاعری کی بنیاد رکھنے میں مدد دی۔ لاہور میں اس وقت اردو اور فارسی کا امتزاج نظر آنے لگا تھا۔

جہانگیر کے عہد میں لاہور کئی صوفی بزرگوں اور علما کا بھی مرکز رہا۔ ان بزرگان دین میں حضرت میاں میر خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، جن کی علمی و روحانی محافل میں فارسی اور اردو زبان میں گفتگو ہوا کرتی تھی۔ لاہور میں ان کی خانقاہ علم و ادب کا مرکز تھی۔۔ جہانگیر کے دربار میں کئی اہم کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔ جن میں ہندی اور سنسکرت کی کئی مذہبی اور فلسفیانہ کتب شامل تھیں۔ لاہور میں بھی شاہی کتب خانے قائم کیے گئے، جن میں علمی و ادبی کتابیں رکھی جاتی تھیں۔

جہانگیر کے دور میں لاہور فارسی ادب، تاریخ نویسی، شاعری اور تصوف کے مراکز میں شامل ہو چکا تھا۔ تاریخ نویسی میں کئی اہم کتب لکھی گئیں۔ "تُزکِ جہانگیری" جیسی سوانح عمری فارسی نثر کا شاہکار بنی۔ صوفیانہ ادب نے لاہور میں فروغ پایا۔ علمی مراکز اور کتب خانے قائم ہوئے۔

مغلیہ سلطنت کے پانچویں بادشاہ، شاہجہان کے عہد میں لاہور اپنی تعمیراتی خوبصورتی، علمی ترقی، اور ادبی سرپرستی کے باعث نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ اس دور میں فارسی ادب اپنے عروج پر پہنچا۔ جبکہ اردو زبان بھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ لاہور میں کئی ممتاز شاعر، مؤرخ اور صوفی بزرگ موجود تھے، جنہوں نے ادب کی ترویج میں نمایاں کردار ادا کیا۔ شاہجہان کے دربار میں فارسی ادب کو خصوصی مقام حاصل تھا اور لاہور میں کئی مشہور فارسی شاعر اور مؤرخ سرگرم رہے۔ شاہجہان کے حکم پر لاہور میں کتب خانوں اور علمی

مراکز کو فروغ دیا گیا جس سے لاہور کی علمی و ادبی ماحول مزید مستحکم ہوا۔ صوفیائے کرام کی خانقاہوں میں علمی و ادبی محافل منعقد ہوتی تھیں اور انہی علمی و ادبی محافل نے فارسی اور اردو ادب پر اثر ڈالا۔ اس دور کے نمایاں ادیبوں میں ملا عبدالحکیم سیالکوٹی، محمد صالح کنبوہ، سرمد ایرانی، چندر بھان برہمن لاہوری اور ملک الشعرا ابو طالب کلیم غنی شامل ہیں۔ ملا عبدالحکیم سیالکوٹی مشہور فلسفی اور عالم ہیں جنہوں نے فارسی اور عربی میں کئی اہم علمی کام کیے۔ ان کی تحریریں مذہبی اور فلسفیانہ موضوعات پر مشتمل تھیں۔ محمد صالح کنبوہ لاہوری معروف سوانح نگار، جنہوں نے "شاہ جہاں نامہ " تحریر کیا جس میں شاہجہان کے دور کی تاریخ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ سرمد ایرانی فارسی زبان کے عظیم صوفی شاعر اور مفکر ہیں جو اپنے منفرد اندازِ بیان کی وجہ سے مشہور تھے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ خیالات اور عشقِ حقیقی کے عناصر نمایاں نظر آتے ہیں۔ وہ لاہور اور دہلی میں تصوف و ادب کے مراکز سے وابستہ رہے۔ چندر بھان برہمن لاہوری فارسی ادب کے نمایاں ہندو شاعر اور نثر نگار تھے جو شاہجہان کے دربار سے وابستہ رہے۔ ان کی تحریریں فارسی ادب میں ہندو ثقافت کے امتزاج کی بہترین مثال ہیں۔ ان کے خطوط اور نثر پارے مغلیہ دربار کی سماجی اور ثقافتی جھلک پیش کرتے ہیں۔ ملک الشعرا ابو طالب کلیم غنی، شاہجہان کے دربار کے نامور شاعر ہیں۔ ان کی بہترین شاعری کی وجہ سے انھیں "ملک الشعرا" کا خطاب دیا گیا۔ ان کی شاعری میں تصوف، درباری زندگی، اور فارسی کلاسیکی روایات کی جھلک نمایاں ہے۔ ان کے قصائد اور غزلیں فارسی ادب کے اعلیٰ نمونے سمجھی جاتی ہیں۔ لاہور میں صوفی شعراء نے فارسی ادب کو ترقی دی اور تصوف پر مبنی شاعری کو فروغ دیا۔ شاہجہانی دور میں فارسی قصیدے اور غزلوں کی روایت مزید مستحکم ہوئی۔ تاریخ نویسی کے فن میں ترقی ہوئی، اور درباری مؤرخین نے مغلیہ تاریخ پر متعدد کتب تحریر کیں۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور سے لے کر مغلیہ سلطنت کے زوال تک لاہور کی ادبی صورت حال نشیب و فراز کا شکار رہی۔ ابتدائی طور پر فارسی ادب کو درباری سرپرستی حاصل رہی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سیاسی عدم استحکام، جنگوں اور اقتصادی بحرانوں کی وجہ سے لاہور کی علمی و ادبی ماحول پر گہرا اثر پڑا۔ اس دوران کچھ ادیبوں اور شعراء نے ادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا لیکن بحیثیت مجموعی علم و ادب کی روایت میں وہ دم خم نہ رہا جو پہلے تھا۔

اورنگزیب عالمگیر کے دور میں فارسی کو بطور سرکاری زبان برقرار رکھا گیا۔ اس دور میں فنون لطیفہ اور شاعری پر دربار کی سرپرستی میں کمی نظر آئی۔ درباری شاعری کا رواج کم ہوا۔ اورنگزیب کے عہد میں دینی،

صوفیانہ اور علمی تحریروں کو زیادہ اہمیت دی گئی۔لاہور میں مذہبی علماء اور صوفیائے کرام کے زیر اثر علمی اور فکری مباحثے جاری رہے۔

مغلیہ عہد کے آخری دور میں اقتدار کی کشمکش اور افغان و سکھ حملوں نے سلطنت کی گرفت کو کمزور کیا اور ملکی معیشت پر اثر پڑا۔ اس صورت حال نے لاہور کے علمی ماحول کو شدید نقصان پہنچایا۔ انہی مسائل کی وجہ سے دربار کی علمی اور ادبی سرپرستی بھی نہ رہی۔ اورنگزیب اور بعد کے مغل حکمرانوں نے ادب وفنون کی وہ سرپرستی نہ رہی جو مغل حکمرانوں اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کے دور میں تھی۔ کئی ممتاز ادیب اور شاعر لاہور سے دہلی، لکھنؤ اور دیگر شہروں کی طرف ہجرت کر گئے جہاں بہتر علمی مواقع موجود تھے۔

فارسی ادب کی روایت برقرار رہی لیکن اس کے عروج کا زمانہ ختم ہوا۔ اردو ادب نے آہستہ آہستہ جڑیں پکڑنا شروع کیں۔ لاہور کی صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ اس مرحلے میں لاہور کو مرکزی حیثیت حاصل نہ تھی۔ سیاسی عدم استحکام نے لاہور کی علمی و ادبی سرگرمیوں کو محدود کر دیا تھا۔ مغلیہ زوال کے ساتھ درباری شاعری اور ادب کی روایت بھی کمزور پڑ گئی۔ اورنگزیب عالمگیر کے دور سے مغلیہ سلطنت کے خاتمے تک لاہور کی علمی و ادبی صورتحال مسلسل زوال پذیر رہی۔ اس دور میں ادب کی روایت کمزور ہوئی اور سیاسی عدم استحکام کے باعث ادبی سرگرمیاں متاثر ہوئیں لیکن صوفیانہ اور مذہبی علمی کاموں کا تسلسل برقرار رہا اور لاہور میں محدود پیمانے پر علمی و ادبی محافل منعقد ہوتی رہیں۔ فارسی کے ساتھ ساتھ اردو زبان کو ذریعہ اظہار بنایا جانے لگا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد لاہور کی علمی و ادبی صورتحال میں نمایاں تبدیلیاں آئیں۔ فارسی زبان جو مغلیہ دور میں درباری اور علمی زبان تھی۔ آہستہ آہستہ پس منظر میں چلی گئی اور اس کی جگہ اردو نے لے لی۔ اردو زبان جو مغلیہ عہدِ زوال میں فارسی کے ساتھ ساتھ یہاں کے صوفیاء اور دیگر شعراء اور ادیبوں کا ذریعہ اظہار تھی اب نمایاں ہو کر سامنے آئی۔

سکھ دور میں علمی ذرائع محدود ہوئے اور علمی مراکز نہ ہونے جیسے تھے جیسا کہ کنہیالال ہندی لکھتے ہیں: "سکھوں کے عہد میں کوئی سرکاری مدرسہ شہر لاہور میں جاری نہ تھا" (۴۷)

سکھوں کے دور میں شاعروں اور ادیبوں کو دربار کی سرپرستی نہ رہی اس وجہ سے ادبی سرگرمیوں میں پہلے جیسی گہما گہمی نہ رہی۔ البتہ ادیبوں اور شعرا نے ادبی ذوق اور ذاتی لگاؤ کی وجہ سے ادبی روایت کو کسی

نہ کسی طرح زندہ رکھا اور پروان چڑھایا۔ ادبی تنزلی کے اس دور میں بھی لاہور علمی و ادبی حوالوں سے پنجاب کی پہچان بنا رہا۔ ممتاز اختر مرزا لکھتے ہیں:

> سکھوں کی قلمرو ہر اہم مرکز میں ایسے علمی گھرانے موجود تھے جو کسی نہ کسی صورت میں شعر و ادب کی خدمت کر رہے تھے۔ اہم شہروں میں امر تسر، لاہور، بٹالہ، پشاور اور کشمیر کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ لاہور اور امر تسر تو ادیبوں کے مرکز تھے۔(۴۸)

برطانوی راج کے قیام کے بعد جدید تعلیم، پریس، اور اشاعتی اداروں کے ذریعے علمی سرگرمیوں میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔ برطانوی راج میں فارسی ادب کی روایت ماند پڑ گئی اور اب اردو اور انگریزی کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کا دور شروع ہوا۔

برطانوی عہد میں لاہور ہندوستان کے اہم علمی مراکز میں سے ایک بن گیا۔ یہاں جدید تعلیمی ادارے قائم کیے گئے۔ نئے تعلیمی نظام کے ساتھ نئے افکار اور نظریات کی آئے۔ تعلیمی اداروں نے مشرقی و مغربی علوم کے امتزاج کو فروغ دیا۔ ان اداروں میں سائنسی، فلسفیانہ، تاریخی اور لسانی موضوعات پر تحقیق کی راہ ہموار ہوئی۔ نئے تعلیمی اداروں اور نئے نظام کی بدولت ایک منظر نامہ تشکیل پایا۔ اسی عہد میں بنائے گئے گورنمنٹ کالج کے بارے کنہیا لال ہندی لکھتے ہیں:

> گورنمنٹ کالج میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی علوم مروجہ پڑھائے جاتے ہیں اس سبب سے ہندو و مسلمان دونوں فریق اپنے لڑکوں کو بے اندیشہ کالج میں داخل کر دیتے ہیں(۴۹)

دلی کے اجڑنے کی داستان میں انگریزوں کے ۱۸۵۷ء میں ڈھائے گئے مظالم کا اضافہ رقم ہوا تو کئی ایک صاحب علم و فن نے دلی سمیت ہندوستان کے مختلف شہروں سے لاہور کا رخ کرنا شروع کیا کیوں کہ لاہور ایک نئے ادبی مرکز کی صورت اختیار کر رہا تھا۔ اس تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے انور سدید لکھتے ہیں:

> علم کے شمع برداروں کا قافلہ جس میں مولوی کریم الدین احمد، پنڈت من پھول، مولوی سید احمد دہلوی، الطاف حسین حالی، پیارے لال آشوب، درگا پرشاد نادر اور محمد حسین آزاد جیسے ادبا شامل تھے لاہور روانہ ہو گیا۔ اردو کی مشعل نے قرن اول میں شمال سے جنوب کی طرف سفر کیا تھا۔ ولی کے عہد میں واپسی کا سفر شروع ہوا تو یہ دلی آکر رک گئی اور پھر

آخری بار لکھنو میں چمکی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد یہ مشعل شمال میں اپنے سابقہ وطن کی طرف سفر کرنے لگی اور تھوڑے ہی عرصے میں لاہور کو اردو کے ایک نئے اہم مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی اور دلی کے ٹوٹے ہوئے ستارے آہستہ آہستہ اس شہر میں جمع ہونے لگے۔(۵۰)

سماجی معاشرتی سطح پر بہت سی تبدیلیاں اسی دور میں ہوئیں اور نئے نظریات نے فروغ پایا نئی سوچ نے جنم لیا اور نئے نظریات پنپنے لگے۔ یہ برصغیر کے فکری ارتقاء میں یہ ایک بڑی تبدیلی تھی۔ ڈاکٹر کنول دھیر اپنی کتاب "میں لاہور ہوں" میں اس دور کے لاہور کی علمی اہمیت کے حوالے سے لکھتے ہیں:

لاہور ہمیشہ سے ہی علم اور تعلیم کا مرکز رہا ہے۔ انگریزوں نے ۱۸۴۹ء میں لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ایک سروے کرایا جس کے مطابق اس وقت لاہور میں ۱۱۶ فارسی اسکول، ۲۶ عربی اسکول، ۴۴ عربی فارسی مشترکہ اسکول اور ۳۸ شاستری اسکول تھے۔ ان کے علاوہ جگہ جگہ بہت سے مدرسے اور سکول قائم تھے جو پرانے زمانے سے چلے آ رہے تھے۔(۵۱)

انگریز راج میں اردو ادب کو بھی بے حد فروغ ملا۔ فارسی کی جگہ اردو نے لی اور صحافت کے ذریعے علمی و فکری مباحث کو عام کیا گیا۔ لاہور میں کئی پریس اور اشاعتی ادارے قائم ہوئے جنہوں نے مختلف موضوعات پر کتب و رسائل شائع کیے۔ ان میں تاریخی، فلسفیانہ، اصلاحی اور سماجی موضوعات پر مبنی تحریریں نمایاں تھیں۔ صحافت نے بھی عوام کو تعلیمی اور سماجی ترقی کی طرف مائل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ سماجی معاشرتی تحریکوں نے جنم لیا اور ان کی کوکھ سے ادبی تحریکیں پھوٹیں۔ عالمی سطح پر قائم ادبی تحریکوں کی اثرات بھی برصغیر پر پڑے۔

اگر ہم ادب کی نوعیت کی بات کریں تو ادب میں اس دور میں روایت اور جدت کا امتزاج نظر آتا ہے۔ ایک طرف قدیم شعری اور نثری روایات کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف مغربی اثرات کے زیر اثر جدید طرز تحریر نے بھی مقبولیت حاصل کی۔ ادب میں قومی، اصلاحی، اور فکری موضوعات کو اجاگر کیا جانے لگا۔ اس دور کے ادیبوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے اردو کو ذریعہ بنایا، جس کے نتیجے میں یہ زبان عوام میں زیادہ مقبول ہوئی۔ اردو کو اظہار کا ذریعہ بنانے میں بھی یہی امر تھا کہ عوامی حلقوں تک

موثر رسائی ممکن ہو۔ زبان کی علمی سطح کے بجائے اسے عوامی سطح پر لے جانے کی کوشش کی گئی۔ زبان کو ذریعہ اظہار ہی کے طور پر ہی نہیں دیکھا گیا بلکہ اس کی اثر انگیزی اور ابلاغ کی رکاوٹوں کے حوالے سے بھی مد نظر رکھا گیا۔

انگریز راج میں لاہور کی علمی سرگرمیوں میں ایک مثبت پیش رفت ہوئی اور اسے علمی و ثقافتی مرکز کی حیثیت حاصل ہوئی۔ جدید تعلیم کے فروغ، اشاعتی اداروں کی ترقی اور علمی مباحث کی حوصلہ افزائی نے لاہور کو برصغیر کے نمایاں علمی مراکز میں شامل کر دیا۔ اس تبدیلی نے ادب میں نئے رجحانات کو جنم دیا جو بعد میں اردو ادب کی ترقی میں بنیادی ستون ثابت ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور کی ادبی صورتحال میں نمایاں تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ یہ شہر جو پہلے ہی برصغیر کے ادبی، ثقافتی اور فکری حلقوں میں نمایاں مقام رکھتا تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد مزید اہمیت اختیار کر گیا۔ تقسیمِ ہند کے المیے، ہجرت کے اثرات، نو آزاد قوم کی تعمیر اور بدلتے سماجی و سیاسی رجحانات نے لاہور کی ادبی فضا پر گہرے اثرات مرتب کیے۔

قیام پاکستان کے بعد سب سے زیادہ نمایاں تبدیلی ادب میں ہجرت اور تقسیم کے کرب کی عکاسی تھی۔ کئی اہم ادیب اور شاعر جیسے سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اور احمد ندیم قاسمی نے تقسیم کے موضوع پر شاہکار تخلیقات پیش کیں۔ منٹو کی کہانیاں جیسے ٹوبہ ٹیک سنگھ، کھول دو اور ٹھنڈا گوشت تقسیم کے انسانیت سوز پہلوؤں کی بھرپور عکاسی کرتی ہیں۔ لاہور اس وقت ادبی سرگرمیوں کا مرکز تھا اور یہاں کئی اہم ادبی جرائد شائع ہو رہے تھے جو تقسیم کے تجربے کو قلم بند کر رہے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں ادب کے نئے رجحانات نے جنم لیا، جن میں ترقی پسند تحریک، حلقۂ اربابِ ذوق، اور جدیدیت جیسے رجحانات نمایاں تھے۔ ترقی پسند تحریک تقسیم سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی مگر قیام پاکستان کے بعد اسے نئے چیلنجز کا سامنا کرنا پڑا۔ ترقی پسند ادیبوں نے سماجی ناہمواریوں، طبقاتی فرق اور مظلوم طبقے کے حقوق کے حق میں لکھا۔ فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، اور ساحر لدھیانوی جیسے شعرا اس تحریک سے وابستہ رہے۔ حلقۂ اربابِ ذوق نے ادب کو کسی مخصوص نظریے کی بجائے فن کی خوبصورتی اور فنی اظہار کی آزادی پر زور دیا۔ لاہور اس تحریک کا مرکز تھا۔ ن م راشد، میرا جی، اور غلام عباس جیسے ادیب اس سے جڑے تھے۔ ۱۹۵۰ء کی دہائی کے بعد جدیدیت کا رجحان ابھرنے لگا۔ اس تحریک میں علامتی اور تجریدی

انداز کو اپنایا گیا۔ ن م راشد کی نظموں، انتظار حسین کی کہانیوں اور انیس ناگی کے ناولوں میں جدیدیت کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں کئی ادبی رسائل اور جرائد نے علمی و فکری سرگرمیوں کو فروغ دیا۔ "ادب لطیف"، "سویرا" اور "فنون" جیسے رسائل نے نئے لکھنے والوں کو پلیٹ فارم مہیا کیا۔ احمد ندیم قاسمی نے فنون کی ادارت سنبھالی اور اسے پاکستان کے اہم ترین ادبی جرائد میں شامل کیا۔

لاہور جو پہلے ہی علم وادب کا مرکز تھا قیام پاکستان کے بعد اس کی اہمیت یوں بھی بڑھ گئی کہ دیگر علمی وادبی مراکز دہلی وغیرہ دوسرے حصہ میں تھے۔ یوں ادب کے فروغ میں یہاں کی سابقہ روایت ایک بار پھر تیز ہوئی۔ ادیبوں اور شعرا نے لاہور کارخ کیا۔ یہاں کی ادبی فضا میں کئی رسائل شائع ہونا شروع ہوئے۔ اس کے علاوہ کتب کی طباعت واشاعت کے لیے ادارے قائم ہونا شروع ہوئے اور روزبروز ترقی کرتے گئے۔

قیام پاکستان کے بعد شاعری میں موضوعاتی اور اسلوبیاتی سطح پر نمایاں تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ غزل میں روایتی رنگ کے ساتھ ساتھ جدید مسائل اور حساسیت کا اضافہ ہوا۔ نظم میں فیض احمد فیض، ن م راشد اور میراجی نے جدید طرز اختیار کیا۔ حب الوطنی اور قومی یکجہتی کے موضوعات بھی شاعری میں نمایاں ہونے لگے۔ ادب میں جدید مسائل کا ذکر بھی نظر آنے لگا۔ حبیب جالب کی انقلابی شاعری ایک بڑا حوالہ ہے۔ ڈاکٹر طاہر طیب "لاہور میں اردو افسانے کی روایت" میں لاہور کا بطور ادبی دبستان جائزہ پیش کرتے روایتی رنگ اور جدت پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دبستان لاہور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس نے روایت سے انحراف نہیں کیا لیکن اس کی اندھی تقلید بھی نہیں کی بلکہ پورے تاریخی شعور کے ساتھ روایت کو پرکھتے ہوئے جدت کو فروغ دیا۔ دبستانِ لاہور شاعری میں نظم وغزل دونوں کو فروغ دیا۔ مگر نظم کو مرکزی حیثیت حاصل رہی۔ اس مکتبہ فکر کے تخلیق کاروں نے علامت سازی میں روایتی استعاروں کو معنویت دی۔ دبستانِ لاہور کا جدید شعری رویوں اور افکار کو ساتھ لے کر چلنا اس کا طرہء امتیاز ہے۔ (۵۲)

قیام پاکستان کے بعد افسانے اور ناول میں بھی مختلف تجربات دیکھنے کو ملے۔ منٹو نے تقسیم کے موضوع پر حقیقت پسندانہ کہانیاں لکھیں۔ اشفاق احمد نے صوفیانہ اور تمثیلی کہانیوں کی طرف رجحان

بڑھایا۔ بانو قدسیہ اور قدرت اللہ شہاب نے پاکستانی معاشرے کی نفسیات اور اقدار کو اجاگر کیا۔ عبد اللہ حسین کا ناول اداس نسلیں پاکستانی ادب کا ایک اہم سنگ میل ثابت ہوا۔

لاہور میں کئی ادبی و ثقافتی ادارے قائم ہوئے جن میں پاکستان رائٹرز گلڈ، ادارہ فروغِ قومی زبان، الحمرا آرٹس کونسل شامل ہیں۔ مختلف ادبی پلیٹ فارم نے نہ صرف ادیبوں اور شاعری کو اکٹھا کیا بلکہ اس دور کے اسلوب اور موضوعات کو متعارف اور مقبول کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انہی اداروں کی بدولت مختلف ادبی کانفرنسوں اور مباحثوں کا انعقاد ہوا جس سے ادبی فضا ثروت مند ہوئی۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور کی ادبی صورتحال میں ایک زبردست ارتقا دیکھنے کو ملا۔ تقسیم کے اثرات، ہجرت کا کرب، نئے نظریات کا فروغ، اور جدید ادبی رجحانات نے ادب کو ایک نیا رخ دیا۔ لاہور آج بھی پاکستان کا ادبی اور ثقافتی مرکز ہے۔ جہاں ادبی سرگرمیاں نہ صرف جاری ہیں بلکہ بدلتے وقت کے ساتھ مزید وسعت اختیار کر رہی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ خاور جمیل (مرتب)، ادب، کلچر اور مسائل (ڈاکٹر جمیل جالبی کے ۵۶ تنقیدی و فکری مضامین)، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۶ء، ص ۳۸۲

۲۔ شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر / لالہ رام پرساد، تاریخ ہند، ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور ۱۹۱۳ء، ص ۶۴

۳۔ نور احمد چشتی، تحقیقات چشتی، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۶۸

۴۔ شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر / لالہ رام پرساد، تاریخ ہند، ص ۷۱

۵۔ ماسٹر امر ناتھ، لاہور کی سیر، انقلاب پریس، لاہور، ۱۹۲۸ء، ص ۲۱

۶۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۸

۷۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ تک)، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۰

۸۔ محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ (جلد اول)، مترجمہ عبدالحی خواجہ، مکتبہ ملت دیوبند، ۱۹۸۳ء، ص ۲۴۰

۹۔ نقوش، لاہور نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۴۲

۱۰۔ سید محمد لطیف، تاریخ پنجاب، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۴ء، ص ۲۵۵

۱۱۔ سید محمد لطیف، تاریخ لاہور، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۲۸

۱۲۔ شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر / لالہ رام پرساد، تاریخ ہند، ص ۱۰۲

۱۳۔ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۴

۱۴۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ظفر برادرس تاجران کتب، لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۴

۱۵۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ص ۵۳

۱۶۔ شیخ عزت اللہ، ہمارا پنجاب، فرینڈز لائبریری، لاہور، ۱۹۴۱ء، ص ۱۷

۱۷۔ بزم اردو (مرتب)، لاہور گائیڈ، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۹ء، ص ۷

۱۸۔ گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص۲۰

۱۹۔ طاہر طیب، ڈاکٹر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء، ص۲۳

۲۰۔ کنہیالال ہندی، تاریخ لاہور، (مرتب) کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص۶۰

۲۱۔ محمد خلیل اللہ، تحریک پاکستان، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی، ۱۹۸۲ء، ص۴۴۹

۲۲۔ ایس ایم ناز، ڈاکٹر، لاہور نامہ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۵۲-۵۳

۲۳۔ شری پرکاش، پاکستان اس کا قیام اور ابتدائی حالات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۸ء، ص۳۱

۲۴۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان: تاریخ وسیاست (۸۸ء- ۱۹۴۷ء)، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰، ص۱۳۷

۲۵۔ حمیرا ماجد، بیسویں صدی کے لاہور کا ادبی ماحول، مقالہ جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص۲۰۰

۲۶۔ محمد حفیظ الرحمن، ڈاکٹر، تصوف اور صوفیا کی تاریخ (عرب سے ہندوستان تک)، شاکر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۵۵

۲۷۔ علی محمد خان،، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، ص۴

۲۸۔ محمد زمان چیمہ، پنجاب: تہذیبی و ثقافتی اور اسلامی پس منظر کی روشنی میں، (مشمولہ) اورینٹل کالج میگزین، والیم ۸۴، پرچہ ۳، ۲۰۰۹ء، ص۲۳۱

۲۹۔ غافر شہزاد، لاہور کے مینار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص۱۳۔۱۴

۳۰۔ محمد عبداللہ چغتائی، ڈاکٹر، مساجد لاہور، کتاب خانہ نورس، لاہور، ۱۹۷۶، ص۱۳

۳۱۔ عبدالحمید شیخ، قصے لاہور کے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ۳۲

۳۲۔ نقوش، لاہور نمبر، ص۶۱

۳۳۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ص۱۳

۳۴۔ غافر شہزاد، لاہور کے مینار، ص۳۱

۳۵۔ جی سی واکر، لاہور، مترجمہ یاسر جواد، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص۳۶۱

۳۶۔ ایل لاک ھارٹ، نادر شاہ، مترجمہ طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء، ص۱۷۴

۳۷۔ بزم اردو (مرتب)، لاہور گائیڈ، ص۷

۳۸۔ کنہیالال ہندی، تاریخ لاہور، ص۵۹

۳۹۔ "نقوش"، لاہور نمبر، ص۳۸

۴۰۔ محمد زمان چیمہ، پنجاب: تہذیبی و ثقافتی اور اسلامی پس منظر کی روشنی میں، ص۲۳۶

۴۱۔ محمد حفیظ الرحمن، ڈاکٹر، تصوف اور صوفیا کی تاریخ (عرب سے ہندوستان تک)، ص۴۴

۴۲۔ سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص۱۸۳

۴۳۔ ایضاً، ص۱۸۳

۴۴۔ ایضاً، ص۲۹۵

۴۵۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ص۳۵

۴۶۔ محمد نوشاد عالم، ڈاکٹر، اردو خود نوشت سوانح حیات: آزادی کے بعد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۱، ص۲۱

۴۷۔ کنہیالال ہندی، تاریخ لاہور، ص۶۳

۴۸۔ ممتاز اختر مرزا، پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۸، ص۵۰

۴۹۔ کنہیالال ہندی، تاریخ لاہور، ص۶۴

۵۰۔ انور سدید، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمٹیڈ، دہلی، ۲۰۱۴ء، ص۳۱۴

۵۱۔ کنول دھیر، ڈاکٹر، میں لاہور ہوں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۲۰ء، ص۲۰۴

۵۲۔ طاہر طیب، ڈاکٹر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، ص۵۷

باب دوم

لاہور کی سیاسی سماجی صورتحال: اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں

الف۔ قیام پاکستان سے قبل کی آپ بیتیاں اور یادداشتیں

لاہور صدیوں سے سیاسی و سماجی مرکز کی حیثیت اختیار کیے ہوئے ہے۔ یہ شہر جب آباد ہوا اس وقت سے لے کر موجود عہد تک پہنچتے پہنچتے اس نے سیاسی و سماجی حوالے سے بہت نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ لاہور اگرچہ شروع سے ہی برصغیر میں اہمیت کا حامل رہا ہے۔ غزنوی دور میں ثانویہ پایہ تخت رہا اور اس کی اہمیت بڑھی تاہم اس شہر کو اصل عروج مغلوں کے عہد میں نصیب ہوا۔ مغلوں نے اس شہر کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے یہاں سماجی اور سیاسی حوالے سے استحکام قائم کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں کیں۔ اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو موجودہ لاہور کی شان وشوکت اور عظمت کو چار چاند لگانے والی تاریخی عمارات، باغات اور دیگر بہت سی چیزیں مغلوں ہی کی عنایت کردہ ہیں۔ مغل اس شہر کے رمز شناس تھے۔ ہندوستان پر حکومت سنبھالتے ہی دیگر شہروں کے ساتھ ساتھ انہوں نے لاہور کی تعمیر و ترقی اور اس کو عروج کی طرف لے جانے کے لیے ایسے اقدامات کیے جو آج بھی لاہور کی شان قرار دیے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں محمد دین فوق لکھتے ہیں:

> مغلوں کی سلطنت ہندوستان میں کیا قائم ہوئی کہ دہلی، آگرہ وغیرہ مقامات کے ساتھ ہی لاہور کا ستارۂ عروج واقبال بھی چمک اٹھا۔ بابر کے جانشینوں کے عہد میں لاہور نے وہ رونق حاصل کی کہ اس کی آبادی اس زمانہ کے مؤرخین کے قول کے مطابق نو سے بارہ میل کے اندر تھی۔(۱)

لاہور تاریخی شہر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر سیاسی و سماجی حوالے سے کئی اسرار چھپائے ہوئے ہے۔ قدامت کے حوالے سے دیکھا جائے تو یہ شہر برصغیر کے دیگر بہت سے شہروں

سے نہ صرف قدیم شہر ہے بلکہ بیرونی حملہ آوروں کا نشانہ بھی خوب بنتا آیا ہے جس کی وجہ سے یہ مختلف ادوار میں سماجی حوالے سے انتشار کا شکار بھی رہا ہے ۔ تاہم تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کو شروع ہی سے وہ سماجی مرتبہ حاصل تھا جو بہت کم خطوں کو نصیب ہوتا ہے ۔ اس کا ایک ثبوت آئین اکبری میں ملتا ہے۔ ابوالفضل ، آئین اکبری میں اس شہر کی قدامت کے ساتھ ساتھ اس کی خوش نمائی، دلربائی اور سماجی اہمیت کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں :

> جہاں پناہ کے عہد معدلت میں لاہور میں پختہ قلعے اور فصیل تعمیر کیے گئے ہیں چونکہ چند مرتبہ یہ شہر ہندوستان کا پائے تخت بھی رہا ہے اس لئے یہاں بے شمار بلند اور عمدہ محل و مکانات و دلکشا باغات پائے جاتے ہیں۔اس شہر میں ہر قسم کے باشندے پائے جاتے ہیں اور طرح طرح کی ہنر مندی دکھاتے ہیں غرضیکہ آبادی و وسعت کے لحاظ سے اس شہر کی خوبیوں کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ (۲)

لاہور کو حقیقی معنوں میں لاہور بنانے کا سہرا اکبر کے سر ہی ہے۔ اکبر نے اس شہر کی تزئین و آرائش اور اس کی شان و شوکت بحال کرنے کے بعد اسے اپنے دارالخلافہ کا مقام بھی دیا۔ اسی عہد میں اس شہر نے تیز ترین ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں ۔ اس ضمن میں ایک شہادت "لاہور ، گھر، گلیاں، دروازے" کے مصنف غافر شہزاد کے اس بیان سے بھی ملتی ہے۔ وہ اکبر کی لاہور سے دلی محبت اور لگاؤ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> اکبر بادشاہ نے جب لاہور کو (۹۸-۱۵۵۴) اپنا دارالخلافہ بنایا تو جس شہر میں بابر نے داخل ہونا بھی پسند نہ کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے اس شہر نے ایک عظیم الشان تاریخی شہر کا روپ دھار لیا۔ (۳)

لاہور کے سماجی عروج کا جائزہ لیا جائے تو اس شہر کو اکبر بادشاہ کے دور میں جو سماجی اور سیاسی عروج حاصل ہوا، اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ اکبر وہ بادشاہ تھا جس نے اس شہر کو پایہ تخت کی سی حیثیت دے رکھی تھی۔ ایک طرف وہ خود عجیب و غریب طبیعت کا مالک تھا تو دوسری طرف اس شہر

نے اس کو خوب لبھایا ۔ گویا اکبر اور لاہور ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہو کر رہ گئے ۔ اکبر نے اس شہر سے خوب وفا کی اور اس کی تعمیر وترقی کے ساتھ ساتھ یہاں ایسے ایسے کام کروائے، جنھوں نے اس شہر کے سماجی منظر نامے میں خاصی تبدیلی پیدا کی ۔ اکبر کے دل میں اس شہر کی اہمیت دفاعی لحاظ سے بھی بہت تھی ۔ یہاں تک کہ یہی وہ شہر تھا جہاں سے اکبر نے کشمیر پر بھی چڑھائی کی تھی ۔ محمد دین فوق اکبر کے عہد میں لاہور کی سماجی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے اپنی کتاب " لاہور عہد مغلیہ میں " میں لکھتے ہیں:

> اکبر کے زمانے میں لاہور کو وہ عروج حاصل ہوا کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ شہنشاہ جو عجیب وغریب طبیعت لے کر آیا تھا، جر ثقیل اور طبیعات کے عمل کرتا۔ علم ہئیت کے آلات رکھتا۔ علم کیمیا کے شعبدے دیکھتا اور خود دکھاتا۔ آگرہ کی طرح لاہور میں بھی آتش کدے تعمیر کرائے۔ نوروز کی صبح کو کھلے بندوں سورج کی پرستش کرتا۔ برہمن اپنے مذہبی تہواروں میں اس کی پیشانی پر ٹیکہ لگاتے تھے علمی مجلسوں کی رونق اس زمانہ میں لاہور کی علمی زندگی کی روح تھی۔ شہنشاہ بڑے بڑے علما وفضلا اور پنڈتوں کے مباحثے گرم کراتا تھا۔ اکبر کے طویل قیام کی وجہ سے لاہور کے باہر ایک اور لاہور تیار ہورہا تھا۔ جسے بیرون شہر کی آبادی کہتے تھے ۔ شاہجان کے زمانہ تک بیرون لاہور کی آبادی اندرون شہر سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔(۴)

محمد دین فوق کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کی عظمت کا ستارہ اکبر بادشاہ کے دور میں بلند ہونا شروع ہوا اور پھر اس کے بعد یہ شہر ترقی کی منازل طے کرتا چلا گیا۔ اکبر جس طبیعت اور جس مزاج کا آدمی تھا، اس نے یہاں کے سماجی منظر نامے کو خاصا متاثر کیا۔ اس کے دور میں ہی یہاں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی سماجی رسومات کے ذریعے لاہور کے سماجی منظر نامے میں وسعت پیدا ہوئی۔

شاہجہاں تک پہنچتے پہنچتے لاہور نے صرف جغرافیائی طور پر خاصی وسعت اختیار کر لی تھی، بلکہ یہاں آباد ہونے والی مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کی وجہ سے اس شہر کا سماج بھی ایک ایسے مشترکہ سماج میں ڈھل رہا تھا، جسے کسی ایک خاص مذہب یا کسی خاص قوم سے منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مشترکہ سماج آگے چل کر لاہور کی پہچان بنتا چلا گیا جس کا ذکر مختلف مؤرخین اور آپ بیتی نگاروں نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے۔

اکبر کے بعد بھی اگرچہ لاہور سماجی حوالے سے ترقی کی منازل طے کیں لیکن رفتہ رفتہ اس شہر کی رعنائی مانند پڑتی چلی گئی۔ اس کا ثبوت ہم دو مشہور سیاحوں کی لاہور کی سیاحت کے بعد دیے گئے بیانات سے لیتے ہیں کہ اکبر کے عہد اور بعد کے لاہور میں کیا فرق تھا۔ پہلا بیان سینٹ تھامس کا ہے جس نے اکبر کے عہد میں ۱۵۹۵ء میں لاہور کی سیاحت کی۔ وہ اپنے تاثرات میں لکھتا ہے:

> عظیم اور مشہور شہر لاہور کا مقابلہ آگرہ کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ آٹھ مہینے ہوا خالص اور تنفس بحال رکھتی ہے۔ گلیاں خوب صورت اور پختہ ہیں اور زیادہ تر صاف ستھری ہیں اور دریائے راوی کا پانی ان تک پہنچتا ہے جو پنجاب اور کشمیر کی پہاڑیوں سے نکل کر شہرت کے قریب سے گزرتا ہے۔(۵)

وقت گزرتا چلا گیا اور جون ۱۸۳۱ء میں الیگزینڈر برنیز لاہور کی سیاحت پر آتا ہے۔ وہ اپنے تاثرات میں اس شہر کے بارے میں لکھتا ہے:

> گھر بہت بلند ہیں اور گلیاں بہت تنگ اور گندگی سے بھری ہوئی ہیں۔ نالی گلی کے درمیان بہتی ہے اور لاہور کے بازار دیکھنے میں کچھ زیادہ شاہانہ نہیں ہیں۔(۶)

یہ وہ واضح فرق ہے جو عہدِ اکبر کے لاہور اور مغلیہ عہد کے بعد کے لاہور میں پایا جاتا ہے۔ اس سماجی فرق کی بڑی وجہ کچھ اہلِ لاہور کے رویے اور کچھ بیرونی حملہ آوروں کی یلغاریں ہیں جنھوں

نے اس شہر کا حلیہ بدل کر رکھ دیا۔ رنجیت سنگھ اور دیگر سکھوں کا عہد لاہور کے حسن کو ملیا میٹ کر دینے والا عہد تھا۔ اس عہد میں لاہور نے سماجی حوالے سے بھی کوئی خاص ترقی نہیں کی۔

۱۸۴۹ء میں انگریزوں نے لاہور پر قبضہ کیا۔ ان کے عہد میں بھی لاہور کی سماجی حالت قدرے بہتر ہوئی تاہم اس عہد کی جو تصاویر مختلف سیاحوں اور مصوروں نے بنائی ہیں ان کا جائزہ لینے سے انگریزی عہد کے لاہور کی معاشرت سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ غافر شہزاد ان تصاویر سے سامنے آنے والے لاہور کے سماجی منظر نامہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ان تصاویر کو اگر غور سے دیکھا جائے اور شہر لاہور کی سکھ یا انگریزی عہد کی معاشرتی زندگی اور گلیوں کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو کئی باتیں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اس وقت لوگ زیادہ تر پیدل سفر کرتے تھے، تاہم گھوڑے، ہاتھی اور اونٹ کی سواری عام تھی۔ کہیں کہیں ہمیں پالکی یا بگھی کی سواری بھی نظر آتی ہے۔ مویشی، بھینسیں، بچھڑے، بیل اور بکریاں گلیوں میں چلتے پھرتے یا بیٹھے نظر آتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ شہر سے باہر راوی کے کنارے مختلف سرگرمیاں دکھائی گئی ہیں۔ لوگ گلیوں میں کھڑے یا گھروں کے باہر گپ شپ میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ کئی کئی منزلہ رہائشی عمارات نے گلیوں کو گھیرا ہوا ہے اور کہیں ان کے پیچھے آسمان دکھائی دیتا ہے۔ گلیوں میں جھروکے اور بالکونیاں اور ان میں بیٹھی ہوئی عورتیں ہیں۔(۷)

لاہور کے سماجی منظر نامے کی یہ ایک ایسی جھلک ہے جو ہمیں سکھوں کے عہد اور انگریزوں کے عہد کے لاہور سے آشنا کرواتی ہے۔ اس عہد میں لاہور کو سماجی حوالے سے بہتر بنانے اور اس شہر کے شایانِ شان اقدامات کرنے کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی بلکہ اسے زیادہ تر اپنے مقاصد کے لیے

ہی استعمال کیا گیا۔ تاہم انگریزوں کے عہد میں خاص طور پر انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی میں یہ شہر ایک بار پھر سیاسی اور سماجی منظر نامے پر پوری آب و تاب سے ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ مشترکہ سماجی نظام اور سیاسی سرگرمیوں نے اس شہر کو برصغیر کے ان نمایاں شہروں میں شامل کر دیا تھا جو سماجی اور سیاسی حوالوں سے اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ قیام پاکستان سے قبل اس شہر کے سماج کا جو سب سے مضبوط عنصر تھا وہ مشترکہ سماجی منظر نامہ تھا جس میں مسلمان، سکھ اور ہندو مشترکہ سماجی عناصر کے طور پر رہتے تھے اور ایک دوسرے سے سماجی روابط قائم رکھے ہوئے تھے۔ غافر شہزاد استعماریت کے عہد میں لاہور شہر کے اس سماجی منظر نامے کو یوں بیان کرتے ہیں:

> شہر میں پاکستان بننے سے پہلے تک ہندو، سکھ اور مسلمان تین مذاہب کے لوگ اپنے اپنے مذہبی عقائد کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان کی معاشرتی، مذہبی اور نجی زندگی کے بے شمار تہوار، رسومات اور تقریبات کا سلسلہ سارا سال چلتا تھا۔ ایک دوسرے کے مذہبی تہواروں میں بھی پرجوش شرکت تھے مگر ایسا بہت کم ہوتا کہ کوئی مذہبی ٹولہ کسی مسئلے کو بنیاد بنا کر کوئی بدمزگی پیدا کرتا۔ عیدیں، میلے، شب برات، بسنت، ہولی، دسہرہ کے تمام تہوار جوش و جذبے سے منائے جاتے۔ بسنتی چولے پہنے ہندو لڑکیاں چھتوں پر بسنتی رنگوں کی بہار لے آتیں۔ ہولی کے تہوار میں گھر، گلیاں اور لوگ منقش ہو جاتے۔ گرمیوں میں بارش لانے کے لیے مختلف ٹونے ٹوٹکے آزمائے جاتے۔ اندرون لاہور کی سماجی زندگی کی رنگا رنگی کا یہ عالم تھا کہ یہ بات مشہور ہو گئی۔ ست دن تے اٹھ میلے۔۔۔ کم کراں میں کیہڑے ویلے (۸)

قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کا سماجی منظر نامہ خاصی انفرادیت لیے ہوئے تھا۔ جدید عہد کی تیز ترین مشینی زندگی کی بجائے سادہ اور خلوص والی زندگی تھی۔ اس سماج میں تھڑا ایک ایسی جگہ ہوتی

تھی جو سماجی ، تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے اپنا ایک خاص مقام رکھتی تھی ۔ یونس ادیب اپنی کتاب " میرا شہر لاہور " میں اس سماجی عنصر کی افادیت اور اس پر پائی جانے والی سماجی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں :

گھروں کی بیٹھکیں صرف مہمانوں اور تقریبات کے لیے مخصوص تھیں اوراوپن یونیورسٹی اگر تھی تو اندرون شہر کی دکانوں کے تھڑے اور حمام تھے ۔ اندرونِ شہر میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی پہلی درس گاہ تھڑا تھی ۔ شامیں سردیوں کی ہوں یا گرمیوں کی گلی اور محلے کے بچے شامیں تھڑوں پر گزارتے ۔ گلی محلے کے تھڑے معلومات اور خبروں کے تبادلے کا اہم ترین مرکز تھے ۔ یہاں ہر قسم کی بات چیت ہوتی اوراندرونِ شہر کی ٹھہری ٹھہری سی مجلسی زندگی میں تھڑوں کا کردار بڑا تیز رفتار تھا ۔طلاقوں ، شادیوں ، چوریوں ، تانک جھانک ، اتار چڑھاؤ، جھگڑے اور مسئلے مسائل تھڑوں پر ہی زیر بحث آتے۔ تھڑا مجلس کا دائرہ کار پورے شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ (۹)

موجودہ عہد تک پہنچتے پہنچتے لاہور نے سیاسی وسماجی حوالے سے کئی منازل طے کی ہیں۔جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر سماجی اور سیاسی حوالے سے خاصے تغیرات کا سامنا کرتا رہاہے ۔ یہ تغیرات اس کے سماجی اور سیاسی منظر نامے میں نشیب وفراز کی صورت میں سامنے آتے رہے ہیں۔ غافر شہزاد موجودہ عہد کے لاہور کی ایک جھلک دکھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

آج اندرون شہر کی گلیوں کا منظرنامہ ان (ماضی کی) تمام سرگرمیوں سے تہی ہوگیا ہے ۔ گلیاں ،بازاروں میں تبدیل ہوگئی ہیں ۔ جگہ جگہ میوزک سنٹر اور ویڈیو سنٹر کھل گئے ہیں ۔ لوگ ساراسارا دن اپنے گھروں میں دبکے رہتے ہیں یا پھر اپنے کاروبار میں جتے رہتے ہیں۔ تھڑا

> کلچر دم توڑ رہا ہے ۔ نئی نئی عمارتوں نے شہر قدیم سے اس کی روایتی
> جمالیات کا منظر نامہ چھین لیا ہے ۔ گلیوں کے اندر بھاگتی گاڑیوں اور
> موٹر سائیکلوں کے شور اور دھویں نے گلیوں میں جنم لینے والی
> سرگرمیوں کو یکسر بدل دیا ہے ۔(۱۰)

اردو میں آپ بیتی کا سفر خاصا طویل ہے ۔ قیام پاکستان سے قبل سے لے کر عصرِ حاضر تک یہ سفر جاری ہے ۔ آج بھی آپ بیتیاں اور یادداشتیں قلم بند کی جا رہی ہیں، جن میں مصنف اپنے حالاتِ زندگی بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے مختلف سیاسی و سماجی تناظرات کو بھی سامنے لاتا ہے ۔ آپ بیتی نگار نے ایک عہد میں زندگی گزاری ہوتی ہے ۔ اس عہد کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی حالات اس کی شخصیت کو نہ صرف متاثر کرتے ہیں بلکہ اس کے تخلیقی تجربے کا حصہ بن کر قرطاس کی زینت بھی بنتے چلے جاتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا جائزہ لینے کے لیے اس عہد میں لکھی گئی آپ بیتیاں اہم ماخذ کا درجہ رکھتی ہیں ۔

لاہور کے حوالے سے دیکھا جائے تو ایک قدیم شہر ہونے کی وجہ سے یہ شہر عرصہ دراز سے سیاسی و سماجی حوالے سے اہم رہا ہے ۔ موجودہ عہد میں تو اس کی سیاسی حیثیت اور بھی بڑھ گئی ہے ، تاہم اگر ہم ماضی کا جائزہ لیں تو ماضی میں بھی لاہور کا سیاسی و سماجی منظر نامہ نہ صرف تغیر پذیر رہا ہے بلکہ مختلف ادوار میں اس منظر نامے میں خاصی تبدیلیاں بھی واقع ہوتی رہی ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ اس شہر کا تذکرہ جن آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے اپنی تخلیقات میں کیا ہے ، انہوں نے اس کے سیاسی و سماجی منظر نامے کو بھی خاص اہمیت دی ہے ۔ اس ضمن میں اردو آپ بیتی میں وسیع سرمایہ موجود ہے جو لاہور کی تاریخ ، اس شہر کے سماج اور اس شہر میں سیاست کے اتار چڑھاؤ سے آگاہی دلاتا ہے ۔

لاہور کی سیاسی و سماجی صورت حال میں ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کے حوالے سے ہمارے سامنے آپ بیتیوں کے مختلف زاویے آتے ہیں ۔ ایک زاویہ قیام پاکستان سے قبل کے سیاسی و سماجی منظر نامے کا ہے ۔ قیام پاکستان سے قبل چوں کہ ایک مشترکہ سماجی منظر نامہ تشکیل پا چکا تھا جس

میں مختلف مذاہب کے لوگ کسی خاص مذہبی سماجی نظریے کے بغیر مشترکہ زندگی گزار رہے تھے۔ سماج کی سطح پر ان میں بھائی چارہ اور آپس کے تعلقات خاصے مضبوط تھے۔ اس کے علاوہ سیاسی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو مختلف ادوار میں مختلف ایسے حکمران آئے جنھوں نے پورے ہندوستان کو اپنا مطیع بنایا۔ قیام پاکستان سے قریباً ایک صدی قبل ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح یہ شہر بھی استعماریت کے قبضے میں رہا یوں اس دور کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ ، قیام پاکستان کے بعد کے منظر نامے سے خاصا مختلف بھی تھا۔

لاہور کا سیاسی اور سماجی منظر نامہ ہر دور میں تغیر پذیر رہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ اس شہر کی قدامت اور سیاسی و سماجی حوالے سے مرکزیت ہے۔ مختلف ادوار میں یہ شہر سیاست اور سماج و تہذیب کا مرکز رہا ہے۔ سماجی سطح پر دیکھا جائے تو مختلف اولیاء کرام نے عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے وعظ و نصیحت عوام تک پہنچانے کے لیے بھی اس شہر کا انتخاب کیا۔ دوسری طرف اس شہر کی سیاسی و سماجی مرکزیت کی وجہ سے دیگر شعبہ جات کے لوگ بھی اس شہر کا رخ کرتے رہے اور اس کو اپنا مسکن بناتے رہے۔ قیام پاکستان سے قبل یہ شہر مختلف مذاہب اور اقوام کا گہوارہ قرار دیا جاتا تھا۔ یوں اس شہر کا سیاسی و سماجی منظر نامہ تاریخ میں اہم مقام حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔

اس شہر میں بسنے والے لوگوں میں ایسے لوگ بھی تھے جو ادب اور سیاست سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ ان لوگوں نے اس شہر میں زندگی کا ایک حصہ گزارا تھا اور اس شہر کے سیاسی و سماجی منظر نامے سے متاثر ہونے کے ساتھ ساتھ اس منظر نامے کی تشکیل میں کسی نہ کسی حوالے حصہ دار بھی رہے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور خیالات و افکار کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بناتے ہوئے آپ بیتی کی صورت میں پیش کیا جس کی وجہ سے اس شہر کا سیاسی و سماجی منظر نامہ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں محفوظ ہوتا چلا گیا۔

آپ بیتی اور یادداشتیں کسی بھی شخص کی زندگی کے تجربات اور حالات پر مبنی کتھائیں ہوتی ہیں۔ ان کو کسی صورت بھی نہ تو تاریخ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ہی ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان

میں بیان کیے گئے واقعات اور حالات تاریخی تناظر میں بیان کیے گئے ہوں۔ ممکن ہے ایک آپ بیتی نگار نے حالات سے جس طرح اثر قبول کیا ہو، دوسرا آپ بیتی نگار یا یادداشت نگار اس قدر متاثر نہ ہوا ہو، اس لیے آپ بیتی اور یادداشت کو تاریخ کی بجائے ادبی تخلیق کے تناظر میں دیکھنا سود مند ہو سکتا ہے اور اسی صورت میں ہی موضوع سے متعلقہ حقائق تک رسائی حاصل کرتے ہوئے درست نتائج سامنے لائے جاسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ آپ بیتی ہمیشہ ماضی کے صیغہ میں لکھی جاتی ہے۔ آپ بیتی اور یادداشت ماضی میں گزرے ہوئے حالات وواقعات اپنے تخلیقی تجربے میں ڈھال کر قارئین کے سامنے پیش کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ بیتی عموماً اس وقت لکھی جاتی ہے جب زندگی اپنے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہو۔ تاکہ ایک طرف پوری زندگی کی عکاسی قارئین کے سامنے ہو سکے تو دوسری طرف اس عمر میں وہ پختگی بھی آچکی ہوتی ہے، جو حالات کا تجزیہ کرنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے آپ بیتی نگار آپ بیتی میں جو حالات و واقعات بیان کرتا ہے حال سے زیادہ ماضی سے تعلق رکھتے ہیں۔ کسی بھی آپ بیتی کا مطالعہ کرتے ہوئے اس سے کسی خطے کے موجودہ حالات وواقعات کا کھوج لگانا بعض اوقات سعی لاحاصل قرارپاتاہے ، جب کہ ماضی کے حالات کا کھوج آپ بیتیوں اوریادداشتوں سے آسانی سے لگایاجاسکتاہے۔ اس تناظر میں دیکھاجائے تو لاہور کی موجودہ سیاست اور سماج کا نقشہ ان آپ بیتیوں میں نہ ہونے کے برابر ملتاہے جب کہ وہ لاہور جو تقسیم سے قبل تھااور تقسیم کے بعد موجود رہااس کے سماجی اور سیاسی عناصر ان آپ بیتیوں میں بڑے جاندار انداز میں ظاہر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ خاص طور پر تقسیم سے قبل کا مشترکہ سماجی منظرنامہ اور بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے لے کر آٹھویں دہائی تک کی سیاست اردو آپ بیتیوں میں زیادہ نمایاں انداز میں سامنے آئی ہے۔

ب ۔ قیام پاکستان کے بعد ادبی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی تاریخی ادوار میں بدلتی صورتحال

لاہور کا شہر سماجی حوالے سے ہر دور میں اہم رہا ہے۔ اس کی وجوہات کا جائزہ لیا جائے تو اس شہر کی قدامت کے ساتھ ساتھ ملکی سیاست اور دیگر امور میں اس شہر کا گہرا عمل دخل ملتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی اعتبار سے اس شہر کی اپنی ایک پہچان ہے، جو اسے سماجی حوالے سے بھی معتبر بناتی ہے۔ ہندوستان پر حکومت کرنے والی ہر قوم اور ہر حکمران سے اس شہر پر خاص توجہ دی اور اس کی اہمیت کو ملحوظ خاطر رکھا۔ مغلیہ عہد میں تو یہ شہر چہار دانگِ عالم میں اپنی ایک خاص اہمیت لے کر ابھرا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہی اس شہر کو وہ اہمیت اور مقبولیت حاصل ہوگئی کہ یہ داستانوی روپ اختیار کرتا چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں بسنے والی مختلف اقوام کے باہمی میل جول سے ایک ایسا سماج تشکیل پایا جو خاصا بارونق ہے ۔ اس کی رونقیں آج بھی قائم ہیں بلکہ پہلے سے بھی بڑھ کر ہیں۔

لاہور شہر کی قدامت اس کی سماجی اقدار اور سماجی روایات پر گہری طرح اثر انداز ہوئی ہے۔ قدیم شہر ہونے کی وجہ سے یہ شہر مختلف سیاسی، سماجی اور معاشی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے جس کی وجہ سے یہاں مختلف مذاہب کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ سماجی روابط بھی رکھتے تھے۔ یہ سماجی روابط دو طرح کے تھے۔ بعض سماجی روابط مذہبی تفریق پر مبنی تھے اور بعض میں یہ تفریق نہ ہونے کے برابر پائی جاتی تھی ۔ جو سماجی روابط مذہبی تفریق کے حامل تھے، وہ زیادہ مسلمان گھرانوں کی طرف سے مذہبی تفریق سے سامنے آتے تھے۔ اس شہر کے باسی بہت سے مسلمان گھرانے ایسے بھی تھے جو ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ رہنے کے باوجود ان کے ہاتھ کا پکا ہوا یا کوئی بھی ایسی چیز جس کو ان کا ہاتھ لگ جائے، اسے کھانا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ اس میں مذہب اسلام کی پاکیزگی کا بھی عمل دخل تھا کہ مذہب اسلام جس پاکیزگی کا تقاضا کرتا ہے، ہندومت اور سکھ مذہب کے پجاری اس پاکیزگی سے کسی قدر دور ہوتے تھے جس کی وجہ سے مسلمان گھرانوں کی طرف سے ایسے سماجی رویے یقیناً درست

بھی قرار پاتے ہیں۔ فرخندہ بخاری کی آپ بیتی " یہ بازی عشق کی بازی ہے " میں ایسے سماجی رویوں کی عکاسی بھرپور انداز میں ملتی ہے۔وہ لاہور کے جس محلے میں رہتی تھیں، اس محلے میں سکھ اگرچہ زیادہ تعداد میں آباد نہ تھے، تاہم جو سکھ موجود تھے، مسلمان ان کے ہاتھ سے لی ہوئی چیزوں سے کس قدر دور رہتے تھے، اس کی عکاسی وہ اپنی آپ بیتی میں یوں کرتی ہیں:

> سکھ ہمارے محلے میں زیادہ نہ تھے۔ ہماری گلی میں ایک گھر میں سکھ کنبہ تھا۔ سردار جب پگڑی باندھتا تو ہم اسے سکھ سردار کہتے مگر جب وہ نہا کر بال کھولتا تو ہم لوگ اسے سردارنی کہا کرتے۔جب بھی کوئی اچھی چیز گھر میں پکتی یا بنتی تو ہم وہ سردار کے گھر بھیج دیا کرتے، سردار لے لیا کرتا مگر وہ ہمیں کوئی چیز نہیں بھجواتے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ ہم ان کی بھیجی کوئی شے نہیں کھاتے۔ سردار کسٹمز کے محکمے میں افسر تھے اس لیے کبھی کبھار پھلوں کی پیٹی ہمارے گھر دے جاتے اور کہا کرتے کہ پیٹی بند ہے۔ میں نے ہاتھ نہیں لگایا۔(۱۱)

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کے اس سماج میں رہنے والے غیر مسلم خاص طور پر سکھ اور ہندو بھی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ مسلمان گھرانوں میں اگر کچھ دینا ہے تو اس کو اپنے ہاتھ سے دور رکھتے ہوئے دینا ہوگا۔ یہ سماجی رویہ پورے سماج میں نہیں پایا جاتا تھا بلکہ چند اعلیٰ طبقے کے گھرانوں میں اس کا رواج تھا۔دوسری طرف یہ حقیقت بھی نظر آتی ہے کہ ہندو اور مسلمان سماج میں باہمی میل جول اور بھائی چارے کے کئی خوبصورت پہلو موجود تھے۔ مسلمان گھرانے ہندو اور سکھ پڑوسیوں کا احترام کرتے اور موقع بہ موقع ان کے ساتھ خوشی و غم میں شریک ہوتے تھے۔ہندو مذہب کے ماننے والے بھی مسلمانوں کے ساتھ تجارتی اور سماجی تعلقات قائم رکھتے تھے اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹنا باعثِ سعادت سمجھتے تھے۔اس معاشرے میں ایسے افراد کی بھی کمی نہ تھی جو اپنے مذہب کے ساتھ ساتھ دوسرے مذاہب کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے اور سب کو ایک ہی دھرتی کے بیٹے سمجھتے

تھے۔ یہی وجہ تھی کہ روزمرہ زندگی میں میل جول، تعاون اور بھائی چارہ دونوں مذاہب کے ماننے والوں کو قریب لاتا اور معاشرتی ہم آہنگی کو فروغ دیتا تھا۔ اس کی ایک جھلک مرزا ادیب کی آپ بیتی میں یوں درج ہے:

> یاد کرتا ہوں اپنے بچپن کا وہ زمانہ جب میں دادی اماں کے ہاں رہتا تھا، اس دور میں لاہور کی ساری آبادی جو بیشتر ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی ہر تہوار میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتی تھی۔ محرم کے دنوں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندو بھی سبیلیں لگاتے تھے۔ جہاں سے بغیر کسی مذہبی تفاوت و امتیاز کے ہر شخص کو اول تو دودھ اور شربت، نہیں تو ٹھنڈا پانی ضرور ملتا۔(۱۲)

مذہبی بنیادوں پر سماجی سطح پر پائی جانے والی یہ تفریق نسل در نسل چلتی آئی اور آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو سماج کی اس تفریق کے بالکل برعکس سماج میں ایسے عناصر بھی پائے جاتے تھے جن کے نزدیک مذہب اور دھرم سماج روابط کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتے تھے۔ یہ لوگ مختلف مذاہب اور مختلف دھرموں سے تعلق رکھنے کے باوجود ایک دوسرے کے ساتھ مل کر رہتے، اکٹھے کھاتے پیتے اور ایک دوسرے کی خوشی غمی میں بھی شریک ہوتے تھے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے اس حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے کہ آپ بیتی نگاروں نے اس سماجی منظر نامے کی عکاسی بڑے احسن انداز میں کی ہے۔ تقسیم سے قبل کا یہ سماج ایسا تھا جس میں ایک ایسا بھائی چارہ قائم تھا جو مذہبی حدود سے استثنیٰ اختیار کیے ہوئے تھا۔ اس مشترکہ سماج میں صدیوں سے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے والے لوگ ایک دوسرے کو اپنا سمجھتے تھے او رنہ صرف باہمی طور پر مل جل کر کام کرتے تھے بلکہ کھانے پینے میں بھی ایک دوسرے کے مذہب کو اہم نہیں سمجھتے تھے ان کے درمیان باہمی بھائی چارہ دکھائی دیتا تھا۔ طاہر لاہوری، لاہور کے بارے میں لکھی گئی اپنی یادداشتوں "سوہنا شہر لاہور" میں اس مشترکہ سماجی منظر نامے کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> ڈبی بازار میں مولا ماش کی دال والا مشہور تھا، اس کی دکان گلی میں تھی اور بارہ بجے سے دو بجے تک اس کی ماش کی دال خوب بکتی تھی۔ بڑا رش رہتا تھا۔ اسی گلی کے باہر ڈبی بازار کے چوک میں رام رکھا مل ٹیلر ماسٹر کی دکان تھی۔ اس کے ہندو کاریگر، مسلمان کاریگروں سے مولا بخش کی دکان سے ماش کی دال منگا کر کھاتے تھے، اسی طرح سید مٹھے کے چوک میں سندرداس ٹیلر ماسٹر کی دکان پر ہندو مسلم کاریگر تھے۔ سب اکٹھے بیٹھ کر گوشت کھاتے تھے۔ (۱۴)

اس اقتباس سے اس مشترکہ سماجی منظر نامے کی عکاسی ہوتی ہے جس میں دھرم کی اہمیت تو تھی لیکن وہ سماجی معاملات میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ ایک ہی جگہ پر کام کرنے والے ایک دوسرے کے ساتھ سماجی روابط میں بندھے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کی عزت اور توقیر لازم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو جو گائے کو ماں کا درجہ دیتے تھے اور ہندوستان میں گائے ذبح کرنے پر مسلمانوں کو اذیت کا نشانہ بنایا جاتا تھا لاہور کے اس مشترکہ سماج میں وہ بڑے خلوص اور لگاؤ کے ساتھ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر اسی گائے کا گوشت بھی کھالیتے تھے اور دیگر سماجی روابط بھی قائم رکھتے تھے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشتوں میں تقسیم سے قبل کے اس مشترکہ سماج کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔

سماجی حوالے سے تہواروں پر ایک دوسرے سے ملنا اور ایک چاہت کا اظہار کرنا بھی لاہور کی سماجی اقدار میں اہم مقام رکھتا ہے۔ تہوار مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ سماجی حوالے سے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ لڑائیاں اور رنجشیں جو پورا سال جاری رہتی تھیں، تہواروں پر ایک دوسرے کے گلے لگ کر وہ بھی ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ لاہور کے سماج کا وہ حسین چہرہ ہے جو ماضی میں موجود تھا اور آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ لاہور کی یادداشتوں پر مبنی کتاب "مٹتا ہوا لاہور" جو لاہور کی مختلف سماجی شخصیات کے انٹرویوز کی صورت میں ان کی یادداشتوں مبنی ہے، اس میں لاہور کے سماج کے اس پہلو کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں ملتی

ہے۔ یہ سماجی شخصیات اپنی یادداشتوں کے ذریعے اس لاہور کو سامنے لاتے ہیں ، جو حقیقی سماج تھا اور اس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ سماجی تعلقات کی استواری اور مضبوطی کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ہر کوئی پہل کرنے کی کوشش کرتا تھا جس کی وجہ سے سماج میں امن اور آشتی اور بھائی چارے کی فضا قائم تھی۔ اسی سماجی فضا کا نقشہ لاہور کی ایک معروف سماجی شخصیت ، شریف مستری نے بھی کھینچا ہے۔ وہ اپنے ایک انٹرویو میں لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس سماجی قدر کو یوں نمایاں کرتے ہیں:

> برادری مل کے اکٹھی عید کی نماز پڑھتی۔ گلے ملتے۔ نماز کے بعد کسی نے کہنا میرے گھر چلیں ۔ وہاں مٹھائی کھا کے اپنے اپنے گھروں کو جانا۔ روپے کی دو سیر دیسی گھی کی مٹھائی مل جاتی تھی۔ حضوری باغ کی طرف سے آئیں تو کونے پر بھائیاں دی دکان ہوتی تھی۔ بڑی مشہور عطر کی دکان تھی۔(۱۴)

تہوار کے موقع پر ایک دوسرے کے گلے ملنا اور پھر خود دعوت دے کر دوسروں کو اپنے گھر لے جانا اور مٹھائی اور دیگر لوازمات کے ساتھ تواضع کرنا دراصل لاہور کے سماج کا وہ حقیقی روپ سامنے لاتا ہے، جو پرانے لاہور کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ آج بھی بعض گھرانوں میں رواج موجود ہے اور تہواروں کے مواقع پر ایک دوسرے کے گھروں کا رخ کیا جاتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ سماجی روابط اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ اپنے گھر والوں کے ساتھ مختلف پارکوں، سیر گاہوں اور قابل دید مقامات کا رخ کرنے کا رواج پروان چڑھ رہا ہے ۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لاہور کے سماج کی جو عکاسی اردو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے کی ہے ، اس میں ایک طرف مشترکہ سماج کی عکاسی ملتی ہے تو دوسری طرف سماج کی عکاسی بھی ملتی ہے جس میں کسی حد تک مذہبی بنیاد پر قائم کیے گئے تعصب کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ لاہور کا ذکر جن آپ بیتیوں میں ہوا ہے اور جن تخلیق کاروں نے اپنی یادداشتیں ترتیب دی ہیں

ان میں انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ ساتھ لاہو ر کے سماج کے ان دونوں پہلوؤں کو نمایاں کیاہے۔اس سے ایک طرف لاہور کے سماج کی عکاسی ہوتی ہے تو دوسری طرف اس سماج کی عکاسی کرنے والے آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں کی غیر جانبداری بھی سامنے آتی ہے۔

اردو آپ بیتی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتاہے کہ جن آپ بیتی نگاروں نے اس شہر کی رونق سے لطف اٹھایااوراپنی زندگی کے ایام اس شہر میں بسر کیے ہیں،وہ اس کی سماجی حیثیت سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی زندگی کے وہ تجربات جو اس شہر میں حاصل ہوئے ہیں، انھیں اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بھی بنایاہے۔ لاہور بسنے والے آپ بیتی نگاروں کی تخلیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتاہے کہ لاہور انھیں اپنے اندر سرائیت کرتا ہوا محسوس ہوا اور دوسری اہم حقیقت ہے یہ ہے کہ بہت سے آپ بیتی نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بہت ساحصہ اس شہر لاہور کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی بسر کیا ہے ، لیکن جس طرح انھوں نے اس شہر کی سماجی اقدار کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایاہے، ایسا دیگر شہروں کے ساتھ نہیں ہوا۔ اس کا ثبوت محمد سعید کی آپ بیتی " آہنگ باز گشت " سے ملتاہے۔ محمد سعید نے اپنی زندگی کا جو حصہ لاہور میں گزارا ہے، اسے وہ اپنی زندگی کا بہترین حصہ قرار دیتے ہیں۔ اس کی بہتری کے اسباب میں لاہور کے سماجی منظر نامے کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ وہ لاہور میں اپنی آمد کے بعد یہاں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> اب زندگی میں حضر کا دور شروع ہوا۔ جنگلوں کی وسعتیں پیچھے رہ گئیں اوران کی جگہ شہروں کی کوچہ نوردیوں نے لے لی۔لاہور پہنچے تو دیکھا ایک نئی دنیا میں آنکلے ہیں ۔ تنگ و تاریک گلیاں،بازاروں میں ہجوم ، بلند وبالا عمارتیں، خوش پوش وخوش خوراک لوگ، گفتگو میں بے باک، عادات میں آزاد و بے فکر ، ہر سو سیاست کا چرچہ ، درس گاہوں، لیکچر ہالوں، مسجدوں ، مندروں ، بازاروں اور منڈیوں میں، ہر شخص جوش کے عالم میں، ہر جماعت فعال و متحرک ۔(۱۵)

اس اقتباس کو بنظر غائر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سماج کے بہت سے عناصر یہاں جمع کر دیے گئے ہیں۔ محمد سعید کے لیے لاہور شہر ایک نئی دنیا میں منتقل ہونے کے مترادف تھا۔ انھوں نے جہاں اس شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کا ذکر کیا ہے وہاں اس میں بسنے والے افراد کی کشادہ دلی اور کشادہ ذہنی کا بھی ذکر کیا ہے۔ خوراک، لباس، بودوباش، عادات ہر حوالے سے اس شہر کے باسی اپنا ایک خاص سماجی منظر نامہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سماجی رویوں کی عکاسی بھی ہر جگہ ہوتی ہے خواہ وہ درس گاہیں ہوں یا لیکچر ہال، مساجد ہوں یا مندر ہر جگہ لاہوری اپنے سماجی رویوں کو سامنے لاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن ہے جب کسی سماج میں سماجی اقدار حقیقت کا روپ دھارے ہوئے ہوں کیوں کہ تصنع اور ریاکاری پر مبنی اقدار اپنا اظہار اگر کریں بھی تو ان میں پائیداری اور جاذبیت بہت کم ہوتی ہے۔ محمد سعید کی آپ بیتی میں لاہور کے سماجی منظر نامے کا جس طرح نقشہ کھینچا گیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ شہر سماجی اقدار کے حوالے سے تصنع کی بجائے حقیقت اور ریاکاری کی بجائے خلوص پر مبنی اقدار کا حامل ہے۔

محمد سعید کا سماجی مشاہدہ خاصا وسیع نظر آتا ہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں لاہور کے باسیوں کے جو شب و روز بیان کیے ہیں، ان کے مطالعے سے لاہور کا سماجی منظر نامہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ انھوں نے لاہور کی سماجی اہمیت کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ اس شہر میں بسنے والے لوگوں کے شب و روز کو بھی اس طرح سامنے لانے کی کوشش کی ہے، سماج کے بہت سے رویوں کی عکاسی ہونے لگتی ہے۔ وہ سماج کی اس بہترین عکاسی کے لیے اپنے مشاہدے کو بنیاد بناتے ہیں۔ صبح کے وقت لاہور کے باسی بیدار ہوتے ہیں جس طرح سڑکوں پر نکل آتے تھے، وہ آج کے لاہور میں تقریباً ناپید ہو چکا ہے۔ محمد سعید اپنے عہد کے لاہور کا تذکرہ کرتے ہوئے لاہور کے باسیوں کی سماجی عادات خاص طور پر صبح خیزی کے بارے میں لکھتے ہیں:

> پو پھٹتی تو لاہور کی بیشتر گزر گاہیں جی اٹھتیں۔ گوالمنڈی، نسبت روڈ اور راوی روڈ کی ہندو آبادیوں کے کواٹر چھٹپٹے میں دھڑا دھڑ کھلتے جاتے

اوران میں سے ہر عمر کے لوگ ہجوم در ہجوم سڑکوں پر نکل آتے۔ چند بجھتی ہوئی آنکھیں ایک بار اور طلوعِ آفتاب کا سماں دیکھنے کے لیے محلوں کے تاریک گوشوں سے نکل آتیں۔ کچھ پنشن پائے ہوئے کلرک، مدرس، ٹکٹ کلکٹر اور ڈاکٹر جو تیس تیس برس سرکاری کرسیوں پر جکڑے رہنے اورافسروں کے سامنے خمیدہ کمر کھڑے ہونے کے بعد پہلی بار سر وقد چلنے کی بے رقت کوشش کررہے ہوتے، قطار اندر قطار ان بستیوں سے نکلتے اور سپیدۂ سحر میں لپٹی ہوئی سڑکوں پر پھیل جاتے۔ اور پھر ان کے جلو میں وہ گاگر میں گنگا جل کی گدلی مستیاں۔۔(۱۶)

لاہور مختلف اقوام کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا مسکن رہا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل تو لاہور میں ہندو اور سکھ اس قدر زیادہ تعداد میں موجود تھے کہ پورے کے پورے محلے ہندوؤں اور سکھوں کے محلے کہلاتے تھے۔ محمد سعید نے صبح خیزی کے حوالے سے لاہور کے سماج کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس میں ہندوؤں کا اپنی مذہبی عبادات کی طرف رخ کرنا اور صبح سویرے گنگا نہانا کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ یہ ایک ایسا سماجی منظر نامہ ہے جو ہر مذہب کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے مشترکہ سماج کی عکاسی کرتا ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی سماجی اقدار کے امین بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور کے باسیوں کا صبح سویرے اٹھ کر تازہ ہوا میں سانس لینا، سیر کے لیے نکلنا ایک ایسی سماجی قدر کا درجہ اختیار کر چکا تھا، جس میں مذہب، قوم اور عمر کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی تھی بلکہ ہر مذہب، ہر قوم اور ہر عمر کے لوگ اس سماجی عمل میں شریک ہوتے تھے۔ یہ عمل اگرچہ انفرادی سطح پر ہوتا تھا لیکن پورے لاہور کی اس میں شمولیت کی وجہ سے یہ ایک مجموعی سماجی قدر کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔

صبح خیزی کے حوالے سے لاہور کے سماج کا نقشہ دیگر آپ بیتی نگاروں نے بھی کھینچا ہے۔ وہ تخلیق کار جنھوں نے نہ صرف اپنی زندگی کا کچھ حصہ لاہور میں گزارا بلکہ وہ صبح خیزی اور صبح کی ہوا

خوری کے سماجی عمل میں شریک رہے ہوں، ان کے ہاں اس سماجی قدر کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں ملتی ہے۔ طاہر لاہوری کا شمار بھی ایسے تخلیق کاروں میں ہوتا ہے، جنھوں نے نہ صرف لاہور کو اپنا مسکن بنایا بلکہ اس کے باسیوں کے شب وروز کے احوال سے بھی گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی لاہور کی سماجی اقدار کی عکاسی ان کی یادداشتوں میں خوب ملتی ہے۔ لاہور کے باسیوں کی صبح خیزی کا بیان کرتے ہوئے، وہ بھی اس رویے کو مذہب، قوم اور عمر سے ماورا قرار دیتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ لکھتے ہیں:

> صبح سے پہلے لاہور میں ایک عجیب سماں ہوتا۔ ایک رومانی کیفیت ہوتی۔ ویسے تو لوگ رات بھر پھرتے پھراتے رہتے مگر جو جلدی سونے کے عادی تھے، وہ رات دو تین بجے جاگ اٹھتے۔ گلیوں، بازاروں، کوچوں اور باغوں میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ مسلمان خدا کا نام لیتے ہوئے مسجدوں کو جارہے ہوتے۔ ہندو رام رام کرتے دریا کی جانب رواں دواں ہوتے، ہندو مرد عورتیں سب منہ اندھیرے دریا پر جاتے، اشنان کرکے پاپ جھاڑتے۔ اذان شروع ہوجاتی، مندروں میں گھنٹیاں اور سنکھ بجنا شروع ہوجاتے۔ کچھ ہندو گھروں پر نہاتے وہ پانی استعمال کرنے میں بھی بخل سے کام لیتے، پانی کم ڈالتے رام رام زیادہ کرتے۔(۱۷)

طاہر لاہوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتا کہ وہ اس سماجی عمل میں خود شریک رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے یہاں مسلمانوں کا مساجد کی طرف جانا اور ہندوؤں کا دریا پر جاکر اشنان کرنا کی عکاسی کرتے ہوئے لاہور کے اس سماجی منظر نامے کو واضح کیا ہے، جس میں مذہبی اقدار کو خاص عمل دخل حاصل تھا۔ پھر صبح کے وقت مساجد سے بلند ہونے والی اذان کی آوازیں ایک ایسا سحر طاری کردیتی تھیں، جس کی عکاسی الفاظ میں ممکن نہیں۔ ہندوؤں کے مندروں میں بجنے والی گھنٹیاں اور

سنکھ بھی ہندو قوم کے لیے راحت کا سامان فراہم کرتے تھے ۔ طاہر لاہوری نے یہاں ہندوؤں کے سماج کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں کی ہے ۔ دریا پر اشنان کرنے والوں اور پاپ جھاڑنے والوں کے علاوہ جو ہندو گھروں میں نہاتے تھے ، ان کا پانی ڈالا اور ساتھ رام رام کرنا قاری کو اس سماج میں لے جا کھڑا کرتا ہے ، جو تقسیم سے قبل کے لاہور کا سماج تھا۔ موجودہ عہد کے لاہور میں بھی اگرچہ ہندو موجود ہیں ، لیکن اب وہ تقسیم سے قبل کی سماجی اقدار کافی حد تک ناپید ہو چکی ہیں۔

لاہور کے سماج میں اس شہر کی بناوٹ اور خاص طور پر اس شہر کے وہ محلے جہاں تنگ گلیاں ہیں، وہ بھی اپنی ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ کسی بھی خطے، شہر یا علاقے میں لوگوں کی رہائش کے انداز اس خطے، شہر یا علاقے کا سماجی منظر نامہ تشکیل دینے میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لاہور کے قدیم محلوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ وہاں کی گلیاں انتہائی تنگ ہیں۔ بعض اوقات تو گزر بھی مشکل سے ہوتی ہے۔ لاہور کی ان تنگ گلیوں کو مشتاق احمد یوسفی نے اپنے مزاح کا نشانہ بنایا ہے تو بعض یادداشت نگاروں نے بھی نہ صرف ان تنگ گلیوں کا تذکرہ ہے بلکہ ان کی وجہ سے پیدا ہونے والے مختلف سماجی مسائل کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ یہ ایسے سماجی مسائل ہیں جو اب محلوں میں مسائل سمجھے ہی نہیں جاتے بلکہ سماجی عمل کا حصہ بن چکے ہیں۔ وہاں کے باسیوں کے لیے ان تنگ گلیوں میں رہنا معمول کی بات ہے ۔ یہی معمول ان کے سماجی رویوں کو ظاہر کرتا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا شمار ایسے تخلیق کاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی عمر نہ صرف لاہور میں گزاری ہے بلکہ انھوں نے اپنی تخلیقات میں لاہور کا حقیقی چہرہ بھی پیش کیا ہے۔ وہ ایسے تخلیق کار ہیں جنھوں نے لاہور کا مشاہدہ خاص تخلیقی نقطہ نظر سے کیا ہے۔ ان کی یادداشتوں پر مبنی کتاب "لاہور آوارگی" میں لاہور کا جو سماج سامنے آتا ہے، اس میں ان تنگ گلیوں میں رہنے والوں کے سماجی مسائل اور سماجی عادات کا نقشہ بھی ملتا ہے۔ ان تنگ گلیوں کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> نیم اندھیارے مکانوں میں جو قیام کیے جاتے ہیں ، وہ دو قسم کے لوگ
> ہوتے ہیں ، زیادہ تر ایسے جن کے پاس حیات بسر کرنے کا کوئی متبادل

مقام نہیں ہوتا اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں ، جو شہر لاہور کی ان تنگ گلیوں میں ۔ اور وہاں متعدد ایسی گلیاں بھی ہیں جہاں مجھ جیسا بد ہئیت شخص اپنی توند کے ساتھ داخل ہو جائے تو پھنس جاتا ہے اور اسے ذرا پہلو بدل کر سرکنا پڑتا ہے ۔ سامنے کوئی اور مکین چلا آئے تو اسے راہ دینے کی خاطر کسی چوکھٹ کے ساتھ سانس روک کر کھڑا ہونا پڑتا ہے ۔ یہاں مرگ ہو جائے تو چارپائی کے لیے گزر گاہ ممکن نہیں ہوئی ، چنانچہ مردے کو کندھوں پر ڈال کر باہر لے جاکر قدرے فراخ گلی میں منتظر چارپائی پر ڈال کر مُردوں کی گھاٹی کا رخ کیا جاتا ہے ۔(۱۸)

ان تنگ گلیوں میں رہنے والوں کا سماجی منظر نامہ تشکیل دینے میں ان گلیوں کی تنگی کا خاص عمل دخل ہے ۔ لاہور کے وہ محلے جو کشادہ ہیں وہاں کی سماجی اقدار اور ان تنگ محلوں کی سماجی اقدار میں بھی خاصا فرق پایا جاتا ہے ۔ شادی بیاہ کا موقع ہو یا مرگ کا ، ہر موقع پر گلیوں اور محلوں کی تنگی اور کشادگی اپنا اثر دکھاتی ہے ۔ مستنصر حسین تارڑ نے اپنی یادداشتوں میں اس سماجی منظر نامے کو بڑے جاندار انداز میں واضح کیا ہے ۔ دیکھا جائے تو عام حالات میں مردے کو کفن پہنانے کے بعد یوں کندھوں پر اٹھا کر لے جانا ، ناقابل یقین قرار پاتا ہے جس کا تصور کرنا بھی محال ہے لیکن ان گلیوں کی تنگی کی وجہ سے یہ عمل اس سماج میں ایک معمول کا سماجی عمل بن چکا ہے ، جس پر کسی کوئی کراہت نہیں ہوتی ۔ اسی طرح ان تنگ گلیوں میں بسنے والے لوگوں کے شادی بیاہ اور خوشی کے دیگر سماجی عوامل بھی گلیوں کی تنگی کی وجہ سے دیگر محلوں کی نسبت مختلف ہوتے ہیں ۔ مستنصر حسین تارڑ نے ان گلیوں کی سماجی عمل میں شرکت کو سامنے لا کر لاہور کا اصل رخ دکھانے کی کوشش کی ہے ۔ یہ وہ رخ ہے جو گلیوں کی تنگی کی وجہ سے پیدا ہونے والے سماجی افتراکات کو سامنے لاتا ہے ۔ مستنصر حسین تارڑ نے ان سماجی افتراکات کو عیاں کرنے کے لیے اپنے مشاہدے سے خوب کام لیا ہے ۔

لاہور کے سماجی منظر نامے میں ایک دوسرے اور خاص طور پر غریبوں کے لیے نذرونیاز کے اہتمام کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس شہر کو الیاء اللہ کے ساتھ بھی چوں کہ خاص نسبت ہے اور بہت سے اولیاء اللہ نے اسے اپنا مسکن بنایا اور یہیں پر ساری زندگی گزارنے کے بعد سپرد خاک ہوئے، کچھ ان کے عرس اور میلوں کی نسبت سے اور کچھ ویسے خیر خواہی کے جذبے سے لاہور کے باسیوں میں نذر و نیاز ایک ایسے سماجی عمل کا درجہ اختیار کر چکی ہے، جس کے بغیر اس سماج کا تصور بھی محال ہے۔ خاص طور پر محرم کے دنوں میں تو پورے برصغیر کی طرح اس شہر میں بھی نذرونیاز اور سبیلوں کا اہتمام بڑے چاؤ اور جذبے سے کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شیعہ سنی کی کوئی تفریق نہیں ہوتی بلکہ پورا سال جاری رہنے والے نذرونیاز کے سلسلوں میں سنی اور شیعہ دونوں شریک ہوتے ہیں۔ اسی طرح محرم کے دنوں میں بھی نذرونیاز کے سلسلے ایک سماجی عمل کے طور پر جاری رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے بارے میں لکھی گئی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں بھی تخلیق کاروں نے نذرونیاز کے اس عمل کو اہم سماجی عمل قرار دیا ہے۔ انھوں نے لاہور کے مختلف علاقوں میں لگنے والی نذرونیاز اور سبیلوں کے نقشے اس طرح کھینچے ہیں کہ یہ عمل ایک مشترکہ سماجی رویہ بنتا دکھائی دیتا ہے۔ طاہر لاہوری، اس سماجی عمل میں لوگوں کی شرکت اور عقیدت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

> نذرونیاز کے سلسلے مدتوں سے جاری ہیں۔ محرم پر دس دن تک شیعہ سنی دل کھول کر نیاز دلاتے، کجی ٹھوٹھی کا رواج زیادہ تھا، دیگیں پکتیں، امامین کا ختم گھر گھر دلایا جاتا۔ شیعہ نواب بڑے فراخ دل تھے۔ تعصب نام کو نہیں تھا، ہر فرقے کا مسلمان ان کے ہاں سے کھانا کھاتا، سبیلیں نو اور دس محرم کو لگتیں۔ دسویں محرم کو ہندو بھی سبیلیں لگاتے۔(۱۹)

طاہر لاہوری نے یہاں جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نذرونیاز کے اس سماج عمل میں بھی لاہور کے باسی مذہب اور قوم کی تفریق کو بالاتر رکھتے ہوئے شریک ہوتے تھے۔ دسویں محرم

کو ہندوؤں کا سبیلیں لگانا اسی امر کی عکاسی کرتا ہے کہ یہ سماجی عمل مذہب کی قید سے آزاد تھا بلکہ اس سماج میں بسنے والا ہر شخص اس میں شمولیت کو اپنے لیے لازم سمجھتا تھا۔ یہ سماجی عمل جدید عہد کے لاہور میں بھی جاری ہے۔ آج بھی لاہور میں نذرونیاز اور محرم میں سبیلوں کے سلسلے اُسی اہتمام سے جاری ہیں۔

مذہب اور سماج کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ عموماً کسی بھی خطے میں بسنے والی غالب اکثریت کا جو مذہب ہوتا ہے، اس خطے کی سماجی اقدار بھی اسی تابع ہوتی ہیں اور ان سماجی اقدار میں بھی وہی مذہبی رنگ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی خطے میں موجود مذہبی پیشواؤں کی موجودگی یا ان کے مدفن اور ان پر لگنے والے میلے اور عرس بھی سماجی نقشے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس حوالے سے لاہور کے سماج کا مشاہدہ کیا جائے تو اس سماج میں بھی اگرچہ مذہب اور مذہبی اقدار اک اہم عمل دخل ملتا ہے، لیکن یہ مذہبی اقدار جب سماجی اقدار میں ڈھلتی ہیں تو مذہبی قیود سے بالاتر بھی ہو جاتی ہیں۔ طاہر لاہوری نے اپنی یادداشتوں میں اس حوالے سے لاہور کے سماج کی بڑی جاندار انداز میں منظر کشی کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> لاہور کی سماجی زندگی بھی سیاسی زندگی سے کم رنگارنگ نہیں تھی۔ داتا صاحب کا عرس، شالیمار کے نواح میں مادھو لعل حسین کا میلہ، گووارجن دیو کی سمادھ پر جوڑ میلہ، منٹو پارک میں دسہرہ کا اجتماع، لاہور کی سماجی زندگی کی اہم تقریبات تھیں۔ اگرچہ نام کے اعتبار سے یہ میلے خالص مذہبی گروہوں سے منسلک ہوتے تھے، تاہم مجمع خالصتاً ایک مذہب کے پرستاروں پر مشتمل نہ ہوتا تھا۔ چونکہ صوفیاء خواہ کسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہوں، دکھی انسانوں کے لیے سہارا ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے آستانے مرجع خلائق رہتے ہیں۔ چنانچہ داتا صاحب

اور مادھو لعل حسین سے وابستگی رکھنے والوں میں بے شمار غیر مسلموں
کے نام بھی ملیں گے۔(۲۰)

طاہر لاہوری کا مشاہدہ خاصا وسیع ہے۔ وہ لاہور کے سماج کا نقشہ کھینچتے ہوئے نہ صرف وہاں کے اولیاء اور بزرگانِ دین کو خصوصی اہمیت دیتے ہیں بلکہ وہ ان بزرگوں اور اولیاء کے اس روپ کو بھی سامنے لاتے ہیں ، جو مجموعی انسانیت کے لیے مرجع خلائق ہے ۔ ان بزرگوں کی خدمات دینی حوالے کے ساتھ ساتھ سماجی حوالے سے بھی خاصی اہم ہیں۔ انھوں نے سماج کی فلاح و بہبود کے لیے جو اقدامات اٹھائے اور جس طرح اپنی تعلیمات سے سماجی فلاح کا کام کیا ، اس نے لاہور کے سماج کو خاصا متاثر کیاہے۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے سماج پر آج بھی ان بزرگان اوراولیا ء کی تعلیمات کے اثرات واضح دکھائی دیتے ہیں۔

لاہور کے سماج کا ایک اہم عنصر حسن ہے۔ یہ حسن فطرت بھی ہے اور انسان کا پیدا کردہ حسن بھی ۔ لاہور کا حسن اپنی مثال آپ ہے ۔ اس حسن کی وجہ سے لاہور کے سماج میں جو رعنائی پائی جاتی ہے، آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے اس کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچاہے ۔ لاہور کی ہر شے حسین ہے۔ وہاں موجود تاریخی عمارتیں، باغات ، انسانی اور سماجی رویے سب کچھ حسن کا شاہکار ہیں۔ طاہر لاہوری سماج کے اس حسن کا عکاسی یادداشتوں میں یوں ملتی ہے:

عمارتوں کا حسن، باغات کا حسن، چہروں کا حسن، انسانی وجاہتوں کا حسن،
غرض اس شہر نے ہر حسن اپنے اندر سمور کھا تھا۔ شہرتوں اور ناموریوں
کے چراغ جلتے تھے ۔ ہر فن اور ہر ہنر اور ہر شعبہ زندگی کے در و بام
پر چراغاں کرنے والوں کی داستانیں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔
پہلوانی کا شوق اس وقت جنون کی حد تک تھا، چھوٹے بڑے بچے بوڑھے
تمام اس شوق سے سرشار تھے ۔ پہلوانوں میں خوراک کے سلسلے میں
خاص ذوق تھا۔(۲۱)

طاہر لاہوری نے لاہور کے سماج کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ اس کا حسین پہلو ہے۔ یہ حسن اس سماج کا اہم عنصر قرار پاتا ہے۔ اس شہر کا یہ حسن اس کے سماجی رویوں کے ساتھ منسلک ہے۔ اس شہر کے اولیاء کی درگاہیں، پہلوانوں کے اکھاڑے، ماہرین فن کے فن کار سب کچھ اس سماج کے بنیادی عناصر میں شامل ہیں اور یہ سبھی عناصر مل کر حسن کی تخلیق بھی کرتے ہیں۔ لاہور کے سماج میں پہلوانی اورزورآزمائی ماضی میں کسی حد تک اس شہر کی اہم پہچان بھی بن چکی تھی۔ پہلوانوں کی کشتیوں، کبڈیوں اوراکھاڑوں میں سماجی اقدار اپنے پورے جاہ وجلال کے ساتھ دیکھنے کو ملتی تھیں۔ اب بھی لاہور میں یہ سماجی عناصر موجود ہیں لیکن اب ان میں پہلے سی آب وتاب باقی نہیں رہی۔

پہلوانوں کی وجہ سے یہ شہر خوش خوراکی کے حوالے سے بھی اپنی ایک خاص سماجی پہچان رکھتاہے۔ ماضی اور حال دونوں میں لاہور کے باسی خوش خوراکی کے حوالے سے اپنی پہچان آپ ہیں۔ اس شہر کے باسی خوراک کے معاملے میں خاصے محتاط اور ذمہ دار واقع ہوئے ہیں۔ پہلوانوں کی خوراک تو ویسے بھی اچھی ہی ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ عام لاہوری بھی خوراک کے معاملے میں خوش خوراک ہی واقع ہوا ہے۔ ماضی میں اس شہر کی خوش خوراکی اپنی مثال آپ تھی۔اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اس شہر کے دیگر سماجی عناصر کے ساتھ ساتھ اس کے باسیوں کی خوش خوراکی کا تذکرہ بھی ملتاہے۔" سوہنا شہر لاہور" کے مصنف اپنی یادداشتوں میں لاہور کے باسیوں کی خوش خوراکی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ شہر خوش خوراکی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا۔ بڑے بڑے پہلوانوں کی خوراک خاصی مہنگی تھی۔ ان کی سردائی میں بیسیوں قسم کے طاقت ور اجزاء ہوتے تھے۔ اس دور کے لحاظ سے اس سردائی پر کافی خرچ ہوتا تھا۔ بڑے پہلوان تہجد سے پہلے اٹھتے، قریباً دوہزار ڈنڈ اور دوہزار بیٹھک لگاتے اور سورج نکلنے سے پہلے اپنے تمام معمولات ختم کرلیتے۔

صبح و شام اکھاڑوں میں زور کرتے اور استادوں اور خلیفوں سے استفادہ کرتے۔(۲۲)

اس اقتباس میں لاہور کے لوگوں کی خوش خوراکی کے ساتھ ساتھ ان لوگوں میں پہلوانی کے شوق کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ خاص طور پر پہلوان لوگ مہنگی خوراک استعمال کرتے تھے جو طاقت وراور مفید اجزاء پر مشتمل ہوتی تھی۔ یہ خوراک استعمال کرنے کے بعد اسے جزو بدن بنانے کے لیے کی جانے والی جسمانی مشقیں بذات خود ایک سماجی عنصر قرار پاتی تھیں۔ پہلوانوں کا صبح تہجد سے پہلے بیدار ہونا ، ہزاروں ڈنڈ اور بیٹھکیں لگانا اور سورج نکلنے سے قبل اپنی تمام جسمانی مشقیں مکمل کرلینا ایسا سماجی عمل تھاجو لاہور کی خاص پہچان بن گیا تھا۔ اس طرح اکھاڑوں میں صبح و شام زور آزمائی کرنا بھی اس سماج کا اہم حصہ بن چکا تھا۔

لاہور کے سماج میں خوش خوراکی کا عنصر اہم سماجی قدر کا درجہ اختیار کرچکاہے۔ نہ صرف ماضی بلکہ جدید عہد کالاہور بھی اس حوالے سے اپنی خاص پہچان رکھتاہے۔ پہلوانوں کے علاوہ اس شہر کے عام لوگ جس طرح کی خوراک استعمال کرتے ہیں اور جس طرح ان کے معمولات ترتیب پاتے ہیں، اس سے بھی اس سماج کا نقشہ سامنے آتاہے۔ اس حوالے سے اس سماج کی جھلکیاں اور اردو آپ بیتی اوریادداشت نگاری میں جگہ جگہ ملتی ہیں۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> لاہور کے لوگ قدرتی طور پر یاپانی اور مٹی کے اثر کے باعث یاماحول کے باعث خوش خوراک ہیں۔ خوش گلو ہیں اور خوش پوش ہیں۔ صبح سویرے ، بچے ،بڑے بوڑھے جوان سب دودھ دہی والی دکانوں اور حلوائیوں کی دکانوں کے گرد ہجوم کی صورت میں جمع ہوتے تھے۔ لسی کلچے کاناشتہ ، حلوہ پوڑی کاناشتہ یاپھر سری پائے اور کلچے کاناشتہ عام تھا۔ گھروں میں بھی سردی ہو یا گرمی ، ناشتہ اسی صورت میں ہوتا تھا۔(۲۳)

خورد و نوش کے انداز کسی بھی سماج کی عکاسی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خورونوش کا عمل ہر فرد کی بنیادی ضرورت ہے۔ بنیادی ضرورت ہونے کی وجہ سے اس کی مشق بھی ہر وقت اور عام ہوتی ہے۔ یہ عام مشق ہی سماجی قدر کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی سماج کا جائزہ لیتے وقت وہاں کے باسیوں کے دیگر سماجی عناصر کے ساتھ ساتھ اس سماج میں بسنے والے لوگوں کی خوراک اور کھانے کے انداز کو بھی خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ اوپر بیان کیے گئے حقائق سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کے لوگ خوراک کے بارے میں خاصے مہذب واقع ہوئے ہیں۔ ان یادداشتوں کے مطالعے لاہور کا جو سماجی نقشہ سامنے آتا ہے، اس میں بسنے والے لوگ خوراک کے انتخاب اور کھانے کے انداز کے بارے میں اپنی خاص سماجی پہچان رکھتے ہیں، جس سے اس سماج کی شناخت کی جاسکتی ہے۔

قدیم لاہور کا سماج فطری سماج تھا۔ اس میں ایک طرف فطری حسن اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر تھا تو دوسری طرف گھریلو سطح پر بھی فطری عناصر پائے جاتے تھے۔ گھروں میں سادگی تھی، بنیادی ضروریات کی چیزیں عورتیں خود گھروں میں تیار کرتی تھیں۔ اس وجہ سے گھروں کے سامنے ایسی چیزیں بیچنے والے بھی عام آتے تھے جو ان بنیادی ضروریات کا سامان فراہم کرتے تھے۔ لاہور کے سماج میں ان عناصر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ایسی ہی بنیادی ضروریات کی چیزوں میں چرخے کا استعمال بھی اہم تھا۔ چرخہ بذات خود ایک سماجی اور ثقافتی عنصر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ دیسی کھڈیاں اور ان پر کام کرنے والے کاریگر بھی سماجی سطح پر اہمیت کے حامل تھے۔ لاہور کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں میں ان سماجی عناصر کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ طاہر لاہوری اس کی عکاسی کرتے ہوئے لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں "سوہنا شہر لاہور" میں لکھتے ہیں:

> لاہور گلیوں میں ایک اندھا یہ آواز لگاتا ہوا آتا تھا۔ (مائیاں بہناں کتن تے میرے تکلے وکن) وہ چرخوں کے تکلے بیچتا تھا۔ اس کے تکلے بہت بکتے تھے۔ ہندو، مسلم سب عورتیں اس کے تکلوں کی خریدار تھیں۔

> اس وقت لاہور میں چرخہ کاتنے کا رواج تھا، دیسی کھڈیاں بھی عام تھیں۔ کھدر کھیس چادریں، دیسی کھڈیوں پر تیار ہوتی تھیں۔ اس دور میں تیور ،بیور ، ریجے ، پھلکاریاں استعمال ہوتی تھیں۔ داج میں دی جاتی تھیں اور پھر ان پر کڑھائی کا کام بھی لڑکیاں کرتی تھیں۔(۲۴)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنیادی ضروریات کو پوری کرنے کا یہ سماجی عمل ہر گھر میں ہوتا تھا ۔ اس کے علاوہ بہنوں بیٹیوں کو جہیز میں دی جانے والی چیزیں بھی اس سماج کا حقیقی نقشہ پیش کرتی تھیں۔ جہیز میں دی جانے والی چیزوں میں یہی گھریلو سطح پر تیار ہونے والی چیزیں زیادہ اہمیت رکھتی تھیں اوران کی تیاری میں لڑکیاں خود کڑھائی کا کام کرتے ہوئے برابر کا حصہ ڈالتی تھیں۔لاہور کے ساتھ ساتھ یہ سماجی رویے اور جہیز کے لیے اس طرح کی چیزیں تیار کرنا پنجاب کے دیگر علاقوں میں بھی عام تھا۔ اب یہ عمل دیہاتی سطح پر کسی حد تک قائم ہے جب کہ شہروں اور امراء کے ہاں یہ معدوم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ مصنوعی اور مشینی چیزوں نے لے لی ہے۔

خوردونوش اور دیگر سماجی امور کے ساتھ ساتھ کسی بھی خطے کے پہناوے اس خطے کے سماج کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ ہر خطے کے لوگ اپنے خطے کے موسم ، آب وہوا اور رسم ورواج کے مطابق مختلف ملبوسات زیب تن کرتے ہیں۔ یہ ملبوسات ان کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے سماج کو ایک خاص پہچان بھی عطا کرتے ہیں۔

ملبوسات کا تعلق لوگوں کی معاشی حالت سے بھی ہوتا ہے۔ یہ ملبوسات اور معاشی حالت ایک دوسرے کے عکاس ہوتے ہیں۔ جس خطے اور علاقے کے لوگوں کی معاشی حالت بہتر ہو گی ،ان کے ذرائع آمدن وسیع ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بنیادی ضروریات کی فراہمی میں زیادہ مسائل نہ ہوں گے ، وہاں کے لوگ خوش پوش ہوں گے۔ جب کہ دوسری طرف ایسے علاقے جہاں کے لوگوں کو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے میں ہی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہو، وہاں کے لوگ اگر ملبوسات

کے حوالے سے اعلیٰ ذوق کے مالک ہوں، پھر بھی ان کے ملبوسات اور خوش حال معاشی خطے کے لوگوں کے ملبوسات میں واضح فرق دیکھا جاسکتا ہے۔

لنڈا بازار ملبوسات کے حوالے سے بہت سے سماجوں میں ایک اہم سماجی عنصر کا درجہ اختیار کر چکا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل لاہور اور دیگر بہت سے شہروں میں لنڈا بازار ہوتے تھے جو آج بھی قائم ہیں۔ ان بازاروں میں امراء لوگوں کے اترن سستے داموں بکنے آتے تھے، جنھیں معاشی حوالے سے کمزور لوگ سستے داموں خریدتے تھے اور اپنا تن ڈھانپتے تھے۔ لاہور میں بھی یہ سماجی عنصر قیام پاکستان سے لے کر موجودہ عہد تک متواتر چلتا آرہا ہے۔ اب تو لاہور کی گلی کوچوں میں بھی لنڈے کے کپڑے بیچنے والے عام مل جاتے ہیں، قیام پاکستان سے قبل ریلوے اسٹیشن کے پاس موجود لنڈا بازار ایک ایسے سماجی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا جہاں پر آنے والے لوگ مختلف اقوام اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اپنی تن پوشی کے حوالے سے یہ سب مشترکہ خواہشات کے حامل ہوتے تھے۔ اس لنڈا بازار کے بارے میں شہرت بخاری اپنی آپ بیتی "کھوئے ہوؤں کی جستجو" میں لکھتے ہیں:

> لاہور ریلوے اسٹیشن سے دلی دروازے جانے کے لیے جس بازار سے گزرنا ہوتا، اسے لنڈا بازار کہا جاتا ہے۔ اب سے چالیس پینتالیس برس پہلے اس بازار میں اتنی رونق نہیں تھی، جتنی اب ہے۔ آمدورفت اتنی نہیں تھی۔ پرانے کپڑوں کی دکانیں کم کم تھیں۔ ان کپڑوں کی خریداری اس زمانے میں معیوب سی سمجھی جاتی تھی کہ گورے کی اترن پہننا قومی خودداری کے خلاف تھا۔(۲۵)

یہ اس عہد کا ذکر ہو رہا جب اس خطے پر فرنگی اقتدار اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا اور سماجی سطح پر سماج میں انگریز کے خلاف نہ صرف نفرت پائی جاتی تھی بلکہ انگریز سے آزادی کے حصول کی تحریکیں بھی اپنے عروج پر تھیں۔ شہرت بخاری کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت بھی لوگوں کی معاشی حالت اگرچہ کمزور تھی۔ لنڈے بازار کی موجودگی اسی امر کی دلیل ہے کہ اترن کے

کپڑے نہ صرف بکنے کے لیے آتے تھے بلکہ ان کے خریدار بھی تھے، لیکن سماجی سطح پر لنڈے کے کپڑوں کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے کپڑے پہننے والا دوسروں کی نظروں میں غریب کہلاتا تھا لیکن غربت کے مارے لوگوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا اس لیے سماج میں یہ عنصر موجود تھا۔ دوسری طرف دیکھا جائے تو انگریز جو یہاں تقریباً ایک صدی سے قابض تھے، ان کے بارے میں سماج کے لوگوں کے ذہن میں پائے جانے والے خیالات سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ انگریزوں کی اترن کی اگرچہ اچھی حالت ہوتی تھی اور پھر ولایت سے تیار کیے گئے ان کے ملبوسات اپنی ایک فاخرانہ شان بھی رکھتے تھے۔ انگریز انھیں بہت کم استعمال کرنے کے بعد لنڈے کی زینت بنا دیتے تھے۔ گویا معمولی سی رقم سے یہاں کے مقامی لوگوں کو اچھا لباس مل سکتا تھا لیکن ان کی خودداری اور قومی غیرت یہ لباس پہننے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ شہرت بخاری نے سماج میں لنڈے بازار کے کپڑوں کی دستیابی کے ساتھ ساتھ لوگوں کی ذہنیت کا نقشہ بھی بڑی عمدگی سے کھینچا ہے۔

لاہور کے لنڈا بازار اور اس سے خریدے ہوئے ملبوسات کی سماجی حوالے سے عکاسی اردو کی دیگر آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں بھی ملتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اس بازار کا ذکر کرتے ہوئے اسے وسیع سماجی منظر نامے پر پھیلاتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ صرف غریبوں کے تن ڈھانپنے کا ذریعہ نہ تھا بلکہ سماج میں امراء کی خوش لباسی کا بھی اہم وسیلہ سمجھا جاتا تھا یہی وجہ ہے کہ یہاں غریبوں کے ساتھ ساتھ امیر لوگ بھی آتے تھے اور اترن کے کپڑوں کی خریداری کرتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں اس بازار کا ذکر کرتے ہوئے، یہاں کے سماجی منظر نامے کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> اتوار کے باوجود دم کٹا لنڈورا، لنڈا بازار رونق اور پر ہجوم ہوا جاتا تھا۔ استعمال شدہ ملبوسات، جوتوں، جرابوں، جوگرز، عینکوں، پاجاموں اور جانگیوں، خواتین کی انگیوں، دستانوں، جیکٹوں، کوٹوں، مفلروں، سویٹروں، اونی ٹوپیوں، کمبلوں وغیرہ کی غالباً دنیا بھر میں یہ سب سے

بڑی مارکیٹ تھی۔ یہ نہ صرف غریبوں کے تن ڈھانکتا تھا بلکہ امراء بھی
اس گلی میں خوش لباس ہونے کے لیے چلے آتے تھے۔(۲۶)

مستنصر حسین تارڑ نے بڑی تفصیل سے اس بازار میں دستیاب چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس بازار میں آنے والوں میں مرد وزن اور ہر عمر کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یہاں عورتوں کے مخصوص ملبوسات کے ساتھ ساتھ مردوں کی ضرورت کا بھی ہر لباس دستیاب تھا۔ یہ لباس بھی قیام پاکستان سے قبل سے لے کر آج تک لاہور کے لوگوں کی زندگی کا اہم حصہ ہے۔ آج اس لنڈا بازار میں پہلے سے زیادہ رونق ہونے کی وجہ یہ ہے کہ لنڈے کے ان ملبوسات کو پہننے والے آج پہلے سے بھی زیادہ ہیں۔ دوسری اہم بات جو سماجی حوالے سے اس بازار سے مترشح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آج کے لاہور میں لنڈا بازار سے خریداری کرتے وقت مقامی کے ساتھ ساتھ انگریزی ملبوسات کو بھی برابر کی اہمیت حاصل ہے۔ قیام پاکستان سے قبل والی وہ سماجی خودداری جو انگریزی کی اترن خریدنے اور پہننے سے روکتی تھی، اب مفقود ہوتی چلی گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کی تحریر سے اس سماجی بدلاؤ کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔

لاہور کے سماج میں لنڈے کے ملبوسات کے ساتھ ساتھ دیگر ملبوسات بھی اس سماج کی عکاسی میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ کسی بھی سماج میں لوگوں کے پہناوے اس سماج میں بسنے والے افراد کے مذہب سے بھی میل کھاتے ہیں۔ مذہبی روایات اور مذہبی عقائد بھی اس خطے کے ملبوسات اور پھر ان کے ذریعے تشکیل پانے والے سماجی منظر نامے پر اثرانداز ہوتے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل لاہور میں چوں کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دیگر مذاہب کے لوگوں کی بھی کثیر تعداد موجود تھی۔ یہ لوگ اپنی مذہبی روایات اور مذہبی اقدار پر قائم رہتے ہوئے اپنے ملبوسات میں بھی اپنی مذہبی شناخت کو مقدم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ سماج میں یہی ملبوسات ان کی مذہبی شناخت بھی بن جاتے تھے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کا تذکرہ کرتے ہوئے، مختلف مذاہب کے لوگوں کے ان

ملبوسات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو سماج میں ان کو مذہبی شناخت بھی عطا کرتے تھے۔ اس ضمن میں طاہر لاہوری اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> ہندو عورتیں کالے صوف کے گھاگھرے پہنتی اور گوالوں کی عورتیں دھاری دار رنگین موٹے کپڑے کے گھاگھرے پہنتی تھیں۔ باقی عام عورتیں شلوار پہنتیں۔ دھاری دار سوتی کپڑے، سوسی، مارکین، ململ، لٹھہ اور ریشمی کپڑوں کا بھی عام رواج تھا۔ یہ سب کپڑے دو چار آنے گز کے حساب سے بکتے تھے۔ بہت بعد میں چابی کا لٹھہ، ڈی ون کا لٹھہ، چھبی کی ململ، بوسکی، کریپ، موہنا وغیرہ لاہور میں عام پہننے کا رواج تھا۔ مردوں میں خاص طور سے بوسکی کی قمیض اور لٹھے کی سفید شلوار، شوقین لوگ پہنتے تھے۔ (۲۷)

طاہر لاہوری نے یہاں مذہب کے ساتھ ساتھ قوم اور پیشے کے حوالے سے بھی ملبوسات کا ذکر کیا ہے، ہندو عورتوں کا کالے صوف کے گھاگھرے پہننا اور گوالوں کی عورتوں کا دھاری دار رنگین موٹے کپڑے کے گھاگھرے پہننا ان مذاہب اور اقوام کی سماجی پہچان بھی سامنے لاتا ہے۔ اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کے سماج میں اُس وقت عورتوں کے لیے گھاگھرے اور شلوار قمیض جب کہ مردوں کے لیے شلوار قمیض کا رواج عام تھا۔ مردوں میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جو تہمد بھی باندھتے تھے۔ عورتوں کے ملبوسات عموماً سماجی پہچان کا بڑا ذریعہ ہوتا ہے۔ لاہور میں چوں کہ ہندوؤں کی کثیر تعداد بھی موجود تھی، اس لیے اس سماج میں ہندوؤں کے ملبوسات کے رنگ بھی عام دکھائی دیتے تھے۔ ان کی خواتین بھی بازاروں میں خریداری وغیرہ کے لیے نکلتی تھیں اور یوں نکلنے کے لیے ملبوسات کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے پہناوے قیامِ پاکستان سے قبل کے لاہور کا سماجی منظر نامہ سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے سماج کی عکاسی کرتے ہوئے ان اہم سماجی عناصر کو خاص اہمیت دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

اردو آپ بیتی اور یادداشتوں نے لاہور کے سماج کی عکاسی کرتے ہوئے ان عناصر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کے سماج کا جائزہ لیا جائے تو اس سماج میں عورتوں کے لیے پردے کو جو اہمیت حاصل تھی، وہ اپنی مثال آپ تھی۔ پردہ اس شہر کی ایسی سماجی قدر کا درجہ حاصل کر چکا تھا کہ اس کے بغیر اس شہر کی سماجی اقدار کا تصور ہی محال تھا۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری کے مطالعے سے ظاہر ہوتا کہ اس شہر کی خواتین قیام پاکستان سے قبل پردے کا خاص اہتمام کرتی تھیں اور یہ اہتمام نہ کرنے والی خواتین سماج میں اچھی نگاہ سے نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ پردے کا اہتمام سماجی طبقات کو بھی سامنے لاتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کے لاہور میں پردہ اچھے گھرانے کی علامت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ اور متوسط طبقے کی خواتین اس کا خاص اہتمام کرتی تھیں جب کہ نچلے طبقے کی خواتین میں اس کا زیادہ رواج نہ تھا۔ جس کی وجہ سے سماجی تفریق بھی سامنے آتی تھی۔ پردے کے اہتمام اور اس سے سامنے آنے والی سماجی تفریق کی عکاسی اردو یادداشت نگاری میں یوں ملتی ہے:

> پردے کا رواج اس حد تک تھا کہ اونچے طبقے سے لے کر دوسرے طبقوں تک عورتوں نے کہیں آنا جانا ہوتا، تو تانگہ کی سیڑھیوں سے لگا دیا جاتا۔ عورتیں بیٹھ جاتیں تو تانگے کے پیچھے اور دونوں سائیڈوں کو چادروں سے ڈھانپ دیا جاتا، چادریں باندھ دی جاتیں۔ مسلمان عورتیں لٹھے کے دس دس گز کے کانوں والی ٹوپیوں والے برقعے پہنتیں، آنکھیں برقعے میں کروشیے کی کڑھائی والی لگائی جاتیں۔ گھونگھٹ کا بہت زیادہ رواج تھا۔ دلہنیں دودو سال دولہا سے گھونگھٹ نکالتی تھیں۔ سسر، جیٹھ اور گھر کے دوسرے بڑے افراد، محلے کے بڑے بوڑھوں سے گھونگھٹ عمر بھر نکالا جاتا۔ گھونگھٹ میں بھی شرم وحیا کا جو پہلو تھا وہ بھی اخلاقی طور پر معاشرے کا ایک روشن پہلو تھا،

بیویاں، ساس اور سسر کے سامنے خاوند سے بات نہیں کرتی
تھیں۔(۲۸)

اس بیان سے لاہور کے سماج میں پردے کی اہمیت کے ساتھ ساتھ گھریلو سطح پر شرم وحیا اور حجاب سے بھی سماجی اقدار کی عکاسی ہوتی ہے۔گھر کے وہ افراد جن سے نامحرم کا رشتہ ہوتے ہے، ان سے بھی حجاب کیا جاتا اور سماجی اقدار کو خاص طور پر ملحوظ خاطر رکھا جاتا تھا۔خود میاں بیوی میں ایک ایسا حجاب قائم رہتا تھا تو جو ایک دوسرے کے قریب لانے اور چاہت میں اضافہ کرنے کا باعث بنتا تھا۔ موجودہ عہد کے لاہور میں اگرچہ اب بھی معزز گھرانوں کی خواتین میں پردے اور حجاب کارواج ہے، لیکن جس قدر اہتمام قیام پاکستان سے قبل کیا جاتا تھا، وہ ختم ہو چکاہے۔ سماجی سطح پر اس بدلاؤ نے سماجی اقدار کی تشکیل اور بدلاؤ میں بھی اہم کردار ادا کیاہے۔اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری کا مطالعہ کرنے سے اس حقیقت سے آگاہی ہوتی ہے کہ آپ بیتی اوریادداشت نگاروں نے لاہور کے سماجی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلی کو خاص طور پر موضوع بنایاہے۔

لاہور نے تقسیم کے بعد سماجی سطح پر خاصی تبدیلی کا سامنا کیا۔ایک طرف مہاجرین کا سیلاب اس شہر کی طرف وارد ہوا تو دوسری طرف یہاں بسنے والے ہندو بھی ہندوستان سدھارے۔اس اکھاڑ پچھاڑ سے بہت سی سماجی اقدار تبدیلی کا شکار ہوتی چلی گئیں۔ تقسیم سے کچھ عرصہ بعد بھی لاہور میں پردے اور حجاب کو سماجی قدر کا درجہ حاصل رہا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کارواج اگرچہ کم ہوتا چلا گیا۔ تقسیم کے بعد کے چند سالوں میں سماجی سطح پر خاصا انتشار برپا رہا، لوگوں کی آمدورفت اور پھر آبادکاری کے مسائل نے اس شہر کو خاص طور پر متاثر کیا لیکن اس دوران میں بھی مقامی لاہور کی خواتین پردے اور برقعے کا خاص اہتمام کرتی تھیں، یہ اس شہر کی پہچان تھا۔ قیام پاکستان کے بعد کے ابتدائی سالوں میں اس شہر کی مقامی خواتین کی پہچان بھی اسی پردے اور برقعے سے ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی لڑکی یا خاتون بغیر پردے کے دکھائی دیتی تو اسے سماج میں اچھی نگاہ سے نہیں

دیکھا جاتا تھا۔ انیس ناگی اپنی آپ بیتی "ایک ادھوری سرگزشت" میں قیام پاکستان کے بعد کے چند سالوں کے لاہور کے سماجی منظر نامے کی عکاسی کرتے ہوئے اس سماجی عنصر کو یوں واضح کرتے ہیں:

> اس زمانے میں عورتیں خال خال ہی سڑکوں پر نظر آتی تھیں۔ اگر کہیں دکھائی بھی دیتیں تو وہ سیاہ برقعوں میں اس طرح ملفوف ہوتیں کہ انہیں دیکھ کر طبیعت گھبرانے لگتی۔ وہ برقعہ پوش لڑکیاں اور عورتیں جو پردے کی قید سے کچھ آزادی چاہتیں، وہ نقاب کا ایک حصہ منہ پر لپیٹ کر آنکھیں برہنہ کر لیتیں۔ ان کی متحرک اور بے چین آنکھیں دیکھنے والے کے اندر تجسس پیدا کرتیں کہ ان آنکھوں کے نیچے کیسا چہرہ مہرہ ہے؟ البتہ کہیں کہیں بے پردہ لڑکیاں بھی نظر آتیں، جن پر لوگ آوازے کستے۔(۲۹)

انیس ناگی کی آپ بیتی کے اس اقتباس سے قیام پاکستان کے فوراً بعد کے لاہور کا سماجی منظر نامہ سامنے آتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک طرف پردہ اور برقعہ لاہور کی مقامی خواتین کی شناخت تھا تو دوسری طرف قیام پاکستان سے قبل والے پورے برقعے اور پردے کے خاص اہتمام میں بھی تبدیلی کا عمل شروع ہو چکا تھا۔ وہ برقعہ اور پردہ جس میں عورت مکمل طور پر ملفوف ہوتی تھی، اس کی جگہ اب ایسے نقاب نے لینی شروع کر دی تھی جس میں آنکھیں نہیں ڈھانپی جاتی تھیں۔ یوں ایک طرف تو عورت ایسے نقاب کی وجہ سے اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کرتی تھی تو دوسری طرف آنکھوں کے نہ ڈھانپنے کی وجہ سے دیکھنے والوں کے تجسس میں اضافہ کرتے ہوئے، خاص نظروں کا نشانہ بھی بنتی تھی۔ گویا سماج میں ایسی خواتین "صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں" کی عملی تصویر بنی ہوتی تھیں۔ وہ لڑکیاں جو بے پردہ ہوتی تھیں، انھیں سماج میں معزز گھرانوں کی لڑکیاں نہیں سمجھا جاتا تھا، یہی وجہ ہے کہ ان پر آوازے کسنا اور چھیڑنا عام رواج بن چکا تھا۔ انیس ناگی کی اس سرگزشت سے لاہور کے سماج کی وہ تصویر سامنے آتی ہے جو بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے لاہور

میں پایا جاتا تھا۔ یہ ایسا سماج تھا جس کی سماجی اقدار میں پردے اور حجاب کا عمل بھی سماجی بدلاؤ کا شکار ہو رہا تھا۔ پردے اور برقعے کے قدیم رواج کی جگہ برہنہ آنکھوں والا نقاب لے رہا تھا اور سماجی سطح پر بھی اس تبدیلی کے اثرات سامنے آ رہے تھے۔

لاہور کے سماج کے کئی رنگ ایسے ہیں جو خاص مواقع پر سامنے آتے ہیں۔ یہ سماجی رنگ محبت، خلوص، بھائی چارے اور باہمی ہمدردی سے مزین ہیں ۔ لاہور کے لوگ زندہ دل لوگ ہیں۔ تقسیم کے بعد کے سماجی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ تقسیم کے عمل میں سب سے زیادہ متاثر لاہور کے لوگ ہوئے تھے۔ ہندوستان کی سرحد کے قریب ہونے اور مرکزی شہر ہونے کی وجہ سے ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کی کثیر تعداد نے اسی شہر کا رخ کیا تھا۔ دوسری طرف اس شہر میں قیام پاکستان سے قبل ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد آباد تھی ۔ یہ ہندو اس سماج کا حصہ بن چکے تھے۔ ان کی مذہبی رسومات، گھریلو اقدار اور سماجی رویوں کی وجہ سے لاہور کے سماج کا نقشہ ان کے بغیر نامکمل رہتا تھا۔ تقسیم ہند کے عمل نے ہندوستان سے مسلمانوں کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا تو لاہور اور دیگر خطوں کے ہندو بھی یہاں سے ترک سکونت کرنے پر مجبور ہوئے۔ جس کی وجہ سے سماجی سطح پر خاصا انتشار پیدا ہوا۔ دوسری طرف لاہور کی طرف رخ کرنے والے مہاجرین جس مفلوک الحالی کا شکار تھے اور جس طرح لٹے پٹے آ رہے تھے ، یہاں ان کا کوئی نہ تھا۔ ایسی صورت حال میں لاہور والوں نے اپنے وہ سماجی بھائی چارے کے رنگ دکھائے جو ایسے مواقع پر ہی سامنے آتے ہیں۔ لاہور کے باسیوں نے اس مشکل وقت میں جس سماجی بھائی چارے اور جن حسین سماجی روایات اور اقدار کا اظہار کیا، ان کی عکاسی اے حمید کی آپ بیتی "یادوں کے گلاب" میں یوں ملتی ہے:

> ہندوستان مسلمانوں کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ صرف پاکستان ہی ایک
> ایسی جگہ تھی جہاں ہمیں امان اور تحفظ کی فضا مل رہی تھی۔ ہماری ٹرین
> لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۶ پر آ کر رکی ۔ مسلم لیگی رضا

کاروں نے مہاجروں کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ ہر ایک سے پوچھ رہے تھے:"
آپ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں جائیں گے یا مہاجر کیمپ میں ؟"
لاہور کے شہری ہر پلیٹ فارم پر دال کی دیگیں اور روٹیوں سے بھرے
ہوئے چھابے لیے، پناہ گیروں کی خدمت کر رہے تھے۔ (۳۰)

لاہور کے باسیوں کی یہ زندہ دلی اور سماجی بھائی چارہ قیام پاکستان کے بعد خوب نکھر کر سامنے آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ لاہور میں اگرچہ کثیر تعداد میں ہندو آباد تھے لیکن لاہور والوں نے فسادات کے دور میں ان کی بھی خوب حفاظت کی ۔ تاریخ کا مطالعہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقسیم کے عمل میں ہندوستان کے مسلم اکثریت اوراقلیت والے ہر شہر میں فسادات ہوئے اور مسلمانوں کو لوٹا گیا، ان کے اموال اور جانیں تباہی کا شکار ہوئیں لیکن لاہور کے باسیوں نے بدلہ لینے کی بجائے ہندوؤں کو یہاں سے آرام سے رخصت ہونے دیا۔ اگرچہ ہندوستانیوں کے عمل کے ردعمل میں یہاں بھی چند واقعات ہوئے لیکن فسادات کی وہ فضا برپا نہ ہوئی جو ہندوؤں اور سکھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں پر برپا کی تھی ۔اس حوالے سے احسان دانش کی آپ بیتی " جہانِ دانش " بھی ہماری خوب رہنمائی کرتی ہے ۔ جس میں وہ فسادات کے دنوں میں لاہور کے باسیوں کے سماجی برتاؤ کو مثبت انداز میں پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں اس فضا میں بھی اچھے اور برے لوگوں کے کارنامے دیکھ رہا تھا۔ جو متعصب ہندو جاتا وہ تمام قیمتی سامان کیمپ میں لے جاتا اور کاٹھ کباڑ رکھ کر آگ لگا دیتا تاکہ کوئی چیز دوسروں کے کام نہ آئے اور جو شریف ہندو تھے وہ نقدی اور زیور تو لے جاتے مگر کا سامان کسی غریب یادوست کے سپرد کر جاتے یا پھر مکان کو قفل کے بغیر چھوڑ جاتے تاکہ سامان کسی نہ کسی کے کام آجائے۔ حالانکہ میرے محلے میں بڑے بڑے جری اور جیالے لوگ رہتے تھے جو لاہور بھر میں بہادر

اور لڑاکا مشہور تھے مگر میں پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتا ہوں کہ
میرے محلے میں کوئی ہندو قتل نہیں ہوا تھا اور کوئی عورت بے آبرو
نہیں کی گئی تھی۔(۳۱)

احسان دانش نے فسادات کے دنوں کے لاہور کا حقیقی سماجی نقشہ پیش کیا ہے۔ انھوں نے ہندوؤں کے دونوں طرح کے لوگوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سماج کا وہ حقیقی چہرہ پیش کیا ہے جس میں مخلص اور متعصب دونوں طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور کے مسلمان گھرانوں کا ہندوؤں کے ساتھ وہ سماجی برتاؤ بھی سامنے آتا ہے جس میں ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت فسادات کے دنوں میں بھی کی گئی تھی۔

اے حمید کی آپ بیتی "یادوں کے گلاب" قیام پاکستان کے بعد کے چند سالوں کے لاہور کا حقیقی سماجی منظر نامہ سامنے لاتی ہے۔ لاہور کے سماج کا یہ وہ دور تھا جب فسادات کے اثرات کسی حد تک قائم ہو چکے تھے اور ملک میں جمہوریت کو پروان چڑھانے والے بھی رستے سے ہٹ چکے تھے اور جنرل ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر جمہوریت کی رہی سہی بساط بھی لپیٹ دی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب سماجی اور معاشی سطح پر اصلاحات کا ڈول بھی ڈالا گیا تھا۔ لاہور کے سماجی منظر نامے میں اگرچہ تبدیلیاں ہوئی لیکن آج کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس وقت کے لاہور کا سماجی منظر نامہ خاصا مختلف تھا۔ اس کی ایک مثال لاہور کے مال روڈ سے ملتی ہے۔ مال روڈ کو لاہور کی سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور معاشی حالت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ آج لاہور کا مال روڈ اپنی ایک خاص سماجی پہچان رکھتا ہے، لیکن ایوب خان کے دور میں لاہور کے مال روڈ کی سماجی حوالے سے کیا حیثیت تھی اور یہاں آنے والے کن سماجی رویوں کے حامل تھے، انیس ناگی اپنی آپ بیتی "ایک ادھوری سرگزشت" میں اس کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

اس زمانے میں مال روڈ اتنی کشادہ سڑک نہیں تھی۔پندرہ بیس فٹ
چوڑی تھی، جس کے دونوں جانب میلی میلی سی روشنیاں اور مین سڑک
کے دائیں بائیں کچی سڑکیں، جہاں شام کو کارپوریشن کی لاری چھڑکاؤ

> کرتی تھی۔ٹریفک میں تانگہ ، کاریں اور سائیکل شامل ہوتیں۔فٹ پاتھ پر کوئی دھکم پیل نہ ہوتی اور نہ میلے کپڑے پہنے ہوئے دیہاتیوں کے انبوہ ہوتے ۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بیشتر راہرو ایک دوسرے کو جانتے اور سر کے اشاروں سے ایک دوسرے کی موجودگی کی تصدیق کرتے۔(۳۲)

انیس ناگی نے جس مال روڈ کا نقشہ کھینچا ہے ، وہ اُس دور میں سماجی حوالے سے خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اُن کی آپ بیتی کے اقتباس میں صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے راہرو ایک دوسرے کو سر کے اشاروں سے موجودگی کا احساس دلاتے تھے ، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سماجی سطح پر لوگوں کے روابط خاصے مضبوط تھے۔معاشی حالت اگرچہ زیادہ بہتر نہ تھی لیکن پھر بھی اس سماج میں بسنے والے جسمانی صفائی ستھرائی کے ساتھ ساتھ باطنی پاکیزگی کے بھی حامل تھے۔ یہ وہ سماج تھا جو ایک دوسرے کی پہچان رکھتا تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتا تھا، گویا ایک دوسرے کے بغیر اپنی زندگی گزارنا فضول سمجھا جاتا تھا۔ جب کہ موجودہ عہد کے لاہور میں یہ سماجی بھائی چارہ اور سماجی خلوص ناپید ہو چکا ہے ۔ لاہور کے بارے میں لکھی گئی آپ بیتیوں میں ان سماجی اقدار کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں ملتی ہے جو پرانے لاہور کی طرۂ امتیاز تھیں۔

ایوب خان کے دور کا اہم واقعہ ۱۹۶۵ء کی جنگ ہے۔اس جنگ نے اگرچہ دونوں ممالک کو معاشی طور پر نقصان پہنچانے کے علاوہ کوئی اہم کارنامہ انجام نہ دیا تاہم یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان جو پاکستان کو مٹانے کے خواب دیکھ رہا تھا، اسے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ پاکستان کو مٹانا ناممکن ہے ۔ طاقت اورافرادی قوت میں برتری رکھنے کے باوجود ہندوستان کو جس طرح اس جنگ میں منہ کی کھانا پڑی ، اس نے ایک طرف ہندوستان کو اپنی فوجی طاقت کی اصلیت سے آگاہ کر دیا تو دوسری طرف پاکستان اور خاص طور پر لاہور کے لوگوں کی زندہ دلی بھی دیکھنے میں آئی۔لاہور کے سماجی منظر نامے میں لاہوریوں کی یہ زندہ دلی صدیوں سے چلی آرہی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خان نے لاہور کے

باسیوں کو " زندہ دلانِ لاہور" کا خطاب بھی دیا۔ لاہور کے سماج میں زندہ دلی آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے تاہم ایوب خان کے دور میں ہونے والی پاک بھارت جنگ میں اس زندہ دلی کے سماجی مظاہر عام دیکھنے کو ملتے تھے ۔لاہور والوں کے لیے یہ جنگ خوف اور وحشت کی بجائے ایک تفریح کا سامان تھی ۔ لاہور جو سب سے زیادہ اس جنگ سے متاثر ہو رہا تھا، وہاں کے باسی اس جنگ سے لطف اندوز ہو رہے تھے ۔ اس شہر کے باسی اس جنگ کو سماجی تناظر میں کس طرح دیکھ رہے تھے، اس کی عکاسی رانا نذرالرحمٰن کی آپ بیتی " صبح کرنا شام کا" میں یوں ملتی ہے:

> حملہ ہونے پر عام طور پر شہروں، قصبوں اور دیہاتوں پر خوف وہراس کی فضا غالب آجاتی ہے، لیکن اس کے برعکس لاہور میں بڑے عجیب نظارے دیکھنے میں آئے ۔ فضا میں پاکستانی اور بھارتی لڑاکا طیاروں کی آپس میں جھڑپیں ہوتیں تو شہری چھتوں پر چڑھ کر بوکاٹا، بوکاٹا کے نعرے لگاتے ۔ جیسے طیارے آپس میں نہیں ٹکرا رہے، پتنگوں کا پیچ پڑا ہوا ہے ۔ حملے کی خبر سن کر لاہوریے بے اختیار سائیکلیں اٹھا کر واہگہ کی طرف چل پڑے ۔ (۳۴)

لاہور کے باسیوں کی یہ زندہ دلی اپنی مثال آپ ہے ۔ جنگ جو سماجی انتشار کا سبب بنتی ہے۔ سماجی سطح پر تباہی لاتی ہے، لاہور جنگ کا براہ راست نشانہ تھا اور اس کے باسی اس جنگ کا پہلا لقمہ بن سکتے تھے ، لیکن ان کی زندہ دلی کے جو مظاہر اس جنگ کے دوران میں دیکھنے کو ملتے ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہے ۔ یہ ان سماجی اقدار کی دین ہے جو صدیوں سے اس شہر میں چلی آرہی ہیں۔ یہ شہر اگرچہ مختلف حکمرانوں کے حملوں کا بھی شکار رہا لیکن تاریخ، اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ بتاتا ہے، اس شہر کے لوگوں نے ان غیر معمولی حالات میں بھی اپنی زندہ دلی اور سماجی برتری کے ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں، جو اس شہر کے سماجی منظر نامے کی خاص پہچان بن چکے ہیں۔

لاہور کا سماج اگرچہ بہترین سماج تھا اوراب بھی بہت سے خطوں کی نسبت اس سماج کی اپنی اقدار اور روایات خاصی بہتر ہیں تاہم منفی سرگرمیاں اور منفی عناصر بھی دیگر سماجوں کی نسبت اس سماج میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ عناصر شروع ہی سے اس سماج کا حصہ ہیں اور اپنی کارستانیاں جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اردو آپ بیتی اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے سماج کے دیگر امور اور عناصر کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ انتہائی غیر جانب داری سے کام لیتے ہوئے ان منفی عناصر اور سماج میں ان کی سرگرمیوں کو بھی بیان کیاہے، جس سے لاہور کے سماج کے یہ عناصر بھی کھل کر سامنے آتے ہیں۔

لاہور کے سماج کے منفی عناصر میں اہم وہ کلرک، منشی اور اس قبیل کے دیگر لوگ ہیں جو مجبور لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے اور بدعنوانی کے مرتکب ہونے کو معیوب سمجھنے کی بجائے اپنی زندگی کا حصہ بنا چکے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ ہر جگہ پائے جاتے ہیں، لیکن عدلیہ اورانتظامیہ کا گڑھ ہونے کی وجہ سے یہاں سائلین کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ ان سائلین سے لوٹ مار کرنے والے یہ عناصر اس قدر سرگرم ہیں کہ بدعنوانی سے بھی باز نہیں آتے اور مجبوروں کی مجبوری کو اپنی ناجائز آمدن میں اضافے کا ذریعہ بناتے چلے جاتے ہیں۔ایسی ہی صورت حال کا سامنا لاہور جانے والے ان لوگوں کو پڑتا ہے جو مختلف عدالتی امور کے حوالے سے لاہور جاتے ہیں یا لاہور ہی کے مقیم ہیں۔ سید مینو چہر اپنی آپ بیتی "میرے شب وروز" میں لاہور کے ایسے عناصر کا ذکر کرتے ہوئے ان کے طریقہ واردات کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> جب ضمانتیں ہو جاتی ہیں تو فی ضمانت ناموں کی تصدیق بھی آپ نے کرنی ہوتی ہے۔ یعنی انہیں منظور کرنا یہ ایک میکانکی عمل ہے مگر ہم فی ضمانت نامہ دس روپے لیتے ہیں۔ اوسطاً پچاس ضمانت نامے تصدیق ہوتے ہیں۔اس طرح سے ہم پانچ سو روپے روز وصول کرتے ہیَ یہاں آپ ہوں یا کوئی، یہ تو ہر حالت میں ہونا ہی ہے۔ ان اوسطاً پانچ سو

روپوں میں آدھے اہلکاروں کے ہوتے ہیں اور آدھے ہم افسر جلیس کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ کم از کم لاہور میں تو عرصہٗ دراز سے یہی ہو رہا ہے۔ کوئی کرپشن نہیں کوئی مہربانی نہیں۔ یہ رقم ایک طرح کی نذر نیاز کی طرح ہے دینے والے نے ہر صورت دینی ہے اور ہم نے وصول کرنی ہے۔(۳۴)

لاہور کے سماج کے یہ منفی عناصر ایک تو خود اس بدعنوانی کے قعرِ مذلت میں پڑے ہوتے ہیں تو دوسری طرف لاہور میں آنے والے نئے افسران کو بھی اس بدعنوانی کی راہ دکھاتے ہیں۔ یوں یہ سلسلہ آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے جو سماج کے لیے ناسور کا درجہ رکھتا ہے۔ ایسے بدعنوان اور کرپٹ لوگ مختلف دفاتر کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر بھی متحرک ہوتے ہیں۔ سرکاری املاک کو غیر قانونی اور ناجائز طور پر اپنے قبضہ میں کرنا اور اس کے بدلے ہنستے بستے اور خوب صورت شہر کو بد صورت بناتے چلے جانا ان لوگوں کا وطیرہ ہوتا ہے۔ ایسے بدعنوان اور سماجی سطح پر برائی کے منبع عناصر کی عکاسی کرتے ہوئے شاہد حمید اپنی آپ بیتی میں ان کا ایک اور پہلو یوں نمایاں کرتے ہیں :

لوہاری گیٹ سے آگے موری گیٹ آتا ہے۔ دونوں کے درمیان سرکلر روڈ کی مغربی جانب پہلوانوں کے اکھاڑے ہوتے تھے۔ سرکلر روڈ اور قدیم شہر کے مابین گھاس کے خوب صورت قطعات تھے جنھیں ایک چھوٹی سی نہر سیراب کرتی تھی۔ یہ راجباہ اور قطعات قیام پاکستان کے بعد بھی کافی عرصہ تک قائم رہے اور شہر کی فضا کو آلودہ ہونے سے بچاتے رہے۔ آہستہ آہستہ ان قطعات پر بے ضمیر اور مطلب پرست لوگوں نے قبضہ جمانااور دکانیں تعمیر کرنے کا دھندہ شروع کر دیا۔(۳۵)

مغلوں کے دورِ حکومت میں لاہور کی تزئین و آرائش اور اس شہر کی خوب صورتی کو بحال رکھنے اور بڑھانے کے حوالے خاص اقدامات کیے گئے۔ کھلی سڑکیں، بلند و بالا عمارتیں، باغات اور سیر گاہیں اس شہر کا ایسا حسن ہیں جو صدیوں سے قائم چلا آرہا تھا لیکن موجودہ عہد میں سرکاری املاک کو اپنی ملکیت سمجھنے والے مفاد پرست عناصر نے ان پر قبضہ کرنے اور اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنے کی وجہ سے اس شہر کے حسن کا تباہ کرنے کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر بھی خاصی بے چینی کو فروغ دیا ہے۔ اردو آپ بیتیوں میں لاہور کے سماج کے اس منفی رخ کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں کی گئی ہے۔

لاہور کے سماج کا ایک اہم پہلو طبقاتی تفریق ہے۔ یوں تو طبقاتی تفریق دنیا کے ہر سماج میں پائی جاتی ہے۔ ہر سماج میں کچھ لوگ اعلی طبقے سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ متوسط اور نچلے طبقے سے۔ اعلیٰ طبقے کے عادات اور اطوار دیگر طبقات سے خاصے مختلف ہوتے ہیں۔ لاہور کے سماج میں بھی یہ طبقاتی تفریق پائی جاتی ہے۔ یہ طبقاتی تفریق موجودہ عہد کی پیداوار نہیں ہے بلکہ استعماریت کے عہد میں اس میں بہت اضافہ ہوا تھا۔ یہاں تک کہ تعلیمی اداروں میں بچوں کے داخلے کے وقت بھی اس طبقاتی تفریق کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس کی ایک مثال شاہد حمید کی آپ بیتی "گئے دن کی مسافت" سے ملتی ہے۔ وہ سماج میں پائی جانے والی اس طبقاتی تفریق کا ذکر کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں گورنمنٹ کالج لاہور کی مثال پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> گورنمنٹ کالج لاہور اس زمانے میں امرا کا کالج سمجھا جاتا تھا، اس میں غریب آدمی کا بیٹا داخلے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کا پرنسپل عموماً انگریز ہوتا تھا اور یہ اتنا طاقت ور ہوتا تھا کہ اس کے نامزد امیدوار بلا امتحان اور انٹرویو پی سی ایس (پنجاب سول سروس) بن جاتے تھے۔(۳۶)

جب سرکاری اداروں میں طبقاتی تفریق اس حد تک بڑھ جاتی ہے، تو سماج کا عام فرد سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ لاہور کے اس اہم سرکاری ادارے کے حوالے سے ہی دیکھا جائے تو سماج کی

اس طبقاتی تفریق اور پھر آگے نسل در نسل اس تفریق کے بڑھے جانے کی حقیقت سامنے آتی ہے۔ وہ غریب جس نے ساری عمر امراء اور اعلیٰ طبقے کی نوکری کی اور ان کی خدمت کرتا چلا آیا، اب جب اس کو اپنی اگلی نسل کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تو یہاں بھی اسے اس سماجی تفریق کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس میں اس کی اپنی عمر گزری ہوتی ہے۔ نتیجے کے طور پر ان اہم اداروں میں پڑھنے والے امراء کے بچے اس غریب کی نئی نسل کے حاکم بن کر ابھرتے ہیں اور یوں سماجی استحصال کا یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا چلا جاتا ہے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے بارے میں اپنی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، اس سماجی تفریق اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سماجی استحصال کی قلعی خوب کھولی ہے۔ یہ لاہور کے سماج کا وہ منفی پہلو ہے جو ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں سامنے آتا ہے۔

لاہور کی سماجی صورت حال میں لاہور کے باسیوں کے مشاغل کا خاص عمل دخل ہے۔ قدیم لاہور کے باسی مختلف شوق رکھتے تھے۔ ان میں پہلوانی کے ساتھ ساتھ دیگر بہت سے شوق بھی پائے جاتے تھے مثلاً مختلف پرندے پالنا اوران کے مقابلے وغیرہ کروانا۔ لاہور کے اس سماجی منظرنامے میں ان مشاغل نے لوگوں کے روزمرہ اوقات میں بھی تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ قدیم لاہور کے لوگ سردیوں کی صبح جس طرح بیدار ہوتے اور اپنے تنگ مکانوں سے نکل کر مال روڈ اور دیگر سڑکوں کا رخ کرتے تھے، وہ ان کے سماجی روابط میں مضبوطی کے ساتھ ساتھ اس سماجی منظرنامے کی عکاسی بھی کرتا ہے جو قدیم لاہور میں پایا جاتا تھا۔ یہ سماج ایک ایسا سماج تھا جس میں ہر طرح کے مشاغل بھی تھے اور لوگ کے درمیان سماجی روابط بھی موجود تھے۔ مستنصر حسین تارڑ نے لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتیں تحریر کرتے وقت ان مشاغل کا تذکرہ بڑی صراحت کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لاہور کی سماجی صورت حال بیان کرتے ہوئے پرانے لاہور کے لوگوں کے مشاغل کا تذکرہ یوں کرتے ہیں:

> سردیوں کی سویروں میں اور گرمیوں کی شاموں میں اہل لاہور اپنے
> تنگ اور سورج کی روشنی سے محروم، گیلے سیلے گھروں کی کوٹھڑیوں میں

سے نکلتے اور یہاں رونقیں لگ جاتیں، اس نہر کے کنارے پیپل، برگد اورآم کے شجروں کے سائے میں میلے لگ جاتے۔ بوڑھے چوپٹ کھیلتے، بٹیر باز اپنے بٹیر پنجروں سے نکال کر انہیں نہلاتے، کبوتر باز اپنے من پسند کبوتروں کو پرواز کی مشق کرواتے۔ جگہ جگہ پرندوں کے پنجرے نہر کنارے اور پرندے چہکتے اور کوکتے۔ پہلوان ڈنڈ بیٹھکیں لگاتے اور باغ میں اپنے مخصوص اکھاڑوں میں زور کرتے۔ اپنے پٹھوں کو داؤ پیچ سکھاتے اورجوان ہوتے لاہوری بچوں کو ہدایت کی جاتی کہ ان پہلوانوں کی قربت سے گریز کریں کہ ان میں سے کچھ نہ بٹیر باز اور نہ کبوتر باز بلکہ کچھ اور باز ہوتے۔ چنانچہ منڈے ان سے پرے پرے رہتے۔(۳۷)

مستنصر حسین تارڑنے لاہور کے سماج کا جو نقشہ کھینچاہے وہ اگرچہ اب ناپید ہو چکاہے لیکن اب بھی، بزرگ اور قدامت پرست گھرانوں میں یہ سماجی رویے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ جدید عہد کی تہذیبی اور سماجی اقدار نے دیگر خطوں کے ساتھ ساتھ لاہور کے خطے کو بھی متاثر کیاہے۔ جس کی وجہ سے اب شہر لاہور کے باسیوں کے مشاغل اور شوق میں کافی تبدیلی واقع ہو گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑنے جس لاہور کا سماجی منظر نامہ بیان کیاہے، وہ لاہور اب بہت پیچھے رہ گیا ہے۔ جدید لاہور مشاغل کے اعتبار سے بہت آگے جا چکاہے۔

لاہور کے سماج میں ان سراؤں کا عمل دخل بھی بہت زیادہ ہے جو مختلف لوگوں اور سلاطین نے مختلف ادوار میں تعمیر کروائیں تھیں۔ چوں کہ ان سراؤں کے پیچھے ایک پورا سماجی منظر نامہ اور اس کے اہم مقاصد میں سماجی فلاح وبہبود کواولیت ہوتی ہے، اس لیے ان سراؤں کی تعمیر اور بعد میں ان کے استعمال سے بھی لاہوری سماج کے کئی رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان سراؤں میں جو سہولیات فراہم کی جاتی تھیں، وہ لاہوری سماج کی عکاسی کرتی تھیں۔ لاہور کے رہنے والے ان سراؤں کو سماجی

ورثے کے طور پر استعمال کرتے تھے اور اس کی سہولیات سے بھی مستفید ہوتے تھے۔ ایسی ہی ایک سرائے سلطان ٹھیکیدار کا تذکرہ کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ لاہور کے سماج کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> اس سرائے کے باغ، باغیچے اور متعدد کنویں جن کا پانی گرمیوں میں سرد ہوتا تھا، جیسے برف کا بنا ہوا اور اہلِ لاہور ان کنوؤں کی چرخڑیاں گھما گھما کر ان میں سے پانی نکال کر "ہزاروں سبوچوں" میں بھر کر اپنی کوٹھیوں اور گھروں میں لے جاتے اور سلطان کو دعائیں دیتے۔ عام مسافروں کے لیے کوٹھڑیاں تعمیر کی گئی تھیں لیکن صاحبان انگریز اور ذی عزت مسافروں کے لیے مکلف مکان بنائے گئے۔(۳۸)

مستنصر حسین تارڑ نے لاہور کی اس سرائے کا جس طرح نقشہ کھینچا ہے، اس سے سماجی حوالے سے کئی چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان سراؤں میں میسر سہولیات صرف مسافروں کے لیے نہ تھیں بلکہ خیر خواہی کے لیے عام عوام کو بھی ان سے استفادے کی اجازت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں پر موجود کنوؤں سے عام لوگ بھی پانی بھر کر اپنی ضروریات پوری کرتے تھے۔ دوسری اہم بات جو سماجی حوالے سے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ ان سراؤں کی تعمیر کے وقت بھی انگریز اور دیگر ذی عزت لوگوں کو طبقاتی حوالے سے اعلیٰ سمجھتے ہوئے ان کے لیے الگ مکان تیار کیے جاتے تھے۔ انگریز سے مرعوبیت کا یہ رجحان نوآبادیاتی عہد میں خاصا توانا تھا۔ جس خطے یا علاقے میں کسی انگریز افسر کا گزر ہونا ہوتا تھا، وہاں کے لوگوں کو باقاعدہ اس کی اطلاع دی جاتی تھی اور اس کی آؤ بھگت کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ اسی نقطہ نظر سے ان سراؤں میں بھی انگریز افسران کے لیے الگ مکلف مکانات تعمیر کیے گئے تھے۔ یہ امر نوآبادیاتی عہد کی سماجی طبقاتی تفریق کو واضح کرتا ہے۔

لاہور کے سماج کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شہر صرف خوش خوراکی اور خوش لباسی کی وجہ سے ہی اپنی پہچان نہیں رکھتا بلکہ اس شہر میں خوش گلو لوگوں کی تعداد بھی کچھ کم نہ تھی۔ ایک

سے بڑھ کر ایک مغنیہ اور ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ پائے کا خوش گلو انسان اس شہر میں بستا تھا جو اپنے فنِ گائیکی کے ذریعے لوگوں محظوظ بھی کرتے تھے اور اپنی تہذیب و ثقافت اور سماجی اقدار کو فروغ بھی دیتے تھے۔ اس مقصد کے لیے لاہور میں باقاعدہ مراکز تھے۔ یہ مراکز لوگوں کی ذاتی ملکیت ہوتے تھے لیکن وہاں عوام و خاص کو آنے کی اجازت ہوتی تھی۔ فن گائیکی کے شہ سوار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے۔ اس فن کے قدردان بھی لاہور کے سماج میں بہت پائے جاتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی یادداشتوں " لاہور آوارگی" میں ایسے سماجی مراکز کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وہ نشان بھی ملیامیٹ ہوگئے جہاں بڑے غلام علی خان آیا کرتے تھے، فریدہ خانم جس کوٹھے پر بیٹھ کر غزل سرا ہوتی تھی۔ یہاں فلم سٹار نادرہ کا کوٹھا ہوا کرتا تھا، مہدی حسن، غلام علی بھی آتے جاتے رہتے تھے۔ یہیں کہیں برصغیر کی نامور کلاسیکی گلوکارہ عنایت بھائی ڈھیروالی کا گھر تھا جو ٹھمری اور دادرے کی گائیکی میں بے مثال تھی۔خواجہ سلطان ،خواجہ خورشید انور کے چھوٹے نامور وکیل بھائی، ہمیں عنایت بائی کے ریکارڈ گراموفون کو چابی دے کر سنوایا کرتے تھے اور جیسے کلکتے کی آرمینیا نژاد گوہر جان ہر گیت کے آخر میں اپنا تعارف کرواتی تھی کہ گوہر جان کلکتے والی تو اسی روایت میں ۔۔۔ دادرے کے آخر میں عنایت بائی ڈھیری والی۔(۳۹)

مستنصر حسین تارڑ نے لاہور کے ان مراکز کا ذکر کرتے ہوئے ان کی معدومیت کو بھی واضح کیاہے۔ قدیم لاہور کے سماج میں ان گائیکی کے مراکز کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ دوسرا ان مراکز کا جائزہ لیا جائے تو یہ صرف گائیکی کے مراکز ہی نہ تھے بلکہ یہاں وضع داری، رکھ رکھاؤ اور تہذیب وآداب کا چلن بھی عام تھا جو یہاں کی سماجی صورت حال کو واضح کرتے ہیں۔ اگرچہ جدید عہد کے لاہور

میں بھی فن گائیکی اوراس طرح کے دیگر مراکز موجود ہیں، لیکن ان میں اب وہ پہلے جیسا سماجی رکھ رکھاؤ، وضع داری اور تہذیبی اقدار باقی نہیں رہیں۔

سماج کا مطالعہ سماج میں ہونے والے مختلف اکٹھ اور رسومات کو نظر انداز کر کے ممکن نہیں ہے۔ کسی بھی سماج میں ہونے والی مختلف تقریبات، سماجی عناصر کے اجتماع کی وجہ سے سماج کے حقیقی روپ کو پیش کرتی ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کی تقریبات ایسے سماجی اجتماعات ہوتے ہیں جن میں سماجی اور تہذیبی اقدار کا چلن عام دکھائی دیتا ہے۔ عام طور پر سماجی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار کا کھوج لگانے کے لیے کسی بھی سماج میں منعقد ہونے والی شادی بیاہ کی تقریبات کو خاص اہمیت دی جاتی ہے۔

شادی بیاہ کی تقریبات سماج کے ساتھ ساتھ مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کی رسومات کی بھی عکاسی کرتی ہیں۔ خاص طور پر وہ سماج جن میں ایک سے زیادہ اقوام اور مختلف مذاہب کو ماننے والے افراد کثیر تعداد میں مقیم ہوں، وہاں کی سماجی اقدار میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کا اشتراک دکھائی دیتا ہے۔ لاہور کا سماج بھی ایک ایسا ہی سماج ہے جس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کا اشتراک ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس سماج میں ہونے والی شادی بیاہ کی تقریبات مختلف اقوام اور مذاہب کی سماجی اقدار کے اشتراک کا عملی نمونہ پیش کرتی ہیں۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشت نگاری کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے تخلیق کاروں نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے اس سماج کے ان پہلوؤں کی عکاسی بھی بڑے جاندار انداز میں کی ہے۔ ان تخلیق کاروں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ لاہور میں گزارا ہے۔ زندگی کے اس عمل کے دوران میں انھوں نے نہ صرف لاہور کی سماجی زندگی کو قریب سے دیکھا بلکہ خود اس کا تجربہ بھی کیا۔ اپنے خاندان اور دیگر افراد کی شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت بھی کی اور بعد میں جب آپ بیتی لکھنے بیٹھے یا اپنی یادداشتوں کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنانے کی طرف راغب ہوئے تو زندگی کے یہ تجربات ان کے تخلیقی تجربات میں ڈھلتے چلے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی ان سماجی رسومات اور سماجی اجتماعات کی عکاسی بڑے واضح انداز میں ملتی ہے۔ آپ بیتی اور

یادداشت نگاروں نے ان اجتماعات کے کھانوں ، رسوم اور دیگر سماجی اقدار کو بیان کرتے ہوئے حقیقت نگاری کا عمدہ ثبوت پیش کیاہے ۔ ان آپ بیتیوں اوریادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتاہے کہ قدیم عہد کا لاہور ان سماجی اقدار کے حوالے سے بھی آج کے لاہور سے خاصا مختلف تھا۔" سوہناشہر لاہور " کے مصنف لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں کو ترتیب دیتے ہوئے قدیم لاہور میں شادی بیاہ کے موقع پر پیش کیے جانے والے کھانوں اور کھانے کے انداز کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شادی بیاہ پر کھانے پینے کا رواج امیروں میں پر تکلف کھانوں کا تھا،ہندو شادیوں پر زیادہ تر پوڑی کچوری اور مٹھائی استعمال کرتے تھے، مسلمانوں میں زیادہ تر درمیانے اور غریب طبقے کے رسم ورواج کھانے پینے میں سادہ تھے۔اس طبقے میں زرد پلاؤ پکتا، مگر ساتھ قورمہ اور ساگ گوشت نہیں ہوتا تھا۔ سادہ زردہ پلاؤ ہوتا۔ دریاں بچھ جاتیں۔ ان پر دسترخوان بچھا دیے جاتے اور لوگ آمنے سامنے بیٹھ کر کھانا کھاتے۔(۴۰)

لاہور میں شادی بیاہ کے موقع پر پیش کیے گئے ان کھانوں اور کھانا پیش کرنے کے انداز کا موازنہ آج کے لاہور سے کیا جائے تو قدیم اور جدید لاہو ر کی سماجی اقدار میں واضح فرق دکھائی دیتاہے۔ آج لاہور کے کسی بھی گھر، کسی بھی قوم یاکسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے افراد شادی کے موقع پر ساگ پیش کرنے کاتصور بھی نہیں کرسکتے ۔ دریاں بچھاکر آمنے سامنے بیٹھ کر کھانے کا رواج بھی ختم ہوچکاہے اور جدید عہد میں شادی ہال کے تصور نے کھانا کھانے اور کھانا پیش کرنے کے قدیمی تصورکو یکسر بدل کر رکھ دیاہے ۔ اب نچلے اور متوسط طبقے کے افراد بھی زیادہ تر شادی کے مواقع پر ان شادی ہالوں کا ہی رخ کرتے ہیں جہاں دریوں کی بجائے کرسیوں اور میزوں پر بیٹھ کر کھانے کارواج ہے ۔ اگرچہ یہ بھی مہذب طریقہ ہے جس پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جاسکتا تاہم اس

سے ظاہر ہوتا ہے کہ شادی بیاہ کی سماجی اقدار میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ خاص طور پر کھانا پکانے اور کھانا پیش کرنے کے انداز کافی حد تک بدل چکے ہیں۔ اس میں ایک طرف جدید زمانے کے تصورات کا بڑا عمل دخل ہے تو دوسری طرف نئی نسل کی ترجیحات بھی کافی بدل چکی ہیں۔

قدیم لاہور کی سماجی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو شادی بیاہ کے موقع پر کیے گئے مختلف انتظامات آج کے دور میں محض داستانیں ہی معلوم ہوتی ہیں۔ بارات دور دراز کے علاقوں سے آئے یا کسی قریبی جگہ سے آئے، دونوں صورتوں میں اسے کم از کم ایک رات ٹھہرانے کا انتظام ضرور کیا جاتا تھا۔ بعض اوقات تو ایک سے زیادہ دن اور رات بھی بارات ٹھہرائی جاتی تھی۔ یہ وہ سماجی رسم تھی جس کا آج کے لاہور کے سماج میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ طاہر لاہوری قدیم لاہور کے اس سماجی منظرنامے کی عکاسی کرتے ہوئے بارات ٹھہرانے اور اس کو پیش کیے گئے کھانوں کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> بارات اکثر رات ٹھہرانے کا رواج تھا۔ ایک وقت زردہ پلاؤ اور ایک وقت سفید چاول اور شوربہ گوشت ہوتا تھا۔۔۔۔ناشتے میں سبز چائے اور باقر خانیاں یا مٹھائی کا بھی رواج تھا۔ کچھ خاص خاندانوں میں، سفید چاول اور پیسا چینی اوپر تھاپ کر درمیان میں جگہ بنا کر دیسی گھی ڈال دیا جاتا۔ بارات کی اس طرح خاطر تواضع کی جاتی۔۔۔ کھانا سب بیٹھ کر کھاتے تھے، کھڑے ہو کر کھانے کو مکروہ اور معیوب سمجھا جاتا تھا۔ البتہ رئیسوں اور امیروں کی شادیوں پر مرغ مسلم، قورمہ، تنجن، اور ہر پر تکلف کھانا پکتا تھا۔ بارات ایک سے زیادہ دن بھی رکھی جاتی تھی۔ ہندوؤں میں بھی بارات کو دو دو دن رکھا جاتا تھا۔(۴۱)

اس اقتباس سے ایک تو بارات کے ساتھ سماجی برتاؤ کی عکاسی ہوتی ہے تو دوسری طرف اُس وقت کے سماج میں شادی بیاہ پر پیش کیے جانے والے خورونوش کے لوازمات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے ۔ یادداشت نگاروں نے ہندو اقوام کے ہاں بھی بارات کے ٹھہرنے کا ذکر کیاہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کے مختلف مذاہب اور مختلف اقوام کی سماجی رسومات میں کسی قدر اشتراک بھی پایا جاتا تھا۔ جہاں تک شادی بیاہ کی رسومات کا تعلق ہے تو اردو آپ بیتی اور یادداشتوں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ اس شہر میں یہ رسومات کافی حدتک مشترکہ تھیں ۔ مختلف مذاہب کے ماننے والے بہت سی ایسی رسومات کرتے تھے ، جو ایک مذہب میں تو لازم تھیں لیکن دوسرے مذاہب کے لوگ بھی سماجی رواداری اور سماجی چلن میں شامل ہونا لازم سمجھتے تھے ۔ اس شہر میں چوں کہ ہندو قوم کثیر تعداد میں آباد تھی اور ہندو شادی بیاہ کے موقع مختلف رسومات سرانجام دیتے تھے ، اس وجہ سے ایک مشترکہ سماجی منظر نامے کی تشکیل کرتے ہوئے ، مسلمانوں میں بھی یہی رسومات رائج ہوگئی تھیں۔ طاہر لاہوری اپنی یادداشتوں میں ان رسومات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شادی بیاہ پر ہندووانہ رسموں کا زیادہ رواج تھا۔ دولہا کھارے چڑھتا تھا، چپنیاں توڑتا تھا(چپنی، مٹی کی ہنڈیاں کا ڈھکنا)، گانہ باندھنا ، گانہ کھولنا، گھوڑابیڑی ، جوتا چھپائی ، دولہا سے لڑکیوں کا مذاق ، دولہا دلہن کی آمنے سامنے بیٹھ کر کئی رسمیں، سٹھنیاں، گھوڑیاں ،سہاگ ۔ یہ سب گانے عورتیں مل کر گاتی تھیں ان گانوں میں دولہا والوں کو گالیاں بھی دی جاتی تھیں۔(۴۲)

ان رسومات کا چلن آج بھی لاہور اور پنجاب کے دیگر خطوں میں کسی نہ کسی طور پر موجود ہے لیکن اب ان میں وہ پہلا سااہتمام باقی نہیں رہا۔ اس کی وجہ بدلتا ہوا سماجی منظرنامہ ہے جس میں لوگوں کے پاس ان رسومات کے لیے اتنا وقت نہیں ہے جو پہلے لوگوں کے پاس ہوتا تھا ۔ دوسری

طرف جگہ کے مسائل اور معاشی مسائل ان رسومات میں پہلی سی رونق باقی نہیں رہنے دی۔ تاہم پھر بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ رسومات آج بھی ادا کی ہی جاتی ہیں۔

اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری میں لاہور کے سماج کی شادی بیاہ کی رسومات کا جائزہ لینے سے اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ قدیم عہد کا لاہور ان سماجی رسومات کے حوالے سے بھی اپنی مثال آپ تھا۔ قیام پاکستان سے قبل اور بعد کے چند سالوں تک شادی بیاہ کے موقع پر جو رسومات ادا کی جاتی تھیں، ان میں ہندو رسومات کا چلن بھی بہت زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ شادی بیاہ کی رسومات سے اس عہد حقیقی سماج جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ وہ سماج تھا جو خلوص اور یگانگت پر مبنی تھا۔ اس میں ان رسومات اور اجتماعات کے موقع پر ایک دوسرے کو قریب لانے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بارات کو کئی دن ٹھہرانا ایک ایسا ہی سماجی عمل تھا جس میں زیادہ سے زیادہ افراد کو شرکت کا موقع ملتا تھا۔ بارات کی آؤ بھگت اور مہمانوں کے لیے اپنی توفیق سے بڑھ کر پیش کرنے کا سماجی رویہ لاہور کے حسین سماجی منظرنامے کی عکاسی کرتا ہے۔

اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری میں تقریبا ایک صدی قبل کا جو لاہور ملتا ہے، اس میں سماجی حوالے سے آج کے لاہور سے خاصا فرق پایا جاتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب غربت اورامارت کے معیارات بھی مختلف ہوتے تھے۔ ان معیارات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سماج میں اس گھر کو امیر مانا جاتا تھا جس گھر میں اپنی ماچس ہوتی تھی یا اپنی لالٹین ہوتی تھی۔ مستنصر حسین تارڑ امارت اور غربت کے ان سماجی معیارات کا تذکرہ کرتے ہوئے لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں "لاہور آوارگی" میں لکھتے ہیں:

> میرے نانا جان نمبردار تھے اور یوں نانی جان بھی نمبردارنی کہلاتی تھی۔ تب دولت اور خوراک کی فراوانی نہ تھی۔ ہماری امارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا تھا کہ پورے محلے میں صرف ہمارے گھر میں لالٹین تھی اوروہ بھی اہم موقعوں پر چمکا لشا کر روشن کی جاتی

تھی۔ ورنہ اک مٹی کا دیا تھا۔ نانی جان سرِ شام روئی کو ہتھیلیوں میں حرکت دے کر ایک پونی بناتیں، دیئے میں تیل ڈالتیں اور اس میں وہ روئی کی پونی بھگو کر اسے روشن کرتیں۔ پونی پہلے تو پھٹ پھٹ پٹاخے مارتی پھر اس کی لو پر امن ہو کر جلنے لگتی اور یہ بھی یاد رہے کہ پورے محلے میں ماچس صرف ہمارے گھر میں ہوا کرتی تھی ۔ محلے والے ہمارا چولہا جلنے پر آگ لینے ہمارے ہاں آجایا کرتے تھے۔(۴۳)

مستنصر حسین تارڑ اس بیان سے لاہور کے سماج کا نقشہ پوری طرح ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا سماج تھا جس میں سماجی رواداری اور باہمی سماجی روابط خاصے مضبوط تھے۔ ایک دوسرے کی ضروریات کا احساس کیا جاتا تھا اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہر ممکن مدد فراہم کی جاتی تھی۔

لاہور کے سماج کا نقشہ کھینچتے ہوئے بعض آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے تفریح کے سامان اور تفریح کے انداز کا بھی نقشہ کھینچا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بسنت، پہلوانوں کے اکھاڑے، نیو ائیر نائٹ اور اس طرح کے دیگر مواقع ایک طرف لاہوریوں کے لیے تفریح کا سامان پیدا کرتے تھے تو دوسری طرف سماجی منظرنامہ کی تشکیل میں بھی اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی لاہور کے سماج میں لاہوریوں نے اپنی تفریح کے سامان پیدا کر لیے تھے۔ جو لاہوری سماج کی عکاسی بھی کرتے تھے۔ مستنصر حسین تارڑ اس حوالے سے نیو ائیر نائٹ کا تذکرہ کرتے ہوئے لاہوری سماج کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

نیو ائیر کی شب کو بھی بہت ہنگامے ہوتے ۔۔ پارک ہوٹل، فلیٹیز ہوٹل کے علاوہ باغ جناح کی جم خانہ کلب کا جشن مجھے یاد ہے۔ ویسے مجھے یہ بھی یاد ہے کہ ایک نیو ائیر نائٹ میں جب کہ فلیٹیز ہوٹل کے چوبی فرش پر جوڑے رقص کرتے تھے تو وہاں میوزیکل بینڈ تھا جس کی موسیقی پر سب سر دھنتے تھے۔ اس میں ڈھول بجانے والے، یعنی ڈرمر

ایک خوش شکل گورے چٹے جوان تھے اور حاضرین ان کی ڈھول
نوازی سے متاثر ہو کر ان پر نوٹ نچھاور کرتے تھے۔(۴۴)

اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری میں لاہور کی سماجی صورت حال کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور سماجی اور تہذیبی حوالے سے ہر دور میں اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں بسنے والی مختلف اقوام کی سماجی اور تہذیبی اقدار اس شہر کو ایک ایسا شہر قرار دیتی ہیں جو صدیوں سے تہذیبی اقدار کا امین ہے۔ تقسیم سے قبل اس شہر کا سماجی اور تہذیبی منظر نامہ بعد از تقسیم کے سماجی منظر نامے سے خاصا مختلف تھا۔ یہاں آباد غیر مسلم اقوام کی وجہ سے یہاں کی سماجی اور تہذیبی صورت حال ایک مشترکہ سماج کا منظر نامہ پیش کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان بھر میں اثرات انگریز ثابت ہونے والی مختلف سماجی اور سیاسی تحریکیں بھی اسی شہر سے اٹھیں اور یہیں پروان چڑھیں۔ خلیق ابراہیم خلیق اس حوالے سے لاہور کے بارے میں اپنی آپ بیتی "منزلیں گرد کے مانند" میں لکھتے ہیں:

مذہبی، سماجی اور سیاسی تحریکوں کے حوالے سے بھی لاہور برصغیر کے
اہم ترین شہروں میں سے تھا۔ یہ قادیانیوں یا احمدیوں کی اس شاخ
کا مرکز تھا جو لاہوری گروپ کہلاتی ہے۔ یہاں شدھی اور سنگھٹن کا
پرچار کرنے والے آریہ سماجیوں کا زور بھی رہ چکا تھا اور تبلیغ و تنظیم
والوں کا بھی۔ یہی شہر بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کا مستقر تھا۔ یہیں
احرارِ اسلام، نیلی پوش اور خاکسار تحریکوں نے جنم لیا اور کانگریس کی
قراردادِ آزادی اور مسلم لیگ کی قراردادِ پاکستان برصغیر کے نمائندہ
عوامی اجتماعات میں، اسی شہر میں منظور کی گئی تھیں۔(۴۵)

خلیق ابراہیم خلیق کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور سماجی حوالے سے ایک ایسا مرکز تھا جس کی اہمیت کا احساس ہر دور کے حکمران اور سماجی طبقے کو بھی رہا ہے۔ یہ لوگ بھی جانتے تھے کہ جو تحریک لاہور سے اٹھے گی یا جس تحریک میں لاہور شامل ہو گا وہی تحریک کسی قدر کامیابی حاصل

کر پائے گی کیوں کہ لاہور کا سماج ایک ایسا مشترکہ سماج تھا جو ہر قوم کی نمائندگی کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ سماجی اور تہذیبی اقدار کا امین یہ شہر ہر سماجی اور سیاسی تحریک کا مطلع اول بن کر ابھرا۔ اردو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے اس شہر کی سماجی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے خاصی وسعت قلبی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان تخلیق کاروں نے اس شہر کے لوگوں کے سماجی مشاغل کے ساتھ ساتھ تقسیم سے قبل اور تقسیم کے بعد کے سماجی منظر نامے کا نقشہ بھی بڑی کامیابی سے کھینچا ہے۔ تقسیم سے قبل کا وہ سماج جو مشترکہ سماج تھا ، اس کی عکاسی بہت سے آپ بیتی اور یادداشت نگاروں کے ہاں ملتی ہے۔ مجموعی طور پر اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری میں لاہور کی سماجی صورت حال کی عکاسی واضح، غیر جانب دار اور حقیقت پسندانہ انداز میں کی گئی ہے۔

ج۔ قیام پاکستان کے بعد سیاسی سماجی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی تاریخی ادوار میں بدلتی صورتحال

لاہور قیام پاکستان سے قبل اور بعد میں ہمیشہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ مغلوں نے اس شہر کو حکومت کے حوالے سے خاص اہمیت بخشی ۔ ان کے بعد استعماریت کے عہد میں بھی یہ شہر مختلف سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا۔ انگریزوں کے عہد میں اس شہر کی سیاسی سرگرمیاں عروج پر رہیں ۔ انگریزی دور میں کانگریس، مسلم لیگ اور دیگر کئی سیاسی جماعتوں نے اس شہر کو ہی اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور ہر نئی اٹھنے والی تحریک اسی شہر سے شروع ہوتی دکھائی دیتی ہے۔

لاہور کی سیاسی تاریخ کا جائزہ لیا جائے تو مختلف ادوار میں یہ شہر سیاسی حوالے سے مختلف طرزِ حکومت کا حامل رہا ہے۔ پنجاب جسے برصغیر کے سیاسی و سماجی منظر نامے میں مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس کا مرکز ہمیشہ سے لاہور رہا ہے۔ ہر طرح کے حکومتی ادارہ جات اور پنجاب کے نظم ونسق کے تمام انتظامات لاہور ہی سے ترتیب پاتے آئے ہیں اور موجودہ عہد میں بھی یہی صورت حال برقرار ہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بہت سے آپ بیتی نگار اور یادداشت نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنے عہد کے سیاسی حالات کو بھی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں پیش کیا ہے۔ خاص طور پر وہ آپ بیتیاں جو سیاسی شخصیات نے تحریر کی ہیں، ان میں پنجاب اور خاص طور پر لاہور کی سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل ملتی ہے۔ آپ بیتی نگار اپنی زندگی کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کا بھی عکاس ہوتا ہے۔ وہ اپنے آپ پر گزرنے والے حالات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان حالات کے سماجی اور سیاسی تناظر کو بھی سامنے لاتا چلا جاتا ہے جس کی وجہ سے آپ بیتی اور یادداشتیں کسی عہد کے سیاسی و سماجی رجحانات کو سمجھنے کا معتبر ذریعہ قرار پاتی ہیں۔ جہاں تک لاہور کی سیاسی صورت حال کا تعلق ہے تو یہ بھی برصغیر کے دیگر خطوں کی طرح ہر دور میں بدلتی رہی ہے۔ ہر دور کے اندازِ حکمرانی میں اس شہر کی سیاسی صورت حال میں جو تغیر آیا ہے اس سے برصغیر کے سیاسی

نظام کی تفہیم کی راہیں بھی کھلتی ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اندازِ حکمرانی خواہ کسی بھی طرز کا ہو، پنجاب کی سیاسی اورانتظامی سرگرمیوں کا مرکز لاہور رہی رہا ہے۔ انگریزوں کے دور میں جب گورنری نظام کا نفاذ کیا گیا تو اس وقت بھی پنجاب کے انتظامی اور سیاسی امور کی سربراہی لاہور ہی کے حصے میں آئی۔ اس ضمن میں طاہر لاہوری، لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں اس شہر کی سیاسی اور انتظامی امور کی مرکزیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> انگریزوں کے دور میں پنجاب گورنر کے زیر اثر ہوتا تھا۔ بیشتر محکموں کے سربراہ انگریز ہوتے تھے گورنر اور گورنر سیکرٹریٹ لاہور میں ہوتا تھا۔ سیاسی دور شروع ہوا تو اسمبلی بن گئی۔ تعلیم اور سیاست کا گڑھ لاہور رہی تھا۔۔۔ پہلے تو صرف موری ممبری (میونسپلٹی) کے الیکشن ہوتے تھے، ذیلداری کے الیکشن ہوتے تھے۔ پھر اسمبلی کے الیکشن شروع ہوئے تو یہ شہر سیاست کا بہت بڑا اکھاڑہ بن گیا۔ جوڑ توڑ کا گڑھ بن گیا۔۔۔ مسلم لیگ اور کانگریس دوسیاسی دھڑے لاہور کی فضا پر چھائے ہوئے تھے۔ کانگریس بلاشبہ ہندوؤں کی نمائندہ جماعت تھی اور مسلم لیگ مسلمانوں کی نمائندہ تھی۔ بظاہر کئی چھوٹی موٹی اور مسلم جماعتیں کانگریس کے ساتھ تھیں۔ ان میں احرار سرفہرست تھی۔ مگر حکومت یونیسٹ پارٹی کی بنتی تھی۔ کیونکہ یہ انگریز نواز جماعت تھی۔(۴۶)

طاہر لاہوری کے اس بیان سے ایک طرف لاہور کی سیاسی عمل میں شمولیت اورانتظامی امور کی مرکزیت سے آگاہی ہوتی ہے تو دوسری طرف اس حقیقت سے بھی آشنائی ہوتی ہے کہ انگریزوں کے دور میں بھی اکثریت کو اقلیت اور اقلیت کو اکثریت میں بدلنے کا رواج تھا۔ اس دور میں بھی مختلف جوڑ توڑ کے ذریعے انگریز نواز پارٹیوں کو اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھایا جاتا تھا جب کہ اکثریت حاصل کرنے

والی ان سیاسی پارٹیوں کو حزبِ مخالف کا کردار ادا کرنا پڑتا تھا جو انگریز مخالف تھیں۔ یوں سیاسی جوڑ توڑ انگریزوں کے دور میں بھی عروج پر تھا، اس کا مرکز بھی لاہور تھا۔ پنجاب پر حکمرانی کرنے والوں کو اپنی سیاسی قوت اور سیاسی بصیرت لاہور کے باسیوں کے سامنے منوانی پڑتی تھی۔ سیاسی جوڑ توڑ کا مرکز بننے کی وجہ سے لاہور کو پنجاب بھر میں سیاست دانوں کا گڑھ بننے کا اعزاز حاصل ہوتا چلا گیا۔ یہ صورت حال یہاں تک بڑھ گئی کہ موجودہ دور تک پہنچتے پہنچتے پنجاب کے سیاست دانوں کی اکثریت نے لاہور کو اپنا مستقل یا عارضی مسکن بنا رکھا۔

لاہور کی سیاسی حیثیت میں اضافہ اس وقت ہوا جب ہندوستان بھر میں انگریزوں کے خلاف سیاسی تحریکیں اپنی سرگرمیوں کو وسعت دے چکی تھیں اور ہندوستان بھر میں یہ سیاسی تحریکیں کامیابی کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ یہ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کا عرصہ تھا جب کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ہی ایک طرف انگریزوں کی مخالفت میں خم ٹھونک کر میدان میں آچکی تھیں تو دوسری طرف ان دونوں جماعتوں کی آپس میں بھی کسی نہ کسی طرح کی مخاصمت جاری تھی۔ اس عہد میں بھی پنجاب کی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز لاہور ہی قرار پاتا رہا۔ یہاں سے اٹھنے والی ہر تحریک نے ہندوستان بھر میں اپنے مقاصد کے حصول کی طرف سفر جاری رکھا اور کسی نہ کسی حوالے سے کامیابی سے بھی ہمکنار ہوئی۔ محمد سعید اپنی آپ بیتی " آہنگ بازگشت " میں ۱۹۲۸ء میں لاہور کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۱۹۲۸ء میں لاہور بڑی تیزی سے سیاست کا مرکز بنتا جارہا تھا۔ یہ فخر اسی شہر کو حاصل ہے کہ چمنستان ہند کی سیاسی روشوں پر جتنی کلیاں پھوٹی ہیں، وہ یہیں کھل کے پھول بنیں۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ پورے ملک میں اس پایہ کا اردو پریس کہیں نہیں تھا۔ (۴۷)

لاہور میں اکثریت اگرچہ مسلمانوں کی تھی لیکن ہندوستان کی ہر چھوٹی بڑی سیاسی جماعت کے رہنماؤں کو اس حقیقت کا ادراک تھا کہ لاہور کی شمولیت کے بغیر سیاسی تاریخ کا دھارا بہنا اور سیاسی

تاریخ کارخ موڑنا ممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس نے جب ہندوستان کی آزادی کا نعرہ بلند کیا تو اس نے بھی اس کے لیے لاہور کی سرزمین کا ہی انتخاب کیا۔ یہ ۱۹۲۹ء کا ایک دن تھا جب کانگریس نے لاہور میں اپناسالانہ اجلاس منعقد کیا۔ دسمبر کا آخری دن تھا اسی دسمبر کی آخری رات کو جب انگریز حکمران نیو ائیر نائٹ منانے میں مگن تھے ،کانگریس نے لاہور ہی سے ہندوستان کی آزادی کا پرچم لہرایا۔ محمد سعید ہندوستان کی آزادی کے اس پرچم کے لہرانےاو ر لاہور کی سیاسی فضا میں کانگریس کے کردار پر بات کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی "آہنگ بازگشت" میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۲۹ء کے دسمبر میں کانگریس نے سالانہ اجلاس لاہو ر میں منعقد کیا۔۔۔ ہندوستان بھر سے کانگریسی رہنما کھنچ کر لاہور پہنچ چکے تھے ۔ پرانے راوی اورنئے دریا کے درمیان کی بھولی بسری دنیا میں لاہور کا حسن وشباب سمٹ آیا تھا۔۔۔ ۱۹۲۹ء کی آخری رات کے وسط میں آزادی ہند کا پرچم لہرا دیا گیا جب فلیٹیز اور نیڈو ہوٹل میں بدمست انگریز مرد اور عورتیں پرانے سال کو رخصت کررہے تھے اوران کی عبادت گاہیں سالِ نو کی آمد کااعلان گھڑیالوں کے شور میں کر رہی تھیں، ایک غلام قوم رقصِ آزادی میں محو تھی۔ ۱۹۳۰ء کا سورج جب راوی کی کہر میں لپٹا ہوا طلوع ہوا تو کانگریس آزادی کا اعلان کرچکی تھی، اورانگریزی بادہ شبانہ کی سرمستیوں سے فارغ ہو کر چھاؤنی میں نئے سال کی پریڈ میں اپنی عسکری قوت کی ایک جھلک دکھا رہا تھا۔ آواز اگرچہ کانگریس کی تھی اور جو پرچم لہرایا گیا وہ ترنگا تھا، تاہم کوئی قلب ایسا نہ تھا بالخصوص وہ جس میں جوان خون گردش کررہا تھا۔ جس کی گہرائیوں میں آزادی کی تمنانہ ہو۔(۴۸)

محمد سعید کا یہ بیان انگریزی عہد میں لاہور کے باسیوں کے سیاسی شعور کی عکاسی کرتا ہے۔ کانگریس کے بارے میں اس وقت تک واضح ہو چکا تھا کہ یہ ہندوؤں کے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کا مطمع نظر ہندوستان کی آزادی کے بعد اس پر ہندوؤں کی حکومت کا قیام تھا، لیکن اس وقت استعماریت سے نجات حاصل کرنا ہر ہندوستانی کی بنیادی خواہش بن چکی تھی، اس لیے لاہور نے بھی ہر اس سیاسی تحریک کا ساتھ دیا جس کے منشور میں ہندوستان کی آزادی شامل تھی۔ ہندوؤں کی نمائندہ جماعت ہونے کے باوجود اور لہرائے جانے والے پرچم کا ترنگا ہونے کے باوجود لاہور کے باسیوں نے ہندوستان کی آزادی کی خاطر اپنے سیاسی شعور کو استعمال کرتے ہوئے، نہ صرف کانگریس کے جلسے کو کامیاب بنایا بلکہ ہندوستان کی آزادی کا نعرہ بھی بلند کیا۔ اس سے لاہور کے باسیوں کے سیاسی شعور کی پختگی اور حب الوطنی کے جذبے سے آگاہی ہوتی ہے۔

اہلِ لاہور نے انگریز اقتدار کے دور میں بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک انگریزوں سے نجات کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنائے رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ کانگریس ہو یا مسلم لیگ، جس نے بھی لاہور والوں کو پکارا، اہلِ لاہور نے سیاسی حوالے سے اس کی کامیابی میں نمایاں کردار ادا کیا۔ کانگریس کے علاوہ جب مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تو اس وقت لاہور والوں نے جس سیاسی پختگی کا ثبوت دیا اس کی عکاسی ایک آپ بیتی میں یوں ملتی ہے:

> ادھر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں، منٹو پارک میں ایک نئی دنیا بسائی جا چکی تھی۔ چٹا گانگ سے خیبر تک اور کراچی سے سلہٹ تک کے مسلم زعماء لاہور میں جمع ہو رہے تھے۔ سیاسی ہماہمی پورے عروج پر تھی۔ برطانوی اقتدار اور کانگریس کی قیادت کے علاوہ اب ایک تیسری قیادت کے خدوخال سنور رہے تھے، اور یوں پورے ہندوستان کی نگاہیں ایک مرتبہ پھر لاہور پر مرکوز ہو رہی تھیں۔(۴۹)

مسلم لیگ نے لاہور سے ہی اپنی سر گرمیوں کے عروج کا سفر شروع کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی سیاست میں اپنا مقام منوانے لگی۔ مسلم لیگ کی سر گرمیاں اگرچہ ہندوستان کے دیگر مسلم علاقوں میں بھی جاری تھیں، تاہم لاہور کی سیاسی صورت حال نے مسلم لیگ کو اپنا مرکز لاہور بنانے پر مجبور کیا۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے مسلم لیگ کے وہ سالانہ اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوئے انھوں نے بھی لاہور کی سیاسی فضا کو متحرک رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قراردادِ لاہور جسے بعد میں قراردادِ پاکستان کا نام دیا گیا، وہ لاہور ہی کے ایک جلسے میں منظور ہوئی۔ اردو آپ بیتی میں لاہور کی سیاسی صورتحال کو بیان کرتے ہوئے آپ بیتی نگاروں نے مسلم لیگ کی ان سیاسی سر گرمیوں کو بھی بڑے احسن انداز میں بیان کیا ہے۔ "آہنگ بازگشت" آپ بیتی کے مصنف محمد سعید اپنی آپ بیتی میں لاہور میں مسلم لیگ کی سیاسی سر گرمیوں کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ کا دن مسلمانوں کی سیاسی سوچ اور تجربے اور امن خواہی کا نقطہ عروج تھا۔ تقسیمِ ملک کا مطالبہ باقاعدہ طور پر پیش کیا گیا اور اس قرارداد کو قراردادِ لاہور کے نام سے موسوم کیا گیا۔ (۵۰)

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد وہ بنیادی اینٹ تھی جو تقسیم ہند اور قیام پاکستان کے حوالے سے رکھی گئی۔ مسلم لیگ نے یہ کارنامہ بھی لاہور میں انجام دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کی اکثر آپ بیتیوں میں لاہور کی اس سیاسی فضا اور اس قرارداد کی عکاسی ملتی ہے۔ محمد سعید کے علاوہ دیگر کئی آپ بیتی نگار جو قرارداد کے پیش ہونے کے وقت اپنے بچپن یا لڑکپن سے گزر رہے تھے، وہ اس کے چشم دید گواہ ہیں اور اس کو بیان کرنا اپنے لیے باعث فخر سمجھتے ہیں۔ غلام نبی کا شمار بھی ایسے ہی سیاستدانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کو آپ بیتی کی صورت میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے سیاسی شعور کے حوالے سے لاہور کو خاص قرار دیا ہے۔ ان کی آپ بیتی میں لاہور میں منظور ہونے والی اس قرارداد اور اس کی منظوری کے وقت اہلِ لاہور کے جوش و خروش کا بیان بڑی صراحت سے

ساتھ ملتا ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ کے اس اہم واقعے کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> قائدِ اعظم مسلم لیگ کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور پہنچنے والے تھے ۔ ان کے کچھ چاہنے والوں نے ان کو منع کیا کہ وہ ابھی لاہور تشریف نہ لائیں ، کیوں کہ حالات ساز گار نہیں ہیں لیکن وہ مقررہ وقت پر لاہور پہنچے۔۔۔۔ مسلم لیگ کا کھلا اجلاس منٹو پارک لاہور میں ۲۳مارچ ۱۹۴۰ء کو زیر صدارت قائداعظمؒ منعقد ہوا اور عہدِ آفریں لاہور ریزولیشن پاس کیا گیا۔ آگے چل کر یہی ریزولیشن قراردادِ پاکستان میں تبدیل کر دیا گیا۔(۵۱)

لاہور کی سیاسی تاریخ کے حوالے سے اردو کی وہ آپ بیتیاں زیادہ اہم قرار پاتی ہیں ،جو مختلف سیاستدانوں نے تحریر کی ہیں۔ ان آپ بیتیوں کے ادبی معیار سے قطع نظر ان میں لاہور کے سیاسی منظرنامے کی بدلتی ہوئی صورت حال کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں کی گئی ہے۔ یہ وہ سیاست دان تھے جنھوں نے لاہور کے سیاسی منظر کے تغیرات کا نہ صرف مشاہدہ کیا تھا بلکہ وہ اس عمل میں شریک بھی رہے تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آپ بیتیاں ان کے تجربات کا حاصل قرار پاتی ہیں۔ یہ تجربات سیاسی نشیب و فراز سے معمور ہیں۔ فرخندہ بخاری کا شمار بھی ایسے ہی سیاست دانوں میں ہوتا ہے جنھوں نے عام طبقے سے اٹھ کر ملکی سیاست میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ انھوں نے اپنی سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کو آپ بیتی "یہ بازی عشق کی بازی ہے" کی صورت میں پیش کیا ہے۔ مسلم لیگ کے عروج کے دنوں کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لاہور کی سیاسی صورت حال کی عکاسی یوں کرتی ہیں:

> پھر ایک زمانہ آیا جب سیاست میں مسلم لیگ نے تیزی سے میدان مارنا شروع کر دیا۔ بڑا ولولہ ، بڑا جوش۔ ہر کسی کے لبوں پر قائدِ اعظم زندہ

باد کے نعرے۔ پھر ایک دن ایک جلوس بازار سے گزرا جس کا گونجدار نعرہ تھا۔ "ڈان دی خبر آئی اے خضر ساڈا بھائی اے"۔(۵۲)

یہ وہ دور تھا جب انگریز حکمرانوں نے مختلف انتخابات کروائے تھے۔ ان انتخابات میں اگرچہ مسلم نشستوں کے حوالے سے مسلم لیگ کا پلہ بھاری رہتا تھا لیکن انگریزی نواز جماعتوں کو اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھا دیا جاتا تھا۔ سر خضر حیات ٹوانہ ایک ایسے ہی سیاست دان کے طور پر سامنے آئے تھے جن کے پاس اگرچہ اکثریت نہیں ہوتی تھی لیکن ان کی انگریز نوازی کی وجہ سے ہر بار وزارت انہی کے حصے میں آتی تھی اور وہ اقتدار کے ایوانوں میں پہنچتے تھے۔ ان کی حمایت میں ایسی جماعتوں کو اکٹھا کیا جاتا تھا جو انگریز کی حمایت میں پیش پیش ہوتی تھیں۔ان دنوں لاہور خوب سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ حکومت سازی کے لیے سارے جوڑ توڑ یہیں ہوتے تھے۔ ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہر طرف مسلم لیگ نے میدان مار لیا تھا لیکن وزارت ایک بار پھر سر خضر حیات کی جھولی میں ڈال دی گئی تھی۔ شاہد حمید اپنی آپ بیتی "گئے دن کی مسافت" میں لاہور کی اس بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۹۴۶ء کے عام انتخابات میں پنجاب میں مسلم لیگ سب سے بڑی پارٹی بن کر ابھری تھی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگرچہ ۱۷۵ کے ارکان میں اس کے اپنے ارکان کی تعداد صرف ۷۳ ہے مگر اسے پانچ آزاد اور دس دیگر ارکان کی حمایت حاصل ہے، یوں اسے اکثریت حاصل ہو جاتی ہے اس لیے حکومت سازی کے لیے دعوت اسے دی جائے گی مگر گورنر سر ایوان میری ڈیتھ جنکنز کے کان پر جوں تک نہ رینگی اور اس نے سر خضر حیات ٹوانہ کو دوبارہ وزارت بنانے کی دعوت دے دی۔ اگرچہ یونینسٹ پارٹی کے صرف ۲۰ ارکان منتخب ہو سکے تھے مگر مسلم لیگ کو ناکام بنانے کے لیے آل انڈیا کانگریس کے ۵۱ اور کالی دل کے

> ۲۲ ارکان نے اس کی حمایت کا اعلان کر دیا۔ ہوا کا رخ اور گورنر کے تیور دیکھ کر چند آزاد ارکان بھی اس کے ساتھ جا ملے اور یوں اسے معمولی اکثریت حاصل ہو گئی۔(۵۳)

لاہور کی سیاسی فضا میں اس صورت حال نے بہت تغیر پیدا کیا۔ مسلم لیگ جو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت کے طور پر سامنے آئی تھی اور اکثریت میں تھی، اس کو ایک طرف کرتے ہوئے جب اقلیتی جماعتوں کو اکٹھا کر کے حکومت بنا دی گئی تو لاہور کی سیاسی فضا میں مزید ہلچل پیدا ہوئی۔ مسلم لیگ نے احتجاج پر کمر کس لی اور اس احتجاج کا مرکز بھی لاہور ہی قرار پایا۔ اردو آپ بیتی میں اس بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے کی عکاسی یوں ملتی ہے:

> مسلم لیگ اس صورت حال کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہ کر سکی اور اس نے طویل المدت ایجی ٹیشن کا منصوبہ بنایا۔ اس کے بڑے بڑے جلوس لاہور شہر کے مختلف حصوں سے نکلنے لگے۔ ایک جلوس سناتن دھرم کالج کے قریب سے گزر رہا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصادم ہو گیا۔ طرفین نے ایک دوسرے پر اینٹیں، روڑے اور پتھر پھینکے۔ ۲۳مارچ ۱۹۴۶ء کو کیبنٹ مشن سندھ کے مرکزی شہر کراچی وارد ہوا۔ اس کو کام کا موقع دینے کے لیے قائدِ اعظم اور مسلم لیگ نے ایجی ٹیشن کو معرضِ التوا میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا، تاہم خضر حیات کی حکومت سے نجات حاصل کرنے کے لیے جنوری ۱۹۴۷ء میں دوبارہ ایجی ٹیشن شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ تحریک ۳۶ دن جاری رہی۔ صوبائی حکومت اتنی زچ ہوئی کہ آخر کار مستعفی ہونے پر مجبور ہو گئی۔(۵۴)

اردو آپ بیتی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف لاہور ۱۹۴۶ء میں سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا تو دوسری طرف لاہور کی سیاست کے اثرات ہندوستان گیر ہوتے جارہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انگریز کی بھی یہ کوشش ہوتی تھی کہ مسلم لیگ کی بجائے خضر حیات کو اقتدار سونپا جائے لیکن اہلِ لاہور کے سیاسی شعور نے مسلم لیگ کو اتنا مضبوط کر دیا تھا کہ اس کے احتجاج کے باعث خضر حیات کی حکومت گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی اور مستعفی ہوگئی۔ یہ مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی جس میں سب سے زیادہ حصہ لاہور کی سیاست نے ڈالا تھا۔ اردو آپ بیتی نگاروں نے لاہور کی اس بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال کو بڑی صراحت کے ساتھ آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ غلام نبی اپنی آپ بیتی میں مسلم لیگ کے احتجاج کے دنوں میں خضر حیات کی حکومت کی چالبازیوں اور مسلم لیگ کے احتجاجی منصوبوں کو بیان کرتے ہوئے لاہور کی سیاسی صورت حال کو یوں بیان کرتے ہیں:

> پنجاب میں خضر وزارت نے مسلم لیگ کو دبانے کی بڑی کوششیں کیں۔ مسلم لیگ نے بھی خضر حیات وزارت کو زچ کرنے کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ خضر حیات نے سیاسی بلکہ ہر قسم کے جلسے جلوسوں پر پابندی عائد کر دی تھی۔ مسلم لیگ نے بھی حکومت کے دفاتر کے سامنے اور سرکاری عمارتوں پر مسلم لیگی پرچم لہرانے اور نصب کرنے کی چالیں اپنائیں۔ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کی تنظیم جو مسلم لیگ کا قومی سرمایہ تھی، اس تنظیم کو خلافِ قانون قرار دیا گیا۔ اسی وقت نوابزادہ لیاقت علی خان نے بحیثیت سیکرٹری جنرل مسلم لیگ یہ اعلان جاری کیا کہ نیشنل گارڈ پر حملہ مسلم لیگ پر حملہ تصور کیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد پنجاب کے چوٹی کے قائدین کو ۲۵ جنوری ۱۹۴۷ء کو گرفتار کر لیا گیا۔(۵۵)

وزارتوں کے استعفیٰ کے بعد لاہور کی سیاسی فضا میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ یہی وہ دور تھا جس میں ہندوستان بھر کی سیاست کی طرح لاہور کا سیاسی منظر نامہ بھی ہر دم بدل رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی تحریک بھی اپنے عروج پر تھی جس میں مسلم لیگ، کانگریس اور دیگر جماعتیں اپنی پوری توانائیاں صرف کر رہی تھیں۔ ان دنوں میں بھی لاہور ہی سیاسی سرگرمیوں کا مرکز تھا۔ مسلم لیگ کے علاوہ دیگر جماعتیں بھی اپنی سیاسی سرگرمیوں کے لیے زیادہ تر لاہور کا ہی انتخاب کرتی تھیں۔ شہرت بخاری نے اپنی آپ بیتی "کھوئے ہوؤں کی جستجو" میں لاہور کی اس بدلتی ہوئی سیاسی صورت حال کو یوں بیان کیاہے کہ تحریک آزادی میں سیاسی جماعتوں کے کردار اور لاہور کی سیاست سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں انگریز کے خلاف احتجاجی سیاست بڑے زوروں پر تھی۔ مختلف سیاسی جماعتیں اپنے اپنے نقطۂ نظر اوراپنے اپنے طریقے سے تحریکیں چلا رہی تھیں۔ دلی دروازہ لاہور کا سیاسی مستقر تھا۔ ہر جلسہ دلی دروازے کے باغ میں ہوتا تھا۔موچی دروازے کے باغ کی اہمیت پاکستان کی تحریک کے ساتھ ہوئی وہ بھی صرف آل انڈیا مسلم لیگ کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے جلسوں کے باعث، ورنہ باقی تمام جماعتیں اوران کی نگرانی میں چلنے والی تحریکیں دلی دروازے کو ہی اپنا مرکز بنائے ہوئے تھیں۔(۵۶)

لاہور کے اس سیاسی منظر نامے سے ظاہر ہوتاہے کہ لاہور کی سیاست نے صرف قیام پاکستان میں اہم کردار ادا کیا بلکہ بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے میں لاہور کی سیاست بھی تغیر پذیر سیاست ثابت ہوئی۔ایک طرف انگریز نواز حکومتیں بھی یہاں ہی بنتی تھیں تو دوسری طرف مسلم لیگ اور دیگر جماعتیں اپنی سیاسی سرگرمیوں کے لیے بھی اسی شہر کو مرکز بنائے ہوئے تھیں۔ یوں تقسیم ہند تک

لاہور سیاسی سرگرمیوں کا ایسامرکز بنا رہاجس کی سیاسی صورت حال ہر بدلتے دن کے ساتھ نہ صرف بدل رہی تھی بلکہ منزل کے حصول کی طرف بڑھ رہی تھی۔

قیام پاکستان کے بعد بھی لاہور کو ملکی سیاست میں مرکزی حیثیت حاصل ہوئی۔ اگرچہ ملک کا دارالخلافہ کراچی قرار پایا تھا اور بڑے سیاست دان کراچی میں تھے تاہم پنجاب کا دارالحکومت ہونے اور ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں اہم کردار ادا کرنے کی وجہ سے ایک بار پھر لاہور ہی سیاسی سرگرمیوں کامرکز بنا۔

قیام پاکستان کے بعد مختلف سیاسی جماعتوں کا ظہور اور ملکی سیاست میں ہلچل میں لاہور کا اہم کردار رہاہے۔ قیام پاکستان کے بعد کے سیاسی منظرنامے پر نگاہ ڈالی جائے تو عوامی مسلم لیگ کا قیام پاکستان اور خاص طور پر لاہور کی سیاسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے۔اردو آپ بیتیوں اوریادداشتوں میں اس بدلتے ہوئے سیاسی منظرنامے میں لاہور کی سیاسی صورت حال میں ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ عوامی مسلم لیگ کے قیام اور پھر جناح مسلم لیگ کا قیام اور بعد ان دونوں کے ادغام سے جناح عوامی مسلم لیگ کی تاسیس کا تذکرہ کرتے ہوئے غلام نبی اپنی آپ بیتی "قصہ ایک صدی کا" میں لکھتے ہیں:

> ۱۹۵۰ء کے اواخر اور۱۹۵۱ء کے اوائل میں جناب سید حسین شہید سہروردی نے اپنی جماعت عوامی مسلم لیگ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ جنوری ۱۹۵۱ء میں شیخ حامد محمود کی کوٹھی واقع جیل روڈ پر ایک میٹنگ کا اہتمام کیاگیا۔ جس میں میرے علاوہ حامد محمود، حمید نظامی، نواب ممدوٹ، میاں عبدالباری، فیض احمد فیض موجود تھے۔ ان حضرات کی موجودگی میں میں نے استعفیٰ لکھا اور مسلم لیگ سے اپنی لاتعلقی کا اعلان کردیا۔ یہ پہلا استعفیٰ دیا۔ اس وقت میں صوبہ مسلم لیگ کاجائنٹ سیکرٹری تھا۔اس کے بعد چند ہی دنوں میں نواب ممدوٹ اور میاں عبدالباری

> کے مداحوں نے دھڑا دھڑ اپنے استعفے پیش کر دیے جو اخبارات میں چھپنے شروع ہوگئے۔ ہم نے ایک الگ جماعت بنالی جس کا نام جناح مسلم لیگ رکھا۔ اس لیگ کے کرتا دھرتا نواب ممدوٹ اور میاں عبدالباری تھے۔ کچھ دنوں بعد یہ دونوں لیگیں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئیں اور اس جماعت کا نام جناح عوامی مسلم لیگ رکھا گیا۔(۵۷)

قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جنرل ایوب کا مارشل لاء اور پھر صدارتی انتخابات میں محترمہ فاطمہ جناح کی شکست اہم واقعات ہیں۔ ان واقعات نے پورے پاکستان کی سیاست کے ساتھ لاہور کی سیاست میں بھی خاصی تبدیلی پیدا کی۔ دیکھا جائے تو جنرل محمد ایوب خان کا حکومت سنبھالنا ہی پاکستان کی جمہوری تاریخ میں ایک بہت بڑا المیہ تھا جب جمہوری حکومت کا بستر لپیٹ کر مارشل لاء کی آمریت نافذ کر دی گئی، اس پر مستزاد وہ انتخابات جن میں مادرملت کو شکست سے دوچار کیا گیا۔ ان سیاسی واقعات میں لاہور ایک بار پھر سیاست کا مرکز بن گیا تھا۔ ملک کے دیگر حصوں کی طرح لاہور میں بھی سیاسی کارکنوں میں خاصی مایوسی پھیل گئی تھی جو آگے چل حکومت کے خلاف ایک تحریک میں ڈھلتی چلی گئی۔ جنرل ایوب خان نے نہ صرف اقتدار سنبھالا بلکہ زبان وبیان پر بھی طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی تھیں جس کی وجہ سے سیاسی منظرنامے کے ساتھ ساتھ سماجی سطح پر بھی خاصی بے چینی پیدا ہوئی تھی۔اس سیاسی منظرنامے کو ڈاکٹر صفدر محمود اپنی کتاب " پاکستان: سیاست اور تاریخ" میں رقم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس امر کے متعدد شواہد موجود ہیں کہ محترمہ فاطمہ جناح کے خلاف صدراتی انتخاب میں تمام انتظامی مشینری نے ان کی مدد کی تھی۔ ضلعی افسروں نے عوام کو ڈرا دھمکا کر ایوب خان اور اس کے ساتھیوں کے لیے ووٹ حاصل کیے۔ دوسری طرف ایوب خان نے اخبارات، سیاسی سرگرمیوں اور آزادی اظہار پر ناروا پابندیاں عائد کر دیں۔ ایک طویل عرصہ تک عوام کو بنیادی حقوق سے محروم رکھا۔ (۵۸)

اردو آپ بیتی نگاروں نے اپنی زندگی کے حالات بیان کرتے ہوئے لاہور کے اس سیاسی منظر نامے کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے جس میں جنرل ایوب خان کی آمریت کے اقدامات کے بعد جمہوری راستے بند کیے جارہے تھے اور زبان وبیان کی پابندیوں کی وجہ سے سماجی فضا بے چینی کا شکار ہورہی تھی۔ معروف سیاست دان غلام نبی اپنی آپ بیتی " قصہ ایک صدی کا " میں اس بدلتی ہوئی سیاسی اور سماجی صورت حال کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> ایوب خان کا دور شروع ہو چکا تھا۔ جو اعلان اور بیانات سامنے آئے ان سے معلوم ہوا کہ ملک کا آئین ختم کر دیا گیا، تمام شہری ادارے معطل اور مفلوج کر دیئے گئے، اسمبلیاں اور وزارتیں ختم کر دی گئی، ہر حرکت قابل تعزیر جرم ٹھہری تھی، سیاسی پارٹیاں ختم، عدالتوں کے اختیارات واپس لے لیے گئے۔ سر اٹھا کر چلنا قابل گرفت قرار پایا۔(۵۹)

ایوب خان کے ان ہتھکنڈوں کے خلاف حزبِ اختلاف کی جماعتوں نے ایک نئے سیاسی الائنس کی بنیاد ڈالنے کا سوچا۔ یہ الائنس جنرل ایوب کی آمریت کے مقابلے میں جمہوری اقدار کے تحفظ کے لیے تھا۔ رانا نذرالرحمٰن اپنی آپ بیتی میں اس بارے میں لکھتے ہیں :

> حزبِ اختلاف کی پانچ سیاسی جماعتوں نے جن میں کونسل مسلم لیگ، نظام اسلام پارٹی ، جماعت اسلامی پاکستان ، آٹھ نکاتی عوامی لیگ اور نیشنل ڈیموکریٹک فرنٹ شامل تھیں، ایک نئے لائنس کے لیے کوششیں تیز کر دیں۔ نیشنل عوامی پارٹی کا ون یونٹ پر ان کے خیالات، سوشلزم اور خارجہ پالیسی پر دوسری پارٹیوں سے اختلاف کی بنا پر بالا ارادہ اس اتحاد میں شامل نہیں کیا گیا۔(۶۰)

اس اتحاد نے لاہور کو بھی اپنی سرگرمیوں کا خاص مرکز بنایا تھا جس کی وجہ سے آمریت کے خلاف لاہور کی سیاسی فضا میں بھی ہلچل پیدا ہوئی۔ آگے چل کر جب جنرل ایوب خان کے خلاف تحریک

چلی اور اس تحریک کی کامیابی میں جنرل ایوب کو حکومت سے الگ ہونا پڑا تو اس تحریک میں بھی لاہور نے اہم سیاسی کردار ادا کیا۔ دوسری طرف جنرل ایوب کے دور کا جائزہ لیا جائے تو ملک کے دیگر حصوں کی طرح لاہور بھی اس دورِ حکومت سے خاص طور پر متاثر ہوا تھا۔ ایک طرف مارشل لاء اور حکومت کی سختی تھی تو دوسری طرف حکومت کے خلاف بات کرنا بھی جرم سمجھا جاتا تھا جس کی سنگین سزائیں بھگتنا پڑتی تھیں۔ مجموعی طور پر لاہور کی سیاسی فضا میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی۔ جنرل ایوب کے اقدامات نے سیاست دانوں کو خاص طور پر نشانہ بنایا۔ یہ عمل اس قدر سختی پر مبنی تھا کہ سیاست پر بات کرنے سے بھی لوگ کتراتے تھے۔ انیس ناگی کی آپ بیتی " ایک ادھوری سرگزشت " میں اس صورت حال کو یوں بیان کیا گیا ہے:

> ایوب خان کے مارشل لاء کے اثرات دیرپا تھے۔ لوگ ابھی دھیمی آواز میں بات کرتے تھے۔ ادیب بھی کچھ سہمے ہوئے تھے۔ ریستورانوں کی میزوں اور دیواروں پر تختیاں نمودار ہوئیں "سیاست پر گفتگو کرنا منع ہے "۔ اس امتناع کے باوجود ادیب ٹی ہاؤس میں دھیمی آواز میں مارشل لاء کے خلاف باتیں کرتے۔(۶۱)

جنرل ایوب خان کا دور لاہور کے سماج کے لیے بھی خاصی سختی کا دور تھا۔ یہاں تک کہ وہ معصوم بچے جن کے ذہن بھی ابھی پختہ نہیں ہوئے تھے، ان سے بھی ایوب خان کے خلاف یا محترمہ فاطمہ جناحؒ کے حق میں کوئی نعرہ لگ جاتا تو منتظمین کو جان کے لالے پڑ جاتے تھے۔ یہ اس وقت کے سماج کی حالت تھی کہ ایک طرح خوف کی فضا پورے لاہور پر چھائی ہوتی تھی۔ اس خوف کی فضا کی عکاسی ابوالحسن نغمی کی یادداشتوں پر مبنی کتاب " یہ لاہور ہے " میں ایک واقعے سے ملتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> جن دنوں پاکستان میں صدارتی انتخاب ہو رہے تھے اور مادرِ ملت فاطمہ جناحؒ، ایوب خان کے مقابلے میں صدارتی انتخابات لڑ رہی تھیں، انہی

دنوں کی بات ہے ۔بچوں کے پروگرام میں نو دس سال کے دو بچے شریک ہوئے ۔ دونوں گہرے سبز رنگ کی وردیاں پہنے ہوئے تھے ۔ ان کی فوجی ٹوپیوں میں رنگ برنگے پر لگے ہوئے تھے۔ ان کی کمر میں ٹین کی تلواریں لٹک رہی تھیں۔۔۔۔۔ پروگرام شروع ہوا دونوں بچوں نے نظم سنائی اور آخر میں نعرہ لگایا" مادرِ ملت فاطمہ جناح زندہ باد"۔۔۔ ہم دل کی گہرائیوں سے دعا مانگتے رہے کہ ہم سے کوئی باز پرس نہ کی جائے ۔ ہماری دعا قبول ہوئی اور ہم سے کسی نے نہ پوچھا کہ مادرِ ملت فاطمہ جناح زندہ باد کیوں کہا گیا۔(۶۲)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتاہے کہ جنرل ایوب کے دور میں ہونے والے صدارتی انتخابات میں سماجی سطح پر خوف کی فضا کس قدر طاری کردی گئی تھی اور دوسری طرف یہ بھی دیکھا جاسکتاہے کہ سیاسی فضا کو کیا رنگ دے دیا گیا تھا۔لاہور کے اس ماحول میں جس میں فاطمہ جناح زندہ باد کا نعرہ لگانا بھی جرم قرار دے دیا گیا ہو، ایسے ماحول میں فاطمہ جناح کو انتخابی مہم چلانے کی آزادی کس قدر ہو گی اور سیاسی فضا کو ایک خاص شخص کے حق میں کس طرح بزورِ بازو ہموار کیا جارہا ہو گا۔ ایسے انتخابات کا نتیجہ وہی بر آمد ہونا تھا جو ہوا۔ ایوب خان انتخابات تو جیت گئے لیکن لوگوں کے دل نہ جیت سکے اور آخر کار وہ طاقت کا استعارہ جس نے فریق مخالف کے سیاسی نعروں پر بھی پابندی لگادی تھی ،خود نعروں کی زد میں آکر ایوان اقتدار سے رخصت ہوا۔

یہ اس عہد کی سماجی اور سیاسی صورت حال تھی جو آمریت کے سائے میں پروان چڑھ رہی تھی۔ سماجی اور سیاسی منظر نامہ خاصا مکدر ہوچکا تھا۔ اس وقت ایک طرف لاہور کی سیاسی فضا میں آمریت اپنا رنگ دکھارہی تھی تو دوسری طرف اس آمریت کے مقابلے میں جمہوریت پسند عناصر بھی اپنی سیاسی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ لاہور کی سیاسی فضا میں تیزی سے تبدیلی واقع ہورہی تھی اور یہ تبدیلی ان سیاسی عناصر کی مرہون منت تھی جو ایوب خان کی آمریت پر مبنی پالیسیوں کے

خلاف خم ٹھونک کر میدان میں اتر چکے تھے۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے اس بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے کی عکاسی بھی بڑے جاندار انداز میں ملتی ہے۔ انیس ناگی اپنی آپ بیتی میں اس بدلتی ہوئی سیاسی فضا کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

> حالات تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ ایوب خان کی حکومت کے خلاف سبھی سیاسی طاقتیں اکٹھی ہونے لگیں۔ انہیں شاید یقین ہو گیا تھا کہ جو شخص مردِ آہن کے طور پر ابھرا تھا وہ لوہے کا آدمی ۶۵ء کی جنگ کے بعد اندر سے چٹخنے لگا ہے۔ چنانچہ یہ خیال عام ہونے لگا کہ "گرتی ہوئی دیوار کو ایک دھکا اور دو" اور یہ سب سے بڑا دھکا پاکستان میں ذوالفقار علی بھٹو نے دیا تھا۔(۶۳)

جنرل ایوب خان کے دور میں پاکستان کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صورت میں سامنے آیا۔ اس جنگ کا آغاز اور اگلے سترہ دن پاکستان کی قوم کی بہادری، دلیری اور زندہ دلی کی داستان بن کر ابھرے جنرل ایوب کا گرتا ہوا مورال ایک بار پھر بحال ہو گیا تھا لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا کہ ہندوستان سترہ روز کی جان توڑ لڑائی کے باوجود ایک قدم آگے نہ بڑھ سکا بلکہ اس کے بہت سے علاقے پاکستانی فوج کے قبضے میں چلے گئے۔ یہ دیکھتے ہوئے اس نے اقوامِ متحدہ میں جنگ بندی کی کوششیں شروع کر دیں۔ جس نے پاکستانی قوم کے دل میں جنرل ایوب کے لیے پہلے سے بھی زیادہ نفرت پیدا کر دی۔ اس دوران میں پاکستان میں ایک نئی سیاسی قوت ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں سامنے آئی۔ جنرل ایوب کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذوالفقار علی بھٹو میدان میں اترے اور دیکھتے ہیں دیکھتے سیاسی منظر نامے پر چھا گئے۔ لاہور ہی ان کی سیاسی سرگرمیوں کا بھی مرکز ٹھہرا۔ یوں لاہور سے اٹھنے والی اس نئی آواز نے پاکستان گیر مقبولیت حاصل کر لی۔ محمد سعید اپنی آپ بیتی میں اس بدلتی سیاسی صورتحال کا یوں نقشہ کھینچا ہے:

قوم جنگ بندی پر ناراض تھی اس پر مستزاد معاہدہ تاشقند۔ غم وغصے کا رخ تمام تر صدر ایوب کی جانب مڑ گیا چنانچہ ان کا اقتدار لحظہ بہ لحظہ گھٹتا جارہا تھا اور جن عوامل نے اس عمل کو وسیع بھی اور سریع بھی کر دیا۔ ان کی کابینہ میں کشمکش کی افواہیں تھیں اور پھر انکی شدید اور طویل علالت۔۔۔۔اس اثنا میں بھٹو صاحب نے استعفیٰ دے دیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ شہ ولا تبار کی نگاہ خشمگیں ان پر پڑ چکی ہے۔ خود ان کی جوانی اور امنگ اب ایک نئی دنیا کی تلاش میں نکلنے کے لیے مضطرب تھی۔(۶۴)

فرخندہ بخاری کا اپنا تعلق بھی پیپلز پارٹی سے تھا اس لیے وہ لاہور کے سیاسی منظر نامے پر ابھرنے والی اس نئی سیاسی قوت کے بہت قریب تھیں۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی میں پیپلز پارٹی کے قیام اور لاہور میں ذوالفقار علی بھٹو کی اٹھان کو خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ ان کے مذکورہ بالا بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو نے جنرل ایوب کے خلاف ان کے معاہدہ تاشقند کو خوب استعمال کیا تھا اور اس سے وہ سیاسی فائدہ حاصل کرنے میں بھی خوب کامیاب رہے۔

معاہدہ تاشقند کے بعد لاہور کے سیاسی منظر نامے پر جو تبدیلیاں سامنے آئیں ان کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس معاہدے کے بعد حالات جنرل ایوب خان کے ہاتھ سے تیزی سے نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ دوسری طرف ذوالفقار علی بھٹو نے بھی حالات کا بروقت درست ادراک کرتے ہوئے خوب سیاسی فائدہ اٹھایا اور پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے لاہور سے ہی ایک نئی سیاسی جماعت کے قیام کا ڈول ڈال دیا۔ اردو کے وہ آپ بیتی نگار جن کا تعلق سیاست سے تھا انھوں نے اپنی آپ بیتیوں میں پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور اس کے نتیجے میں لاہور کی سیاسی فضا میں ہونے والی تبدیلی کا نقشہ بڑی وضاحت سے کھینچا ہے۔ غلام نبی اپنی آپ بیتی میں لاہور کی سیاسی فضا میں پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے قائم ہونے والی نئی سیاسی جماعت کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۹۶۷ء میں پاکستان پیپلز پارٹی کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۹۶۷ء کو ڈاکٹر مبشر حسن کے گھر منعقد ہوا۔پی پی پی کا روٹی کپڑا اور مکان کا دلکش نعرہ قوم کی امنگوں کے عین مطابق تھا۔۔۔۔۔ بھٹو نے مارچ ۱۹۷۰ء میں ایک یادگار جلسہ موچی دروازہ لاہور میں کیا۔اس جلسے کی طوالت پانچ گھنٹے دس منٹ کے قریب تھی ۔ نمازِ ظہر، عصر اور مغرب کے بعد تک جلسہ جاری رہا۔(۶۵)

غلام نبی کے اس بیان کو دیکھا جائے تو پاکستان پیپلز پارٹی کا قیام اور پھر ابتدائی سالوں میں اس سرگرمیوں کا اہم مرکز بھی لاہور ہی قرار پاتا ہے پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام کے بارے اردو کی دیگر آپ بیتیوں میں بھی تذکرہ ملتا ہے ۔ آپ بیتی نگاروں نے اس قیام کو لاہور کے سیاسی منظرنامے کے ساتھ منسلک کر کے بیان کیا ہے ۔ ابتدا میں ذوالفقار علی بھٹو نے لاہور میں جو سیاسی سرگرمیاں شروع کیں اور ان سرگرمیوں کے تحت جو بڑے بڑے جلسے لاہور میں کیے ، وہ لاہور کی سیاسی فضا میں تحرک پیدا کرنے کے حوالے سے خاصے اہم سمجھے جاتے ہیں۔ آپ بیتی "یہ بازی عشق کی بازی ہے" کی مصنفہ فرخندہ بخاری پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور لاہور کی سیاسی فضا میں ہونے والی تبدیلی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

بھٹو صاحب نے پاکستان پیپلز پارٹی کے نام سے ایک پارٹی بنائی جس کا جلسہ ہمارے شہر لاہور میں ہوا۔ حکومت نے اس کی شدید مخالفت کی ۔ اور وہ سارے حربے جو ہمیشہ حکومت کے خلاف اور مخالف کے حق میں جاتے ہیں، استعمال کیے۔ بھٹو کی پارٹی کو طالب علموں ، استادوں ، مزدوروں اور اصلی سیاسی کارکنوں میں بڑی پذیرائی ملی ۔(۶۶)

لاہور نے ذوالفقار علی بھٹو کو نہ صرف ہاتھوں ہاتھ لیا بلکہ سیاسی حوالے سے ان کا ساتھ بھی بہت دیا۔ جنرل ایوب خان کے سخت اقدامات کے باوجود لاہور والوں کا سیاسی شعور کھل کر اپنا

اظہار کرتا رہا۔ یوں پاکستان پیپلز پارٹی کے قیام اور حکومت میں آنے کے ساتھ ساتھ لاہور کی سیاسی فضا میں بھی خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ جنرل ایوب خان کی آمریت کے خلاف اٹھنے والی ان طاقتور آوازوں کی وجہ سے لاہور کی ملکی سیاست میں اہمیت بڑھتی چلی گئی۔

پاکستانی سیاست کا جائزہ لیا جائے تو ملکی سیاست کے ساتھ ساتھ بلدیاتی سطح بھی اہمیت کی حامل قرار پاتی ہے۔ بلدیاتی نظام مقامی حکومتوں کا نظام ہوتا ہے جس میں اختیارات کی نچلی سطح پر منتقلی ہونے سے عوام کو اپنے مسائل کے حل کے لیے زیادہ دور نہیں جانا پڑتا۔ یہ ایک بہترین سیاسی نظام ہے لیکن پاکستان میں اکثر اوقات اسے مفادات کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا ہے۔ بلدیاتی سیاست پاکستان کے دیگر علاقوں کی طرح لاہور میں بھی ہمیشہ سے موضوع بحث رہی ہے۔ ہر حکومت اپنے مفادات میں نہ صرف بلدیاتی اداروں کو استعمال کرنے کی خواہش مند ہوتی ہے ، بلکہ وہ بلدیاتی اداروں کی تشکیل بھی اپنے مفادات کو مد نظر رکھتے ہوئے اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہے۔ اس ضمن میں جمہوری اور مارشل لاء کی حکومتیں دونوں ہی برابر کی شریک ہیں۔ رانا نذر الرحمٰن نے ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں لاہور میں بلدیاتی سیاست اور ضیاء الحق کی من مانی پالیسیوں پر تنقید کرتے ہوئے اپنے رد عمل کو یوں بیان کیا ہے کہ اُس دور میں بلدیاتی سیاست کا نقشہ بھی سامنے آجاتا ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ضیاء الحق کی مارشل لاء حکومت نے صوبے میں پنچایتی نظام رائج کرنے اور بلدیاتی اداروں میں شہریوں کو نامزد کرنے کا اعلان کیا تو میں نے سب سے پہلے اس کا نوٹس لیا۔ کیونکہ یہ نظام انگریز کے غلامانہ دور کی یادگار تھا جو انہوں نے مخصوص مفادات کے تحت قائم کیا تھا۔ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو ایک پریس کانفرنس میں حکومت کے اس اعلان کی بھرپور مخالفت کی اور مطالبہ کیا کہ بلدیاتی اداروں کو خود مختار حیثیت سے کام کی آزادی دینے کے لیے فوری طور پر بلدیاتی انتخابات کرائے جائیں۔(٦٧)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتیوں میں لاہور کی سماجی اور سیاسی صورت حال کی تصویر کشی بڑے جاندار انداز میں کی گئی ہے۔ سماجی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے مختلف ادبی اور غیر ادبی آپ بیتیوں کے تخلیق کاروں نے لاہور کے اس حقیقی سماجی منظر نامے کو پیش کیا ہے جو تقسیم سے قبل اور قیام پاکستان کے بعد بھی کئی سالوں تک قائم رہا۔ یہ سماجی منظر نامہ متنوع جہات کا حامل تھا۔ ایک طرف اس میں مذہب اور قوم کی تفریق سے ماورا ایسا مشترکہ سماج تشکیل پارہا تھا جس میں بسنے والے آپس میں گہرے سماجی روابط کے حامل تھے۔ ایک دوسرے کی خوشی اور غمی میں شریک ہوتے تھے اورایک دوسرے کا دکھ درد بھی بانٹتے تھے۔ دوسری طرف اسی مشترکہ سماجی منظرنامہ میں ایسے عناصر بھی موجود تھے جن کے نزدیک مذہب، دھرم اور قومیت کا تصور سماجی روابط سے زیادہ مضبوط تھا۔ آپ بیتی نگاروں نے ان دونوں طرح کے عناصر کا کھوج لگا کر اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے۔ اس کے علاوہ لاہور کے مختلف سماجی پہلو مثلاً وہاں کے لوگوں کے اندازِ بود وباش، خورونوش، شادی بیاہ، تن سازی، رشتے ناتے بھی ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ کسی بھی سماج میں جہاں بہت سے مثبت اور مفید عناصر سماج کی درست خطوط پر تشکیل کر رہے ہوتے ہیں وہاں بعض منفی عناصر بھی اس سماج میں پائے جاتے ہیں جو سماج میں منفی اور مضر سرگرمیوں کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں۔ لاہور جیسے اہم اور قدیم تاریخی شہر میں بھی ایسے منفی عناصر موجود ہیں جو اپنی منفی سرگرمیوں کی وجہ سے سماجی منظر نامے میں بگاڑ کا باعث بنتے ہیں۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کا مثبت چہرہ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ سماج کے ایسے منفی عناصر کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے، جن کی وجہ سے لاہور کا سماج متاثر ہوتا رہا ہے اورآج بھی وہ عناصر اس شہر میں سرگرم ہیں۔ یوں اردو آپ بیتوں میں لاہور کی سماجی صورت حال کی عکاسی میں غیر جانب داری کا عنصر پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لاہور کے شہر میں سماجی سطح پر پائی جانے والی طبقاتی تفریق بھی لاہور کے سماج کو جس طرح متاثر کرتی ہے، اردو آپ بیتیوں

اور یادداشتوں میں اس کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یوں یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں لاہور کی بدلتی ہوئی سماجی صورت حال کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کی اوراہم جہت سیاسی جہت بھی ہے۔ وہ آپ بیتیاں جو سیاسی افراد نے تحریر کی ہیں ان میں یہ جہت زیادہ مضبوط دکھائی دیتی ہے۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے حوالے سے لاہو ر کی سیاست اور عہد بہ عہد اس میں ہونے والی تبدیلیوں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کے سیاسی منظرنامے کو بھی ان آپ بیتی نگاروں نے بڑے جاندار انداز میں پیش کیاہے۔ یوں یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں لاہور کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی سیاسی اور سماجی صورت حال کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ظفر برادرس تاجرانِ کتب، لاہور، ۱۹۲۷ء، ص ۲

۲۔ ابو الفضل علامی ، آئین اکبری ،(مترجم محمد فدا علی طالب)، جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدر آباد دکن، ۱۹۳۹ء، ص ۱۰۲۰

۳۔ غافر شہزاد، لاہور: گھر، گلیاں، دروازے، ادراک پبلی کیشنز، لاہور، اگست ۲۰۰۲ء، ص ۲۱

۴۔ محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ص ۹

۵۔ سینٹ تھامس، بحوالہ، غافر شہزاد، لاہور؛ گھر، گلیاں اور دروازے، ص ۲۷

۶۔ الیگزینڈر برنیز، بحوالہ، غافر شہزاد، لاہور؛ گھر، گلیاں اور دروازے، ص ۲۷

۷۔ غافر شہزاد، لاہور: گھر، گلیاں، دروازے، ص ۷۵

۸۔ ایضاً، ص ۸۷

۹۔ یونس ادیب، میرا شہر لاہور، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۲۱۶

۱۰۔ غافر شہزاد، لاہور: گھر، گلیاں، دروازے، ص ۸۷

۱۱۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء، ص ۳۱

۱۲۔ مرزا ادیب، مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۴ء، ص ۱۴۰

۱۳۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص ۴۷

۱۴۔ شریف مستری، انٹرویو، مشمولہ ،مٹتا ہوا لاہور، مرتبہ ،منیر احمد منیر، ماہنامہ آتش فشاں، لاہور، ۲۰۱۹ء، ص ۲۵۶

۱۵۔ محمد سعید، آہنگ بازگشت ، کمانڈو پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۳۵

۱۶۔ ایضاً، ص ۵۹

۱۷۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۳۱

۱۸۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ، ۲۰۲۰ء، ص ۴۳

۱۹۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ۳۳

۲۰۔ محمد سعید، آہنگ بازگشت، ص۵۹

۲۱۔ ایضاً، ص۲۸

۲۲۔ ایضاً، ص۲۸

۲۳۔ ایضاً، ص۴۸

۲۴۔ ایضاً، ص۴۵

۲۵۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۶۴

۲۶۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص۱۰۲

۲۷۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص۴۶

۲۸۔ ایضاً، ص۵۱-۵۲

۲۹۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص۱۱۸

۳۰۔ اے حمید، یادوں کے گلاب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۲

۳۱۔ احسان دانش، جہانِ دانش، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۱۰۶

۳۲۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، ص۱۴۸

۳۳۔ رانا نذرالرحمٰن، صبح کرنا شام کا، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت دوم ۲۰۱۶ء، ص۲۵۷

۳۴۔ سید مینو چہر، میرے شب وروز، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص۱۵۷

۳۵۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، القا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص۲۱۹

۳۶۔ ایضاً، ص۲۲۵

۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص۳۹

۳۸۔ ایضاً، ص۱۰۰

۳۹۔ ایضاً، ص۱۷۴

۴۰۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص۴۸

۴۱۔ ایضاً، ص۴۹

۴۲۔ ایضاً، ص۴۹

۴۳۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص۲۰۱

۴۴۔ ایضاً، ص۲۲۲

۴۵۔ خلیق ابراہیم خلیق، منزلیں گرد کے مانند، فضلی سنز، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص۵۲۲

۴۶۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۲۲۲-۲۳۲

۴۷۔ محمد سعید، آہنگ بازگشت، ص۳۷

۴۸۔ ایضاً، ص۴۰-۴۱

۴۹۔ ایضاً، ص۱۴۵

۵۰۔ ایضاً، ص۱۶۳

۵۱۔ غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ، ۲۰۰۴ء، ص۵۸

۵۲۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، ص۲۶-۲۷

۵۳۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، ص۲۴۰

۵۴۔ ایضاً، ص۲۴۱

۵۵۔ غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، ص۸۶

۵۶۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، ص۴۶

۵۷۔ غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، ص۱۱۵

۵۸۔ صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان: تاریخ وسیاست (۸۸ء- ۱۹۴۷ء)، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰، ص۲۸۸

۵۹۔ غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، ص۱۲۹

۶۰۔ رانا نذر الرحمٰن، صبح کرنا شام کا، ص۳۲۹

۶۱۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سر گزشت، ص ۱۴۵

۶۲۔ ابوالحسن نغمی، یہ لاہور ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۳۳۷

۶۳۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، ص ۵۵

۶۴۔ محمد سعید، آہنگ بازگشت، ص ۴۵۲

۶۵۔ غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، ص ۱۳۸

۶۶۔ فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، ص ۵۵

۶۷۔ رانا نذر الرحمٰن، صبح کرنا شام کا، ص ۲۹۸

باب سوم

لاہور کی ثقافتی صورتحال: اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں

الف۔ لاہور بطور ثقافتی مرکز: اجمالی جائزہ

پنجاب کا خطہ شروع ہی سے تہذیب وثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں بسنے والے افراد نہ صرف مختلف اقوام سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ مختلف مذاہب کے بھی پیروکار ہیں۔ ان مذاہب اوراقوام کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار نے اس خطے کو تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے متنوع رنگ بخشے ہیں۔ لاہور جو کہ پنجاب کا دل مانا جاتا ہے، ثقافتی حوالے سے ایک اہم مرکز ہے۔ قدیم شہر ہونے کی وجہ سے قیامِ پاکستان سے قبل بھی اس کی ثقافتی اہمیت مسلّم تھی۔ قیام پاکستان سے قبل یہ شہر مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا مسکن تھا جس میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ عیسائی، ہندو اور سکھ بھی کثیر تعداد میں آباد تھے۔ ان مذاہب کی مذہبی عبادات کے مقامات، ان کے مذہبی تہوار اور پھر لاہور شہر کے موسمی تہوار مل کر اس شہر کو ثقافتی حوالے سے ایک مرکز کی حیثیت عطا کرتے تھے۔ اگرچہ جدید عہد کالاہور بھی ثقافتی اقدار کے حوالے سے اپنا ایک خاص مقام رکھتاہے اوراس شہر کی ثقافتی اقدار پنجاب کی ثقافتی اقدار کی نمائندگی کرتی ہیں، تاہم قیام پاکستان سے قبل کے ثقافتی منظرنامے کے رنگ آج کے لاہور میں مدھم پڑ چکے ہیں۔

لاہور کی ثقافتی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو اس خطے نے صدیوں سے اپنی ثقافتی روایات اور ثقافتی اقدار کو برقرار رکھاہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ شہر ایک مرکزی شہر ہونے کے باوجود مختلف ادوار میں امن وامان کے حوالے سے اہم رہاہے۔ اس کے علاوہ اس کے جغرافیائی خدوخال، یہاں کے موسمی تہوار، یہاں بسنے والے لوگوں کی مذہب سے وابستگی اوراس سے آگے بڑھتے ہوئے مختلف ادوار میں یہاں تعمیر ہونے والی عمارات اور ان کا تہذیبی وثقافتی پس منظر اس شہر کی ثقافتی اہمیت

کو اجاگر کرتے ہیں۔ ہر عہد میں لاہور ایک اہم ثقافتی مرکز کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ اگرچہ مختلف ادوار میں اس کی ثقافتی صورت حال میں تبدیلی آتی رہی ہے اور یہاں بسنے والے لوگوں کے تہذیبی اور ثقافتی رویوں نے تنوع کی صورت اختیار کیے رکھی ہے، تاہم یہ تبدیلی بھی اس کے ثقافتی حسن میں اضافے کا باعث ہی بنتی رہی ہے۔ڈاکٹر نسیمہ رحمان لاہور کی ثقافتی اہمیت سے آگاہی دلاتے ہوئے لکھتی ہیں:

> لاہور جس کا شمار دنیا کے قدیم اور مشہور شہروں میں ہوتا ہے، جہاں ہندو راجاؤں، سلاطین، مغل شہنشاہوں، سکھ بادشاہوں اور برطانوی مقتدروں نے حکومت کی۔ یوں بلاشبہ یہ شہر صدیوں سے ہندوستان کے سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی مراکز میں سے ایک رہاہے۔اس شہر کو ایسا آئینہ قرار دیاجائے تو بے جا نہ ہوگا جس میں پنجاب کی رنگارنگ زندگی کی ہر کرن اسی شہر سے منعکس ہوتی ہے۔(۱)

ڈاکٹر نسیمہ رحمان نے لاہور کی تاریخی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اسے ایک ایسے شہر کا مرتبہ دیاہے جس میں پنجابی تہذیب وتمدن اور ثقافت کے رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

مغلیہ عہد سے قبل لاہور میں جن مذاہب کے ماننے والے آباد تھے ان میں مسلمان، ہندو اور سکھ مذہب کے لوگ زیادہ تھے۔ ان مذاہب کے ماننے والوں نے اپنے مذہب کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کے لیے جو مذہبی عبادت گاہیں تعمیر کر رکھی تھیں وہ ایک طرف مذہبی ضروریات پوری کرتی تھیں تو دوسری طرف لاہور کی ثقافتی اہمیت کو بھی بڑھاتی تھیں۔ ان مذہبی عبادات کے فن تعمیر اور پھر ان میں ہونے والے مختلف مخصوص مذہبی تہوار کسی مذہب کے ماننے والوں کی ثقافتی اقدار کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ شہر لاہور کے ثقافتی منظر نامے کو مزید خوبصورت بناتی تھیں۔لاہور کی تہذیبی اور ثقافتی انفرادیت اس حوالے سے زیادہ اہم قرار پاتی ہے کہ اس شہر میں بسنے والے لوگ اپنی تہذیب اوراپنے کلچر سے محبت کرنے والے ہیں۔ وہ دوسروں کی نقالی کی بجائے جیسا بھی ہے اپنا کلچر اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ تہذیبی اور ثقافتی رویے آگے چل کر ثقافتی فضا کی تشکیل میں معاون

ہوتے ہیں۔ "سوہنا شہر لاہور" کے مصنف طاہر لاہوری ، لاہور کی انفرادیت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور دنیا میں ایک منفرد شہر ہے۔لاہور میں صدیوں سے آباد لوگوں کا اپنا ایک مزاج ہے، اپنا ایک منفرد کلچر ہے، رہنے سہنے کا ایک پیارا انداز ہے، عزت و آبرو کے جذبوں میں اپنا ایک جداگانہ ڈھنگ ہے۔ زبان وبیان میں اپنا ایک خوب صورت رنگ ہے ، ہنسی مذاق کے انداز،لباس، خوراک اورچال ڈھال کے اپنے انداز اپناوقار اوراپنے جذبات ہیں ۔ غیرت، ناموس، ہمدردی ، انس، محبت اور دوستی کا اپنا ایک الگ خوب صورت انداز ہے۔(۲)

طاہر لاہوری نے یہاں لاہور کی انفرادیت ثابت کرنے کے لیے جن عناصر کی نشاندہی کی ہے، بنظر غائر مشاہدہ کیاجائے تو یہ عادات واطوار کسی بھی سماج میں ثقافتی اقدار کا درجہ رکھتے ہیں۔انھی سے ثقافت کی تعمیر وتشکیل ہوتی ہے۔ طاہر لاہوری نے لاہور کی باسیوں کی انفرادیت کو نمایاں کرتے ہوئے اس شہر کی ثقافتی اقدار کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

لاہور کی ثقافتی زندگی نے مغلیہ عہد میں بہت ترقی کی ۔ اس عہد میں مغل شہنشاہوں نے نہ صرف یہاں فنِ تعمیر کے عمدہ نمونے کھڑے کیے بلکہ مجموعی ثقافت کو فروغ دینے میں بھی اہم کردار کیا۔ خاص طور پر جب جہانگیر کی وفات ہوئی اور اسے لاہور میں دفن کیا گیا تو اس کے بعد نور جہاں نے لاہور میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ لاہور میں نور جہاں کی مستقل سکونت نے بھی اس شہر کو خاصی اہمیت کا حامل بنادیا اورایک ملکہ کی یہاں سکونت کی وجہ سے شاہی خاندان کا رجحان بھی اس شہر کی طرف پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ خلیق ابراہیم خلیق اپنی آپ بیتی میں مغلیہ عہد میں لاہور کی تہذیب وثقافت کے فروغ پانے اور اس عمل میں مغلوں کے کردار کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتے ہیں:

لاہور نہ صرف جہانگیر اور نور جہاں کا پسندیدہ شہر تھا بلکہ سارے مغل بادشاہ اس شہر سے لگاؤ رکھتے تھے اور گوناگوں وجوہ سے اسے اہمیت دیتے تھے۔ مغلوں کے ذوقِ جمال اور نفاستِ مزاج نے اس شہر کو بھی چار چاند لگادیے تھے۔ ان کے اقتدار اوران کی تہذیب وثقافت کے غیر منقولہ آثار، یادگار تاریخی عمارتوں اور باغات کی صورت میں دہلی اور آگرے کے بعد سب سے زیادہ لاہور میں دیکھے جاسکتے ہیں۔(۳)

مغل شہنشاہوں نے لاہور سے خصوصی لگاؤ ہونے کی وجہ سے اس شہر بے مثال کے ثقافتی حسن کو ترقی دینے کے لیے بہت اقدامات کیے۔ انھوں نے نہ صرف یہاں فنِ تعمیرات کے عمدہ نمونے تیار کروائے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر باغات، سڑکیں اور خوبصورتی کی دیگر اشیا کی طرف بھی خصوصی توجہ دی جس کی وجہ سے لاہور کا حسن یوں نکھر گیا کہ ہر طرف ثقافتی رنگوں کی بہار دکھائی دینے لگی۔ طاہر لاہوری ، لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں کی کتاب "سوہنا شہر لاہور" میں مغلوں کے طرزِ تعمیر اورلاہور کے ثقافتی حسن کو نکھارنے کے حوالے سے کیے گئے اقدامات کا نقشہ یوں کھینچتے ہیں:

مغلوں نے شہر کی فصیل ہر دروازے اور خندق کے کناروں پر ایک عجیب اورخوب صورت دائرہ تعمیر کیا تھا۔ جس کے درمیان سڑک بھی تھی ، دائرے میں باغات کا سلسلہ تھا، گھاٹ تھے ،باؤلیاں تھیں جیسے جنت کی فضا نے شہر کو اپنی آغوش میں لپٹایا ہوا ہے۔ مغلوں کے دور میں فنِ تعمیر کی لگن نے جو فن پارے تخلیق کیے ، صدیاں گزرنے پر بھی اپنے چہروں کی خوشنمایاں پھولوں کی طرح تروتازہ رکھے ہوئے ہیں۔(۴)

لاہور کی ثقافت کے حوالے سے یہاں کے مذہبی تہواروں کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ کسی بھی ثقافتی منظر نامے میں اس خطے کے مذہب کا کردار ہمیشہ سے رہاہے۔ ہر مذہب کے ماننے والوں کے

مذہبی تہوار جہاں ان کی مذہب سے عقیدت اور وابستگی کا ثبوت ہوتے ہیں وہیں ان کا ثقافتی عمل دخل بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ لاہور ایک ایسا شہر ہے جو مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں اور عیسائیوں کے مشترکہ سماجی منظرنامے کا عکاس ہوتا تھا۔ اس کی تاریخ میں ان مذاہب سے تعلق رکھنے والے افراد کا مشترکہ سماجی نظام اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ یہاں کے باسیوں نے اپنے اپنے مذاہب سے منسلک رہتے ہوئے اپنے مذہبی تہواروں کے ذریعے اس شہر کے ثقافتی منظرنامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ مرزا ادیب اپنی آپ بیتی میں کل اور آج کے مذہبی تہواروں میں بدلاؤ پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میلہ چراغاں کی اب پہلی جیسے رونق نہیں رہی ایک زمانہ تھا اور یہ زمانہ ماضی بعید کا نہیں ماضی قریب کا ہے جب لاہور کے ارد گرد کے دیہی علاقے میلہ چراغاں بڑے وثوق اور بڑے اہتمام سے مناتے۔ ہفتوں پہلے اس کی تیاری شروع ہو جاتی تھی اور اس وقت یہ میلہ لاہور ہی کا نہیں پنجاب کا سب سے بڑا میلہ تصور کیا جاتا تھا۔ وقت وقت کی بات ہے یہ میلہ آج کل بھی منایا جاتا ہے مگر اب میلے میں شریک ہونے والے اس ولولے، اس شوق فراواں اور اس والہانہ جذبے سے بہت حد تک محروم ہیں جو سالہا سال بیشتر معاشرے کی اجتماعی زندگی کا حصہ بن گیا تھا۔ (۵)

عرس اور درباروں پر میلوں کی روایات لاہور کی قدیم ثقافتی روایات ہیں۔ یہ ثقافتی روایات قدیم بزرگوں کے درباروں پر لگنے والے عرس میلوں سے شروع ہوئیں اور آج تک جاری ہیں۔ یوں ان کی قدامت لاہور کی ثقافت کی قدامت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ تحقیقات چشتی کے مصنف نور احمد چشتی، شاہ سربانی چشتی المشہور شاہ سروانی کے عرس کے بارے میں لکھتے ہیں:

سال بھر میں دو دفعہ یہاں میلہ ہوتا ہے۔ ایک بتاریخ نہم ماہ صفر المظفر، اور دوسرا نہم ربیع الاول۔ باعث اس کا یہ ہے کہ نہم صفر کو تو آپ کا وصال ہوا اس باعث سے عرس ہوتا ہے اور نہم ربیع الاول کو آپ دفن کیے گئے اس لحاظ سے دوسرا عرس بھی اس دن ہوتا ہے۔ اور بروز عرس یہ دستور ہے کہ نہم صفر کو تو پلاؤ پکاتے ہیں اور ملایان مساجد کو بلا کر فاتح ہوتا ہے اور نہم ربیع الاول کو نان گوشت فقرا میں تقسیم ہوتا ہے یعنی پنڈھارا تقسیم ہوتا ہے۔ اور تمام رات گدی نشین فقرا جمع ہوتے ہیں۔(٦)

لاہور کے ثقافتی رنگوں میں عرس اور مختلف درباروں پر لگنے والے میلوں کے ثقافتی رنگ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ لاہور میں کئی دربار ہیں اور ان پر عرس اور میلے سال کے مختلف اوقات میں جاری رہتے ہیں۔ عقیدت مند نہ صرف ان میلوں اور عروس میں شرکت کرتے ہیں بلکہ ایک ایسا ثقافتی سماں بھی پیدا کر دیتے ہیں جو اس شہر کی ثقافتی اہمیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ یہ سلسلہ موجودہ عہد سے نہیں بلکہ قدیم عہد سے جاری ہے۔ تقسیم سے کئی صدیاں قبل بھی لاہور کا ثقافتی تشخص ان عروس اور میلوں سے ابھرتا تھا۔ تحقیقات چشتی میں قدیم لاہور کے ایک اور بزرگ شاہ کنٹھ صاحب کے عرس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہاں کے ثقافتی رنگوں کو یوں نمایاں کیا گیا ہے :

بروز عرس بھنڈارہ رات کو ہوتا ہے ۔ دوسرے روز ناچ کنجریاں اور مجلس ہوتی ہے۔ عرس کے روز کوئی بڑا میلا تو یہاں نہیں ہوتا البتہ اشخاص متعددہ جاتے ہیں، ناچ راگ رنگ دیکھ کر چلے آتے ہیں۔(۷)

اس بیان سے ظاہر ہوتا کہ لاہور کے مختلف علاقوں میں مسلمان مذہب کے ماننے والوں کے ہاں مختلف درباروں پر عرس اور میلے کا اہتمام کرنا قدیم ثقافتی روایات ہیں۔ اس سے اس شہر کی ثقافتی قدامت کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

مسلمانوں کے علاوہ لاہور کے ثقافتی منظر نامے میں مذہبی حوالے سے ثقافتی رنگ آمیزی کرنے میں ہندوؤں کا بڑا عمل دخل ہے ۔ ہندو مذہب ہندوستان کا قدیم مذہب ہونے کے ساتھ ساتھ اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات کا بھی امین ہے ۔ اس مذہب کے ماننے والوں کے تہوار مذہب کے ساتھ ساتھ ان کے ثقافتی رنگوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں ۔ لاہور میں قیامِ پاکستان سے قبل ہندو اور سکھ بھی بڑی تعداد میں آباد تھے ۔ ان کے اپنے تہوار تھے جو لاہور کی ثقافت کا اہم عنصر بھی سمجھے جاتے تھے ۔ ان تہواروں میں مذہبی عناصر کے ساتھ ساتھ ثقافتی رنگ بھی نمایاں ہوتے تھے ۔ ان تہواروں کے پس منظر میں چوں کہ علاقائی ثقافتی رنگوں سے زیادہ مذہبی عقیدت شامل ہوتی ہے ، اس لیے ایسے تہوار سماج اور قوم کے ہر طبقے کے لوگ بڑے جوش و خروش سے مناتے ہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مذہبی تہوار موسمی تہواروں کی نسبت زیادہ اہمیت کے حال ہوتے ہیں ۔ ہندوؤں کے مذہبی تہواروں میں بعض رسومات ایسی بھی شامل ہوتی ہے جو سماجی اور ثقافتی حوالے سے خاص اہمیت رکھتی ہیں ۔ دیوالی ہندوؤں کا ایک اہم تہوار ہے ۔ قیامِ پاکستان سے قبل کے لاہور کے ثقافتی منظر نامے میں اس کی اہمیت کا جائزہ لیا تو یہ تہوار اگرچہ ہندو گھرانوں میں منایا جاتا تھا لیکن اس میں مذہبی عقیدت کا عنصر شامل ہونے کی وجہ سے اس کے ثقافتی رنگ پورے لاہور کو اپنے سحر میں جکڑ لیتے تھے ۔ اس تہوار کی ثقافتی اہمیت کو بیان کرتے ہوئے اے حمید اس کے ذریعے پروان چڑھنے والی ثقافتی اقدار کو یوں نمایاں کرتے ہیں :

> دیوالی کا تہوار سات دن تک جاری رہتا ۔ اس دوران لاہور شہر کے ہندو اپنے مکانوں پر چراغ روشن کرتے ۔ انارکلی ، گوالمنڈی اور شاہ عالمی دروازے کے گلی کوچے برقی قمقموں کی روشنی میں جگ مگ جگ مگ کیا کرتے تھے ۔ ہندو محلوں کی دکانیں ساری ساری رات کھلی رہتی تھیں ۔ ہندو حلوائی قسم قسم کی مٹھائیاں بناتے ۔ دیوالی کی تقریبات میں ہندوؤں کے ساتھ ساتھ سکھ بھی شریک ہوتے تھے ۔ مٹھائیوں کے ٹوکرے بھر بھر کر ایک دوسرے کے گھروں میں لے جاتے تھے ۔ ہندو

سکھ مٹھائیوں کی ٹوکریاں اپنے مسلمان ہمسائیوں اور دوستوں کو بھی بھیجتے تھے ۔ ہندوؤں کے مندر خاص طور پر سیتلا مندر اور جین مندر ساری ساری رات ہفتہ بھر برقی قمقموں سے روشن رہتے تھے۔ بچوں کو کھلونے تحفے میں دیے جاتے ۔ آتش بازی چھوڑی جاتی تھی۔ پٹاخے چلائے جاتے تھے۔(۸)

دیوالی کے تہوار پر لاہور میں جگہ جگہ ثقافتی رنگ بکھرتے چلے جاتے جاتے تھے۔ ہندوؤں کا یہ تہوار گہری عقیدت کے ساتھ منایا جاتا تھا۔ اس رات کی تقریبات کے ساتھ ساتھ دن میں جو اہتمام کیا جاتا تھا، اس سے بھی ثقافتی رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں ۔ یہ ثقافتی رنگ لاہور کے ساتھ ساتھ ہندو ثقافت کی بھی بہترین عکاسی کرتے ہیں۔ رات کو چراغ جلانے، آتش بازی کرنے، مٹھائیاں تقسیم کرنے کے علاوہ دن میں یہ تہوار جو ثقافتی رنگ بکھیرتا تھا ان کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

دن میں گوالمنڈی اور انارکلی میں جھانکیاں نکلتی تھیں۔ یہ تانگوں اور گڈوں پر مشتمل جلوس ہوتا تھا جن میں ہندو لڑکے لچھمن سیتا اور رام چند کا بہروپ بھرے سروں پر تاج کھڑے ہوتے تھے۔ ہندوؤں کی ٹولیاں ڈھول اور چھنے بجاتی بھجن گاتی ساتھ ساتھ چلتی تھیں۔ ہر چوک میں جھانکیاں کھڑی ہو جاتیں اور ہندو سیتا جی اور رام چندر جی کی بن باس سے واپسی کی خوشی میں خاص طور پر لکھوائے گئے گیت اور بھجن گاتے۔ ہندو عورتیں اجلی سفید اور رنگ برنگ کی ساڑھیوں میں ملبوس سیتلا مندر کی درگاہ دیوی کے درشن کرنے اور ماتھا ٹیکنے قطار در قطار جاتی نظر آتی تھیں۔(۹)

مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہواروں کے علاوہ لاہور میں بسنے والے سکھوں اور عیسائیوں کے تہواروں کے موقع پر ثقافتی فضا میں رنگ آمیزی پیدا ہو جاتی تھی۔ یوں لاہور کا ثقافتی منظر نامہ مختلف

مذاہب کے ماننے والوں اور مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والوں لوگوں کے ذریعے اس طرح تشکیل پاتا تھا کہ لاہور برصغیر میں ایک اہم ثقافتی مرکز کی حیثیت سے ابھرتا چلا گیا۔

مذہبی حوالے سے ثقافتی منظرنامے کا جائزہ لیاجائے تو برصغیر کے دوسرے مختلف علاقوں کی طرح لاہور کی ثقافت میں محرم اور اس میں نکلنے والے مختلف تعزیے اور ماتمی جلوسوں کا کردار بھی اہمیت کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ محرم نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے لیے انتہائی عقیدت کا مانا جاتا ہے۔" ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین" کے مصداق حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت برصغیر کے مختلف مذاہب کے ماننے والوں کے نزدیک تاریخ کا ایک اہم اور المناک واقعہ ہے۔لاہور میں اس موقع پر نکلنے والے ماتمی جلوس، تعزیے اور دیگر مجالس وغیرہ مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ اس شہر کے ثقافتی منظرنامے میں بھی کئی حوالوں سے اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ریحانہ کوثر محرم کی ان تقریبات کی لاہور کی ثقافت میں حصہ داری پر بات کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھتی ہیں:

> اگرچہ لاہور میں عزاداری اور امام بارگاہوں کی کوئی مستند تاریخ نظر نہیں آتی جس سے معلوم ہو کہ یہاں اس کا آغاز کب ہوا۔ لیکن مغلوں کے دور میں شروع ہونے والی عزاداری لاہور کی روایت، تہذیب اور ثقافت کا حصہ بن گئی۔(۱۰)

اردو ادب کے اہم ناقدین اور تخلیق کاروں نے بھی محرم اور لاہور کی ثقافت میں تعلق کو نمایاں کیاہے ۔ اس حوالے سے ہم یہاں شمس الرحمٰن فاروقی کے اس بیان پر اکتفا کریں گے جو انھوں نے لاہور میں محرم کا چاند نظر آنے کے بعد ہونے والی مذہبی اور ثقافتی رسومات کو بیان کرتے ہوئے دیا۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> محرم کا چاند دکھائی دینے میں کچھ دن باقی تھے لیکن لاہور میں حضرت خلد منزل شاہ عالم بہادر شاہ اول۔۔۔ کی ڈالی ہوئی رسم کے اتباع میں

> محرم کا اہتمام زیادہ ہونے لگا تھا۔ سیاہ کپڑوں، پٹکوں، دوپٹوں اور سیاہ مخمل کی جوتیوں کے ساتھ ساتھ پیش قبضوں اور خنجروں کے لیے سیاہ ڈابوں کی تلاش ہونے لگی ۔ عزاخانوں کی صفائی تپائی ہونے لگی۔ بچے، بوڑھے ،جوان ، عورت، مرد بلالحاظ مذہب وملت مرثیوں اورنوحوں کی بیاض کو جھاڑ پونچھ کر تیار اورپہلے سے یادہ کیے ہوئے رثائی کلام کواپنے اپنے حافظوں میں تازہ کرنے لگے ۔ ہیر امنڈی کے ارباب نشاط کے بالا خانوں سے بھی اب ماتمی دھنیں بلند ہونے لگیں۔(۱۱)

محرم میں پہنے جانے والے مخصوص رنگ کے ملبوسات، اس موقع پر نکلنے والے جلوس، شبیہات، اور دیگر امور مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ ثقافتی رنگوں کو بھی نمایاں کرتے ہیں۔ ان دنوں لاہور سمیت پورے خطے کی فضا ایک خاص رنگ میں رنگی دکھائی دیتی ہے۔

لاہور کی ثقافتی زندگی کو پروان چڑھانے میں مغلیہ عہد نے اہم کردار ادا کیا۔ طویل عرصہ تک ہندوستان پر حکومت کرنے والے مغلیہ خاندان نے یہاں کے نظم ونسق کے ساتھ ساتھ اس خطے کی ظاہری خوب صورتی ، سماجی ، تہذیبی اور ثقافتی اہمیت میں بھی اضافہ کیا۔ مغلیہ عہد میں لاہور کی ثقافتی زندگی میں ایک بڑا اضافہ یہاں فن مصوری، خطاطی اور فن تعمیرات کی صورت میں سامنے آیا۔ تقریباً تین سو سال تک اس خطے پر حکومت کرنے والے مغلیہ خاندان نے اپنے دورِ حکومت میں لاہور کو خاص پذیرائی بخشی ۔ خاص طور پر اکبر کے عہد میں اس شہر کی ثقافتی صورت حال میں خاصی تبدیلی واقع ہوئی۔ اکبر ایک حسن پرست بادشاہ تھا۔ حسنِ زن کے ساتھ ساتھ وہ زندگی کی ہر چیز میں حسن کا متلاشی تھا۔ اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لیے اس نے فنِ تعمیرات میں بھی وہ شاہکار شامل کروائے جن کا حسن اور رعنائی صدیوں گزرنے کے بعد آج بھی دیدہ زیب ہے۔ اکبر نے اپنے عہد میں لاہور کی ثقافتی صورت حال میں جو تبدیلی پیدا کی ، وہ فنون کے حوالے سے ہے۔ خوب صورت عمارات کی

تعمیرات کے دوران ماہرینِ فن کی ہنرمندی سے اس شہر کی تہذیبی اور ثقافتی صورت حال میں جو تبدیلی واقع ہوئی اس بارے میں ڈاکٹر نسیمہ رحمان کی یہ رائے صائب معلوم ہوتی ہے کہ:

> اکبر نے فن مصوری، فن خطاطی، نگینہ کار، سنگ تراشی اورآرائشی کندہ کاری اور چوب کار ی کے فن کی خوب حوصلہ افزائی کی ،چنانچہ اکبر نے قیام لاہور کے دوران اپنے پسندیدہ مصور، خطاط، شاعر، ادیب، عالم وفاضل، تاریخ نویس لاہور بلالیے اس طرح لاہور اہلِ ہنر وفن کا مرکز بن گیا۔(۱۲)

اکبر نے اگرچہ سرکاری عمارات کی تعمیرات کے لیے لاہور میں ماہرین فن اکٹھے کیے تھے لیکن جب وہ یہاں سکونت پذیر ہوگئے تو عام زندگی میں بھی تبدیلی آنے لگی۔ یہ ایک سماجی رویہ ہے کہ سرکاری سطح پر اور اشرافیہ کی سطح پر ہونے والے امور کی عوام بھی پیروی کرتی ہے۔ اور اکبر کا تو شوق ہی ثقافتی اور تہذیبی نوعیت کا تھا، پھر اسے عوام میں پذیرائی کیسے حاصل نہ ہوتی۔ نتیجے میں لاہور شہر میں نجی سطح پر ہونے والی تعمیرات میں بھی وہی حسن اور رعنائی جھلکنے لگی جسے اکبر نے رواج دیا۔ یوں اکبر کے عہد میں لاہور فنِ تعمیرات اور دیگر کئی حوالوں سے لاہور کے ثقافتی منظر نامے میں وسعت آتی گئی۔ اس کے بعد بھی لاہور کی ثقافتی اہمیت کبھی کم نہ ہوئی۔

لاہور کے ثقافتی منظر نامے پر تبدیلی اس وقت پیدا ہوئی جب انگریزوں نے اس خطے پر قدم رکھا۔ انگریزوں نے جہاں برصغیر کے سیاسی وسماجی نظام پر گہرے اثرات مرتب کیے وہاں تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے کو بھی متاثر کیا۔ انگریز ایک جدا ثقافت کے حامل تھے۔ ان کا طرزِ زیست بھی قدیم لاہوریوں سے مختلف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انھوں نے لاہور میں قدم رکھا تو اسے ثقافتی تغیر کا سامنا کرنا پڑا۔ سوم آنند اس ثقافتی تغیر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> رنجیت سنگھ کے بعد لاہور میں انگریز آئے جنھوں نے یہاں کے رنگ روپ کو مغربی طرز کا نکھار دینا شروع کیا۔ شہر کی توسیع ہوئی، نئی نئی

سڑکیں بنیں اوروقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میکلوڈروڈ، ہال روڈ،نسبت روڈ، بیڈن روڈ جیسے غیر مانوس نام زبان زدہوگئے ۔ اس طرح سے شہر کے وہ باہری علاقے جو کبھی ویرانے کامنظر پیش کرتے تھے آباد ہوئے ۔ ۱۸۵۱ء میں لاہور کی وہ مشہور سڑک بنی شروع ہوئی جسے کچھ عرصہ پہلے تک مال روڈ کے نام سے یاد کیاجاتا تھا اور جس کے بازاروں کی روشنیوں نے پنجاب کی راجدھانی کو انگریزوں کا شہر بنادیا۔اس زمانے میں یہاں شرفا کاایک نیاطبقہ وجود میں آیا۔ یہ سب انگریز تھے ۔ ان میں زیادہ تعداد سرکاری افسروں کی تھی ۔ لاہور کی اس اونچی سوسائٹی کی تڑک بھڑک گول باغ میں دیکھی جاسکتی تھی جہاں شام کے وقت ہفتے میں دوبار بینڈاور حکمران طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ لباس پہن کر دیکھنے والوں کو مرعوب ومتاثرکرنے کے لیے جمع ہوتے۔(۱۳)

یہ ثقافتی تغیر بھی لاہور کو ایک اہم ثقافتی مرکز میں ڈھالنے کا ذریعہ ثابت ہوا۔ وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ جونئے رجحانات سامنے آئے انھوں نے آگے چل کر لاہور کی ایک ایسی ثقافتی فضا کی تشکیل کی جو کئی حوالوں سے اس شہر کی ثقافتی اہمیت میں اضافے کا باعث بنی۔

جدید عہد میں پہنچ کر لاہور کی ثقافت اگرچہ کافی بدل چکی ہے اور بہت سے نئے ثقافتی رویے اس شہر کی ثقافتی فضا میں شامل ہوگئے ہیں، تاہم مغلیہ دور اور انگریز دور کا لاہور آج بھی لوگوں کے لیے یادِ ماضی کی صورت میں ان کے حافظے میں محفوظ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید عہد میں رہائشی اور دیگر عمارات میں جدت کے نام پر جو تبدیلی لائی جارہی ہے اس نے قدیم لاہور کے ثقافتی تشخص کو بری طرح مجروح کردیاہے۔ واصف ناگی اس حوالے سے لکھتے ہیں:

> لاہور میں اب ایک ایسا طبقہ اور ایسے لوگ پیدا ہو چکے ہیں جو لاہور شہر کی قدیم عمارتوں کو گرانے کے درپے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ پرانی عمارتوں کا ملبہ فروخت کر کے کمائی کی جائے اور پھر نئی عمارتیں بنا کر ان سے کمائی کی جائے۔(۱۴)

لاہور کے ثقافتی مظاہر میں تھیٹر کا کردار اہم ہے۔ تھیٹر ڈرامے لاہور کی ثقافت کے ساتھ ساتھ پنجابی ثقافت کو اجاگر کرنے کا بھی ایک اہم ذریعہ تھے۔ اب یہ ثقافتی مظہر مختلف حالات میں تبدیلی کے مراحل سے گزرتا ہوا اپنے اختتام کو پہنچنے کے قریب ہے۔ اگرچہ اب بھی لاہور میں تھیٹر ڈرامے ہوتے ہیں تاہم اب ان میں پہلے سی جاذبیت اور دلچسپی کم ہی ملتی ہے۔ لاہور میں تھیٹر ڈراموں کی تاریخ کا سراغ لگایا جائے تو لاہور میں تھیٹر ڈراموں کو رواج دینے کا سہرا کلکتہ کی تھیٹریکل کمپنیوں کے سر ہے جنھوں نے پنڈال لگا کر ڈرامے دکھانے شروع کیے اور لاہور میں اس ثقافتی مظہر کو فروغ دیا۔ شروع میں یہ پنڈال رتن چند کی سرائے کے سامنے لگایا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ رائل پارک بھی کلکتہ اور بمبئی کی تھیٹریکل کمپنیوں کا اہم گڑھ سمجھا جاتا تھا جہاں وہ ڈرامے دکھاتی تھیں۔ آہستہ آہستہ لاہور میں مقامی تھیٹر نے بھی رواج پانا شروع کیا۔ سیٹھ نانک چند نے لاہور میں پہلا مقامی تھیٹر البرٹ تھیٹریکل کمپنی کے نام سے قائم کیا۔ کچھ عرصہ تک آغا حشر کاشمیری بھی اس کمپنی سے منسلک رہے لیکن بعد ازاں انھوں نے "انڈین شیکسپیئر تھیٹر" کے نام سے اپنی الگ کمپنی کی بنیاد رکھی۔ تقسیم سے قبل لاہور میں جو تھیٹر کام کر رہے تھے ان میں گیتی تھیٹر، عزیز تھیٹر، کراؤن تھیٹر، ملک تھیٹر اور امپریل تھیٹر وہ مشہور تھیٹریکل ادارے تھے جنھوں نے لاہور کے ثقافتی منظر نامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب اس میدان میں جدت آئی اور بولتی فلموں کا آغاز ہوا تو یہ تھیٹرز ٹاکیز میں تبدیل ہوتے چلے گئے۔ آگے چل کر یہی سینما میں بدل گئے۔

ڈرامے کے حوالے سے دیکھا جائے تو لاہور کی ثقافت میں ڈراما صرف تھیٹر تک محدود نہ تھا بلکہ خوشی کے مختلف مواقع پر گھروں میں بھی ڈرامے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یوں یہ ایک ثقافتی مظہر کی حیثیت

رکھتا تھا۔ مستری محمد شریف اپنے ایک انٹرویو میں لاہور کے اس ثقافتی مظہر کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> جب لاہور میں شادیاں ہوتی تھیں،" ہیر رانجھا" کا ڈراما ہوتا تھا۔ اور "پورن بھگت" کا ڈراما ہوتا تھا۔۔۔۔ ساری ساری رات ڈرامے ہوتے تھے۔ آٹھ آٹھ دن کھانے پکتے تھے۔ کسی کے گھر پر بچہ ہونا، دیر بعد ہونا، تو وہ بھی خوشی میں ڈرامے کراتے تھے۔ محلے داروں نے بھی آنا، عزیزوں رشتے داروں نے بھی آنا، ساری رات رونق لگی رہتی تھی۔ بڑی رونق رہتی تھی۔ پیسے لوگوں نے خوب دینے۔ جو بیٹھ جاتا پھر اٹھتا نہیں تھا۔(۱۵)

تھیٹر اور ڈرامے کا یوں سماجی سطح پر ہونا اس امر کی عکاسی کرتا ہے کہ شادی بیاہ کے دیگر ثقافتی رنگوں میں اس رنگ کی آمیزش بھی ضروری خیال کی جاتی تھی اور یہ لاہور کے ثقافتی منظر نامے کا اہم حصہ تھا۔

لباس اور خورونوش کے انداز کسی بھی خطے کی ثقافت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ سماجی سطح پر تحرک کے حامل معاشروں میں لباس اور کھانا محض ضروریات زندگی کا نام نہیں ہے بلکہ یہ اس خطے کے ثقافتی منظر نامے کی تشکیل میں بھی اہم کردار کرتے ہیں۔لاہور کی ثقافت میں اس شہر میں بسنے والے لوگوں کے پہناوے اور کھانے پینے کے انداز سے بھی ان کے ثقافتی رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ایسے رنگ ہیں جو انھیں ایک خاص پہچان بھی عطا کرتے ہیں۔ سوم آنند اس پہلو پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> پہننے، اوڑھنے، کھانے پینے، لکھنے پڑھنے اور دوسری کئی باتوں میں لاہور والوں کا اپنا ایک الگ رنگ رہا ہے۔ یہاں کی پنجابی بول چال کا انداز بھی اس خطے کے دوسرے شہروں سے مختلف تھا۔ اردو

تحریر و تقریر میں بھی یہاں کے پڑھنے لکھے طبقے نے اپنا ایک مخصوص
آہنگ اختیار کیا۔ شروع شروع میں دلی اور لکھنؤ والے اس پر ہنستے مگر
بعد میں اس کا لوہا مانا گیا۔ اس شہر کی زندگی کو پنجابی مزاج کی خوبیوں اور
خامیوں نے ایک خاص سانچے میں ڈھالا۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کے
بازاروں، گھروں اور محفلوں میں ہمیں ایک خاص فضا ملتی ہے۔(۱۶)

سوم آنند کے اس بیان سے لاہور میں بسنے والے لوگوں کے روزمرہ امور کی عکاسی اس انداز سے ہوتی ہے کہ وہ ان کی پہچان بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ سوم آنند نے اس شہر کے باسیوں کی زندگی کا مشاہدہ بڑی باریک بینی سے کیا ہے اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس شہر میں بسنے والوں کی روزمرہ زندگی کی بہت سی عادات ایسی ہیں جو ان کے سماجی، تہذیبی اور ثقافتی رویوں سے پروان چڑھتی ہیں اور پھر آگے چل کر ان کی خاص پہچان بھی بن جاتی ہے۔ پہننے، کھانے پینے اور بولنے کے حوالے سے لاہور کے رہنے والے جس انفرادی تہذیبی اور ثقافتی شناخت کے حامل ہیں، وہ انھیں برصغیر کے خطے میں خاص پہچان عطا کرتے ہیں۔ مرزا ادیب کھانے کا تعلق کلچر اور ثقافت سے جوڑتے ہیں اور اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

اصل قصہ یہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کا تعلق ایک قوم کے کلچر سے
کافی گہرا ہوتا ہے یہ چیزیں کیا ہیں، کیسے بنائی جاتی ہیں، انہیں کس طرح
اور کن برتنوں میں ڈالا جاتا ہے۔ یہ سب باتیں ایک خاص کلچر سے
وابستہ ہوتی ہیں وہ لوگ جن کی رگوں میں کلچر سرایت نہیں کر سکتا، لاکھ
تکلف کریں ایسے کھانے تیار نہیں ہو سکتے، جو ایک مخصوص کلچر کا جزو
ہوتے ہیں۔ پلاؤ غیر مسلم بھی پکاتے تھے بڑی نفاست سے پکاتے تھے مگر
اس پلاؤ میں صرف کاریگری ہوتی تھی، وہ پلاؤ پن نہیں ہوتا تھا جو
مسلمانوں کے پکائے ہوئے پلاؤ میں ہوتا ہے اسی کو میں نے کلچر کہا ہے۔

> غیر مسلم سویاں نہیں پکا سکتے تھے اور ہم پوریاں تلنے میں غیر مسلموں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔(۱۷)

لاہور کے ثقافتی منظرنامے پر یہاں کے پہلوانوں اور اکھاڑوں کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کا جائزہ لیا جائے تو یہاں کے پہلوان اور اکھاڑے پورے برصغیر میں شہرت رکھتے تھے ۔یہی وجہ ہے کہ یہاں ہر سال ہونے والے کشتی اور پہلوانی کے دنگل اس شہر کی ثقافت کا اہم حصہ مانے جاتے تھے۔ اکھاڑے میں اترنے سے قبل جو رسومات ادا کی جاتی تھی وہ بھی اس شہر کی ثقافتی اقدار میں اضافے کا باعث بنتی تھی ۔ جس دن دنگل ہوتا اس سے ایک دن قبل پہلوان شہر میں جس طرح نکلتے تھے وہ بذات خود ایک ثقافتی مظہر بن جاتا تھا۔ منیر احمد منیر اس ثقافتی مظہر کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دنگل سے ایک روز پہلے بنے ٹھنے تانگوں پر ریشمی لاچوں ، کرتوں اور کلف لگی ململ کی رنگ برنگی پگڑیوں میں ملبوس پہلوان لاہور میں چکر لگاتے۔لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے ڈھولکیے ساتھ ہوتے ۔ لیکن یہ جلوس چند تانگوں پر مشتمل ہوتے۔(۱۸)

پہلوانوں کے اس طرح کے جلوس ، ان کی شان وشوکت اور ان کے منفرد انداز ، اس کے ساتھ ساتھ ڈھولکیے یہ سب مل کر لاہور کی ثقافت کا ایک حسین چہرہ پیش کرتے تھے ۔ دنگل والے دن بھی روایتی ثقافت دیکھنے میں آتی تھی۔

لاہور کی ثقافت میں یہاں کے ذرائع نقل وحمل کا کردار بھی اہم ہے ۔ قدیم لاہور کی ثقافت کا تجزیہ کیا جائے تو اس شہر میں تانگہ کو ایک اہم ثقافتی عنصر کی اہمیت حاصل تھی۔ تانگہ نہ صرف روزمرہ کی سواری کے طور پر استعمال ہوتا تھا بلکہ شادی بیاہ اور دیگر مخصوص تقریبات کے بھی تانگے کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ یہ مخصوص تانگے بڑے چاؤ سے سجائے سنوارے جاتے تھے اور ان پر بیٹھنے والے ایک انوکھی شان کے مالک تصور کیے جاتے تھے۔لاہور کی ثقافت میں تانگے کی اہمیت اس قدر زیادہ تھی کہ

کئی گانے بھی تانگے کو موضوع بناتے ہوئے گائے گئے اور پنجابی فلموں میں لاہور کے ثقافتی رنگوں کو اجاگر کرتے ہوئے تانگے کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ جدید لاہور میں رکشوں، منی بسوں، میٹر و اور اورنج ٹرین کے آنے سے یہ ثقافتی عنصر بھی معدوم ہو تا جارہا ہے ۔ تاہم اب بھی خاص تقریبات کے لیے تانگے اور بعض اوقات بگی کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ثقافتی مظاہر کے حوالے سے لاہور میں جو موسمی تہوار ثقافتی اہمیت کے حامل سمجھے جاتے ہیں ان میں بسنت کا تہوار بھی ایک خاص ثقافتی عنصر کا درجہ رکھتا ہے ۔ دیکھا جائے تو قدیم اور جدید لاہور کی ثقافت کا یہ ایک ایسا ثقافتی عنصر ہے جو قدیم عہد سے لے کر آج تک پورے جوش و جذبے کے ساتھ منایا جاتا ہے ۔ اگرچہ چند سال قبل پتنگ بازی میں دھاتی ڈور کے استعمال اوراس سے ہونے والی اموات کی وجہ سے اس ثقافتی تہوار پر مختلف طرح کی پابندیاں بھی لگائی گئیں تاہم آج کے عہد میں بھی بسنت اور پتنگ بازی کو لاہور میں اہم ثقافتی عنصر کی حیثیت حاصل ہے ۔ مرزا ادیب بسنت کو واحد موسمی تہوار قرار دیتے ہیں جو ان کے آپ بیتی لکھنے تک جوش و خروش سے منایا جاتا تھا افسوس کہ اب بعض وجوہات کی بنا پر اس تہوار کو پہلے کی طرح نہیں منایا جاتا۔ مرزا ادیب لکھتے ہیں:

> بسنت ایک تہوار ہے، میں نے "تہوار تھا" نہیں کہا، کہا ہے کہ یہ تہوار ہے کیونکہ یہ آج بھی پاکستان کے بعض علاقوں میں خاص طور پر لاہور میں بدستور منایا جارہا ہے غالباً یہ واحد موسمی تہوار ہے جس کی آن بان شان پوری طرح نہیں تو بہت حد تک بر قرار ہے۔(۱۹)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لاہور صدیوں سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا ہے۔ یہاں بسنے والی مختلف اقوام اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگوں نے اپنی انفرادی اور مذہبی رسومات، تہواروں اور ثقافتی عناصر کے ساتھ ساتھ اس شہر کی مجموعی مخصوص ثقافت کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ یہاں چوں کہ مختلف مذاہب کے بسنے والے لوگوں کی کثیر تعداد آباد رہی ہے اس وجہ سے یہ شہر پورے برصغیر میں ایک اہم ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھتا ہے۔

ب۔ لاہور کی ثقافتی صورتحال : ادبی آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں

اصناف ادب میں سے آپ بیتی ایک ایسی صنف ادب ہے جو آپ بیتی کے ساتھ ساتھ جگ بیتی بھی قرار پاتی ہے۔ایک آپ بیتی نگار جب آپ بیتی لکھ رہاہوتاہے تو وہ مختلف حالات وواقعات کے تناظر میں اپنی شخصیت کے مختلف مراحل اوراپنی زندگی کے احوالِ شب وروز بیان کررہاہے ہوتاہے، لیکن اس عمل کے دوران میں وہ اس سماج ، تہذیب اور ثقافت کا نقشہ بھی کھینچتا چلا جارہا ہوتاہے، جس میں اس نے زندگی گزاری ہوتی ہے۔ یہ عمل اصلیت پر مبنی ہوتاہے کیوں کہ آپ بیتی نگار اپنی ذات کی ترجمانی کا فریضہ انجام دے رہاہوتاہے۔ آپ بیتی اگرچہ ایک انفرادی صنف کا درجہ رکھتی ہے لیکن اس میں بیان ہونے والے احوال پورے سماج کو مختلف زاویوں سے پیش کرتے چلے جاتے ہیں۔یہی صورت حال یادداشت نگاری کے ساتھ بھی ہوتی ہے۔ یاد داشتیں لکھنے والے کے ذہن میں اپناوہ ماضی ہوتاہے جو اس نے مختلف خطوں میں گزارا ہوتاہے اور جس میں اس کاواسطہ مختلف لوگوں کے ساتھ پڑاہوتاہے۔یوں جب وہ اپنے ماضی کو بیان کرنے بیٹھتاہے تو بہت کچھ یادِماضی بن کر اس کے شعور میں ایک بار پھراجاگر ہوتا چلا جاتاہے۔وہ واقعات اور حالات جن میں اس کا ماضی گزراہوتاہے، وہ بعض اوقات اس شدت کے ساتھ اس کے ذہن سے قرطاس پر منتقل ہوتے ہیں کہ ان کے ذریعے کسی عہد کی پوری تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔

اردو ادب کے حوالے سے دیکھاجائے تو اردو میں آپ بیتی اور یادداشت نگاری کی ایک مضبوط روایت ملتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ لاہور ایک ایسا شہر ہے جس کا ذکر سب سے زیادہ آپ بیتیوں میں ہوا ہے ۔ اس کے علاوہ یادداشتوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہاں بھی یہی صورت حال دکھائی دیتی ہے کہ اکثر ادبا اور دیگر مصنفین نے اپنی تحریروں میں لاہور، لاہور کے سماج اور لاہور کی تہذیب وثقافت کو بڑے جاندار انداز میں بیان کیاہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اکثر ادبا اور مصنفین کی زندگی کا کچھ نہ کچھ عرصہ لاہور میں لازمی گزراہے۔ اس کے علاوہ وہ مصنفین جو ہندوستان

سے ہجرت کر کے پاکستان آئے تھے ،ان کی اکثریت نے لاہور کو ہی ٹھکانہ بنایا تھا۔ لاہور قیام پاکستان سے قبل تہذیب و ثقافت کا بڑا مرکز مانا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ برصغیر کے بڑے بڑے لوگ قیام پاکستان سے قبل تعلیمی ،ادبی ، تہذیبی یا سماجی حوالے سے لاہور سے وابستہ رہے تھے ۔ ان کی یادداشتوں اور آپ بیتیوں میں لاہور ایک بنیادی موضوع کے طور پر ابھرتا دکھائی دیتا ہے ۔

لاہور کی ثقافتی حیثیت کے حوالے سے گزشتہ صفحات میں تفصیل سے بحث کی جاچکی ہے ۔ یہاں ہماری بحث کا موضوع اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں لاہور کی ثقافتی حیثیت کی پیش کش ہے ۔ لاہور میں بسنے والے اور بعد میں آکر لاہور میں آباد ہونے والے ادبا نے لاہور کی ثقافتی حیثیت کو قیام پاکستان سے قبل اور بعد کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے ۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ لاہور کا جو قدیم ثقافتی اور تہذیبی منظر نامہ تھا وہ اب کافی حد تک معدوم ہو چکا ہے ۔ بدلتے ہوئے سماجی اور ثقافتی تقاضوں نے لاہور والوں سے قدیم لاہور چھین لیا ہے اور اس کی جگہ ایک ایسے نئے لاہور کا تصور سامنے آتا ہے ، جس میں قدیم ثقافتی اقدار ماضی کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ لاہور میں بسنے والے ادبا اور مصنفین نے اپنی یادداشتوں اورآپ بیتیوں میں قدیم لاہور کی ثقافت کو جس زاویے سے دیکھا ہے وہ ایک حسین ثقافتی منظر نامہ سامنے لاتا ہے ۔ قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کا جو ثقافتی تشخص ابھرتا ہے وہ حقیقی تہذیب اور ثقافت کو سامنے لاتا ہے ۔ اس تہذیبی اور ثقافتی منظر نامے میں بسنے والوں کو اپنے خطے سے اس حد تک الفت تھی کہ اس خطے میں باہر سے آنے والوں کو بھی اپنا ہی تصور کرتے ہوئے ان کی محرومیوں کو دور کرنے اور ان کے دکھوں کا مداوا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے ۔اس کی ایک جھلک ہمیں ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی سے ملتی ہے ۔ ڈاکٹر سلیم اختر قیام پاکستان کے وقت فسادات میں لٹے پٹے مہاجرین کی لاہور آمد کے بعد ان کی بے سروسامانی کی حالت میں ان کے دکھ سمیٹنے اور انھیں گلے سے لگانے کے حوالے سے لاہور کے باسیوں کی فراخ دلی کویوں سامنے لاتے ہیں:

> جب اجڑے لاہور میں لٹے پٹے بے خانماں مہاجرین کی آمد ہوئی۔ گلیاں سنسان، بازار بے رونق، شاہ عالمی تقریباً کھنڈر، پنجاب، دہلی اور یوپی کے مہاجرین، اپنی اپنی بولیوں، یادوں، غموں اور دکھوں کے ساتھ ہرج مرج کھینچتے لاہور آرہے تھے، زندہ دلان لاہور نے روایتی جوش وخروش سے ان کی پذیرائی اور خدمت کی۔ کیمپوں میں کھانوں کی دیگیں لے جاتے اور ہر طرح سے مہاجرین کی مدد اور دلجوئی کرتے۔(۲۰)

یہ وہ تہذیبی اور سماجی رویے تھے جو اس عہد میں لاہور میں بسنے والوں کے دل ودماغ میں نہ صرف موجود تھے بلکہ وہ ان کا عملی اظہار بھی کیا کرتے تھے۔ حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا جائے تو تقسیم کے عمل میں سب سے زیادہ متاثر پنجاب کا خطہ ہوا تھا اور سب سے زیادہ تقسیم کا بوجھ اٹھانے والا شہر لاہور تھا۔ قیام پاکستان سے قبل ایک اہم تہذیبی اور ثقافتی مرکز کی حیثیت رکھنے کی وجہ سے لاہور کی طرف سب سے زیادہ مہاجرین کا رخ ہوا اور لاہور کے باسیوں نے کھلے دل کے ساتھ نہ صرف ان مہاجرین کو قبول کیا بلکہ ان کی نئی زندگی کے آغاز میں ان کی ہر طرح سے مدد بھی کی۔ یوں لاہور کا وہ تہذیبی اور ثقافتی چہرہ سامنے آتا ہے جو اخلاص اور زندہ دلی کا شاہکار قرار پاتا ہے۔

لاہور کی ثقافت کے حوالے اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا جائزہ لینے سے اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ اکثر آپ بیتی نگاروں نے قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کی ثقافت کو زیادہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ قیام پاکستان سے قبل کا لاہور ثقافتی حوالے سے جدید لاہور سے نہ صرف بہتر تھا بلکہ اس کی ثقافتی اقدار اپنی جڑیں اسی سرزمین میں رکھتی تھیں۔ آپ بیتی نگاروں نے لاہور کی اس ثقافتی اور تہذیبی صورت حال کی پیش کش مختلف زاویوں سے کی ہے۔ انھوں نے ان عناصر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو لاہور کی ثقافت اور تہذیب کے بنیاد گزار قرار دیے جاسکتے ہیں۔ یہاں ہم آپ بیتیوں اور یادداشتوں سے لاہور کی ثقافتی صورت حال کو اجاگر کرتے ہوئے ان ثقافتی عناصر اور ثقافتی مظاہر کو مد نظر رکھیں گے تاکہ لاہور کی ثقافت کا اصل روپ

سامنے لایا جاسکے اور دیکھا جاسکے کہ آپ بیتی نگاروں نے اور یادداشت نگاروں نے اس ثقافتی منظر نامے سے کیا اثرات قبول کیے اور ان اثرات کے زیر اثر ان کا تخیل اور یاد ان ثقافتی عناصر کو کس طرح قرطاس پر منتقل کر پایا۔

لاہور کی ثقافت کا ایک اہم عنصر تھیٹر ہے۔ جدید عہد میں تفریح کے مختلف جدید ذرائع سے قبل نہ صرف لاہور بلکہ پورے ہندوستان (قیام پاکستان سے قبل) میں تھیٹر کو اہم ثقافتی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ لاہور میں تھیٹر دیکھنے والوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی بلکہ اسے ایک ثقافتی عنصر کا درجہ حاصل ہونے کی وجہ سے لاہور میں تھیٹر بہت مقبول تھا۔ لاہور کی کوئی تاریخ یا سماجی، تہذیبی اور ثقافتی مطالعہ لاہور میں دکھائے جانے والے تھیٹروں کے تذکرے کے بغیر نامکمل ہے۔ اردو آپ بیتی نگاروں نے بھی اس ثقافتی عنصر کو لاہور کی ثقافت کا اہم مظہر قرار دیتے ہوئے نہ صرف اس کی ثقافتی اہمیت بیان کی ہے بلکہ لاہور میں تھیٹر کی تاریخ بھی سامنے لائے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی یادداشتوں میں لاہور میں تھیٹر کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> عزیز تھیٹر: یہ شہر میں قائم کیے جانے والا پہلا تھیٹر ہال تھا جہاں یقیناً آغاحشر کاشمیری کے ڈرامے اسٹیج کیے گئے۔ پارسی تھیٹر اور کلکتہ سے آنے والے تھیٹروالوں نے لاہوریوں کے سامنے زندہ ناچ گانا پیش کیا۔ اور جب پہلے خاموش فلمیں چلی آئیں اور ان کے بعد باتیں کرنے والی فلمیں چلی آئیں یعنی فلمیں باتونی ہو گئیں تو عزیز تھیٹر بھی باتیں کرنے لگا۔ ٹاک کرتا ہوا ٹاکیز ہو گیا، بالآخر پاکستان ٹاکیز ہو گیا۔ (۲۱)

تارڑ صاحب کے اس بیان سے لاہور میں تھیٹر کے آغاز اور اس کی ارتقائی صورت حال سے آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ تھیٹر کے آغاز کے بعد لاہور میں کئی تھیٹریکل کمپنیاں وجود میں آئیں اس کے علاوہ کلکتہ اور دیگر ہندوستانی علاقوں کی تھیٹریکل کمپنیوں نے بھی لاہور کا رخ کیا اور یہاں کے لوگوں کو تھیٹر کے ذریعے ایسی تفریح فراہم کی کہ آگے چل کر یہ تھیٹر لاہور کی ثقافت کا ایک اہم حصہ بن گیا۔

تھیٹر پر دکھائے جانے والے ڈرامے، رقص اور گیت لاہوری ثقافت کے ترجمان ہوا کرتے تھے۔ بہت سے ایسے ڈرامے پیش کیے گئے جن میں لاہور کا حقیقی تشخص اجاگر کیا گیا۔ اس کے علاوہ تھیٹر کی یہاں آمد اور ارتقا نے لاہور سے ایسے فنکار بھی سامنے لائے جنھوں نے آگے چل کر فن کی دنیا میں اپنا نام پیدا کیا اور لاہوری ثقافت کا اجاگر کیا۔ ان فن کاروں کا تذکرہ بھی اردو کی آپ بیتیوں میں ملتا ہے۔ تھیٹر جب مختلف مراحل طے کرتے ہوئے سینما میں ڈھلا تو سینما کی فلم نے نہ صرف لوگوں کو تفریح فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ لاہور کی ثقافت بھی ان فلموں کے ذریعے اجاگر ہونے لگی۔ آج بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ بہت سی ایسی پنجابی فلمیں جو لاہور میں فلمائی گئی ہیں، ان میں کہانی، کردار اور پیش کش کے حوالے سے لاہور کی ثقافت کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ اس دور میں جو ثقافتی فنکار سامنے آئے اردو آپ بیتیوں میں ان کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ڈاکٹر سلیم اختر اپنی آپ بیتی "نشان جگر سوختہ" میں ایک جگہ ان ثقافتی فنکاروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> سیف الدین سیف کی پہچان بطور شاعر بلکہ بہت اچھے شاعر کی ہے، مگر انہوں نے فلم سازی میں بھی نام پیدا کیا تھا۔ "سات لاکھ" ان کی ایک مقبول فلم تھی۔ آج کے مقبول ہیرو شان کی والدہ ماجدہ نیلو اس زمانہ میں نیا چہرہ اور ابھرتی ستارہ تھی۔ نیلو پر "سات لاکھ" کا یہ گانا پکچرائز ہوا تھا۔
>
> آئے موسم رنگیلے سہانے / جیا نہیں مانے / تو چھٹی لے کے آجا بالما
>
> نیلو اور گانا دونوں ہی ہٹ ہو گئے۔(۲۲)

لاہور کی ثقافت میں تھیٹر، سینما اور رقص کا کردار اہم ہے۔ ان عناصر نے نہ صرف ثقافت کی پیش کش کی بلکہ ان کے ذریعے مختلف ایسے کردار سامنے آئے جو آگے چل کر لاہور کی ثقافت کا عمدہ نمونہ ثابت ہوئے۔ اس کے علاوہ زمانی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ثقافتی عناصر اس عہد کی اہم تفریح بھی تھے جس میں سماج کے مختلف طبقات کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ یوں یہ ایک مجموعی سماجی منظر نامے

کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ایسا سماجی منظر نامہ جو سماجی اور تہذیبی اقدار کے ساتھ ساتھ ثقافتی تشخص کا بھی حامل تھا۔

تھیٹر اور سینما کو لاہور کے ثقافتی منظر نامے میں اس قدر مقبولیت حاصل تھی کہ ، وہ لوگ جو بڑے سینماؤں کا رخ نہیں کر سکتے ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے بعض ایسے لوگ بھی سامنے آئے جنھوں نے تھیٹر کو گھر کی دہلیز تک پہنچایا۔ یہ ایک طرح کے بائی سکوپ سینما ہوتے تھے جن کے ذریعے گلی محلوں میں ایسے لوگوں کی تفریح کی سامان کیا جاتا تھا جو سینما یا تھیٹر تک نہیں پہنچ پاتے تھے۔ یہ بائی سکوپ سینما بھی لاہور کی ثقافت میں اہمیت کے حامل ہیں۔اے حمید بائی سکوپ (سینما) کو لاہور کی قدیم ثقافت کا ایک اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ وہ لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس بائی سکوپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

> لاہور کی قدیم ثقافت کا ایک اور گم شدہ منظر یاد آتا ہے۔اس زمانے میں لاہور کے گلی کوچوں میں ایک چلتا پھرتا بائی سکوپ یعنی سینما ہوا کرتا تھا۔ لاہور کے زندہ دل جوان اور بوڑھے تو بیرون بھاٹی دروازے یا میکلورڈ روڈ پر واقع سینما گھروں میں منڈوا یعنی سینما دیکھنے جایا کرتے تھے اور گلی محلوں میں بچے اس چلتے پھرتے بائی سکوپ (سینما) سے اپنا دل بہلایا کرتے تھے۔اس چلتے پھرتے سینما کا مالک ہاتھ سے گھنٹی بجا کر اپنی آمد کا اعلان کیا کرتا تھا۔(۲۳)

لاہور کے گلے محلوں میں رواج پانے والے اس بائی سکوپ سینما نے لاہور کی نئی نسل کی آبیاری کی۔ وہ بچے جو عام طور پر سینما اور تھیٹر سے دور ہوتے تھے ان بائی سکوپ سینماؤں کے ذریعے وہ بھی اس عمل میں شریک ہو گئے۔ یوں دیکھا جائے تو یہ بائی سکوپ سینمے لاہور کی ثقافتی تاریخ کا ایسا عنصر قرار پاتے ہیں جو بچوں تک کو لاہور کی ثقافت سے آشنا کرواتے تھے۔ان بائی سکوپ سینماؤں کے علاوہ لاہور کی ثقافت میں خانہ بدوش تھیٹر کے کردار کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔خانہ بدوش لوگ

اپنے رزق کا انتظام مختلف طریقوں سے کرتے ہیں۔ لاہور میں دیکھا جائے تو قیام پاکستان سے قبل یہ بھی عام رواج تھا کہ یہ خانہ بدوش لوگ عارضی تھیٹر کا استعمال کرتے ہوئے لوگوں کو تماشا دکھاتے۔ ان تماشوں اور ڈراموں میں بھی لاہور کی ثقافت کے رنگ دکھائی دیتے تھے۔ عام طور پر ایسے تھیٹر دیکھنے والوں سے ایک آنہ وصول کیا جاتا تھا اس لیے ایسی کمپنیاں جو یہ تھیٹر دکھاتی دیتی تھیں انھیں ایک آنہ کمپنی کا نام دیا جاتا تھا۔ اے حمید اپنی یادداشتوں "لاہور لاہور اے" میں ان ایک آنہ کمپنیوں کے تھیٹر اور اس تھیٹر میں بکھیرے جانے والے ثقافتی رنگوں کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ایک آنہ تھیٹر کمپنیاں اپنے پھٹے پرانے تمبو قناتیں لگا کر کھیل تماشے دکھاتی ہیں۔ ان تھیٹروں میں لڑکے لڑکیوں کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔ یہ لڑکے عورتوں کا لباس پہن کر خوب سرخی پاؤڈر لگا کر جب گیس کی روشنی میں آتے ہیں تو عورتوں سے زیادہ خوب صورت لگتے ہیں۔ تھیٹر کے گیٹ پر بڑا سا پردہ لٹکا دیا جاتا ہے۔ اوپر مچان لگی ہوتی ہے ۔ مچان پر دو لڑکے لڑکیوں کے لباس میں ڈھولک کی تھاپ پر ڈانس کرتے ہیں۔ شائقین کا ہجوم باہر کھڑا انہیں دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔(۲۴)

ان ایک آنہ کمپنیوں نے بھی بائی سکوپ سینما کی طرح لاہور کے ثقافتی منظر نامے کو مزین کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگرچہ یہ کمپنیاں چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھیں اور ان کے تھیٹر دیکھنے والوں سے معاوضہ بھی بہت وصول کیا جاتا تھا تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہی وہ کمپنیاں تھیں جنھوں نے گلی محلوں کے بچوں کو ان ثقافتی سرگرمیوں کی طرف راغب کیا اور وہ اس ثقافتی عمل میں شریک ہوتے چلے گئے۔

کیبرے لاہور کی ثقافتی تاریخ کا اہم عنصر رہے ہیں۔ قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کا مشاہدہ کیا جائے تو اس لاہور میں کیبرے اور ڈانس کو ایک ایسے ثقافتی مظہر کی حیثیت حاصل تھی کہ کوئی بھی ثقافتی اجتماع ہوتا، کیبرے کی شمولیت لازمی سمجھی جاتی تھی ۔ یہ کیبرے ڈانس مختلف ہوٹلوں،

سیر گاہوں اور اس طرح کی دیگر جگہوں پر ہوتا تھا۔ یہاں پر مختلف رقاصائیں محو رقص ہوتی تھیں۔ اگرچہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوتی تھی بلکہ چند ہی مشہور تھیں تاہم ان کے ذریعے مختلف محفلوں کے ثقافتی رنگ نکھرتے چلے جاتے تھے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لاہور کے مضافات سے تعلق رکھنے والی یہ رقاصائیں نہ صرف خود ان کو لاہور سے باہر رہنے والوں کی تفریح کا ذریعہ بناتی تھیں بلکہ ان کے ذریعے رقص ایک ثقافتی عنصر کا درجہ پاتا چلا گیا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے اپنی آپ بیتی "نشانِ جگر سوختہ" میں ایسی رقصاؤں اور کیبرے کا تذکرہ بڑی عمدگی سے کیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ وہ ثقافتی عناصر تھے جو غیر محسوس انداز سے لاہور کی ثقافت میں شامل ہوتے چلے گئے اور ان کے ذریعے لاہور کی ثقافت کے متنوع رنگ سامنے آنے لگے۔ اُس دور میں مختلف ریستورانوں اور ہوٹلوں میں ایسی رقصاؤں اور رقص کا جو عالم تھا اس بارے بات کرتے ہوئے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> آج کل ریگل سینما کے ساتھ UBL کی جگہ اس زمانہ میں معروف ریستوران Casino تھا اور واپڈا ہاؤس کی جگہ Metro آباد تھا۔ ان دونوں میں ان دنوں کیبرے ڈانس ہوتا تھا۔ ایک شام ریگل کے پاس سے گزر رہا تھا کہ Casino سے آرکسٹرا کی جھنکار سنائی دی، ایسی کہ موسیقی پسند کان کھڑے ہوگئے۔ اندر گیا تو آنکھیں کھل گئیں۔ مس انجلا اسلحہ خانہ کی نمائش کر رہی تھی ۔۔۔۔ انجلا کے علاوہ ثریا نامی ڈانسر بھی معروف تھی۔ "میٹرو" کا ماحول بھی کیسینو جیسا ہی تھا۔ (۲۵)

لاہور کی ثقافت کے یہ رنگ آج بھی کسی نہ کسی صورت میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے ان چھوٹے ریستورانوں اور ہوٹلوں کا ذکر کیا ہے جہاں تک عام آدمی کی رسائی تھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عوام کی دلچسپی کے لیے اس ثقافتی عنصر کا اظہار اُس دور میں بھی ضروری سمجھا جاتا تھا، اور یہ رقص لاہور کی ثقافت کا ایک اہم جزو بن گیا تھا۔

کیبرے رقص کے حوالے سے بھی لاہور کی ثقافت متنوع رنگ لیے ہوئے ہے۔ ایک طرف ایسے کیبرے اور ہوٹل تھے جن کا ذکر ڈاکٹر سلیم اختر کے مندرجہ بالا بیان سے ہوتا ہے تو دوسری طرف طبقہ اشرافیہ کے ذوق کا سامان کرنے والے ریستوران تھے۔ یہاں بھی رقص و سرود اہم سمجھا جاتا تھا لیکن اس کی نوعیت کیا ہوتی تھی، اس بارے میں ایک یادداشت ملاحظہ ہو:

> یہ تو وہ ریستوران اور کیبرے تھے جو ہماری رسائی میں تھے جب کہ بڑے ریستورانوں میں جانے کی ہم میں ہمت نہ تھی۔ ان میں غیر ملکی رقاصائیں رقص کرتی تھیں، جن کے انگریزی اخبارات میں باقاعدہ سے اشتہارات چھپتے تھے۔(۲۶)

لاہور کی تہذیبی و ثقافتی تاریخ میں رقص ایک نمایاں عنصر کے طور پر سامنے آتا ہے۔ اگرچہ شہر کے دیگر حصوں میں بھی رقص کی محفلیں منعقد ہوتی رہیں، لیکن مال روڈ پر ان کا ایک الگ ہی رنگ تھا۔ چیئرنگ کراس سے لے کر میٹرو کے اردگرد اور اس علاقے کے دیگر مقامات تک رقص کی محفلیں ایسی رونق افروز ہوا کرتی تھیں کہ گویا یہ مقام شہر کی ثقافتی دھڑکن بن گیا ہو۔ واصف ناگی کی یادداشتوں میں بھی اس امر کی جھلک ملتی ہے، جہاں وہ ان محفلوں کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ رقص محض ایک تفریحی مظہر نہیں بلکہ معاشرتی زندگی کا لازمی ثقافتی حصہ بن کر ابھرتا ہے۔ ان کے نزدیک یہ وہ فن ہے کہ حالات جیسے بھی ہوں، سماج میں اپنے اظہار کا راستہ نکال ہی لیتا ہے۔ وہ لاہور میں رقص کی محفلوں کا منفرد انداز میں تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> کوئی یقین نہیں کرے گا کہ لاہور کی مال روڈ پر جاز میوزک، یعنی لائیو میوزک پر جوڑے ڈانس کیا کرتے تھے۔ کئی ریسٹورنٹس اوپن ہوتے تھے۔ لگتا تھا کہ آپ پیرس آ گئے ہیں۔(۲۷)

لاہور کی ثقافت اور رقص ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ کیبرے اور ریستوران کی قسم کے رقص تو کم و بیش ہر طبقے کے لوگوں میں مقبول تھے۔ رقص کے حوالے سے دیکھا جائے تو ہر

ثقافت میں رقص کی کسی نہ کسی حوالے سے موجودگی رہی ہے۔ زندگی کے رنگ کو جس انداز میں رقص میں پیش کیا جاتا ہے، وہ ایک خوش کن منظر کی تشکیل ہوتی ہے۔ رقص صرف لذت اور سرور کے معنوں میں ہی اہم نہیں ہے بلکہ ثقافت کے صوفیانہ پہلو میں بھی اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ دھمال اور اس قسم کے دیگر کتنے ہی رقص ہیں جو صوفیا کی درگاہوں، درباروں اور خانقاہوں کا نہ صرف لازمی حصہ ہیں بلکہ وہاں کی ثقافت کا طرہ امتیاز بھی بن چکے ہیں۔ پھر دوسری طرف دیکھا جائے تو رقص کو ایسی ثقافتی حیثیت حاصل ہے کہ ہر خطے کے لوگوں کے اپنے اپنے مخصوص رقص ہیں جو اس خطے کی ثقافت کی پہچان قرار پاتے ہیں۔ لڈی، بھنگڑا، خٹک ناچ، سندھی رقص، بلوچی رقص کتنے ہی ایسے رقص ہیں جو اپنے اپنے علاقوں کے ثقافتی رنگوں کی پیش کش کرتے ہیں۔ لاہور کی ثقافت میں بھی رقص کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آپ بیتی نگار جنھوں نے اپنے عہد میں اس ثقافتی عنصر کا مشاہدہ کیا ان کی آپ بیتیوں میں اس کی پیش کش ملتی ہے۔

کسی بھی ثقافت کی تشکیل میں اس ثقافت اور خطے میں رہنے والے لوگوں کے ملبوسات اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پہناوے اور ملبوسات ہی ثقافت کے اظہار کا ایسا ذریعہ ہیں جو ہر تہوار، روزمرہ کی زندگی اور ہر خوشی غمی میں ثقافتی اظہار کا سبب بنتے ہیں۔ دنیا کے مختلف خطوں کی ثقافتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہر خطے میں ملبوسات کا استعمال انفرادی شان سے دکھائی دیتا ہے۔ ملبوسات جہاں ثقافتی اظہار کا ذریعہ ہوتے ہیں وہاں کسی بھی سماج کے تہذیبی ارتقا کے بھی ضامن ہوتے ہیں۔ عہد بہ عہد ملبوسات کی بدلتی ہوئی صورت کسی بھی علاقے کے تہذیبی ارتقا کو سامنے لاتی ہے۔ لاہور کے حوالے سے دیکھا جائے تو لاہور کے بارے میں لکھی گئی آپ بیتیوں میں لاہوری ثقافت کی پیش کش میں وہاں کے لوگوں کے ملبوسات کا بھی خاص عمل دخل دکھائی دیتا ہے ۔ لاہور ایک گنجان آباد شہر ہے۔ اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے لوگ بستے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف تہواروں پر یہاں مختلف ملبوسات ثقافتی عکاسی کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ تاہم روزمرہ زندگی میں استعمال ہونے والے ملبوسات بھی لاہور کی ثقافتی پیش کش میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آپ بیتی نگاروں نے قدیم لاہور میں استعمال

ہونے والے ملبوسات کا بیان اس طرح کیا ہے کہ عہد بہ عہد بدلتی ہوئی تہذیبی اور ثقافتی صورت حال بھی سامنے آجاتی ہے۔

ثقافت کی تبدیلی یک لخت نہیں ہوتی۔ کسی بھی خطے کی ثقافتی اقدار اس خطے میں مکمل طور پر ایک ہی وقت میں تبدیل نہیں ہوتیں بلکہ اس خطے کے کسی مخصوص علاقے میں کسی خاص رجحان کے تحت کوئی ثقافتی عنصر خود کو بدلتا ہے۔ اس تبدیلی کے محرکات اندرونی بھی ہوسکتے ہیں اور بیرونی اور خارجی بھی۔ یہ خارجی عناصر زیادہ تر تقلیدی ہوتے ہیں۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں لاہور کی ثقافتی تبدیلی کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ لاہور میں بھی ثقافتی تبدیلی اس کے ایک خاص علاقے مال روڈ سے شروع ہوئی۔ مال روڈ اس شہر کا ثقافتی اور فیشن ایبل مرکز قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے مضافات میں بسنے والے اور یہاں کا رخ کرنے والے اکثر لوگوں جن ثقافتی اقدار کے حامل ہوتے تھے، رفتہ رفتہ وہ اقدار پورے لاہور میں پھیل جاتی تھیں۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے مال روڈ کے بارے میں مختلف تخلیق کاروں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ انیس ناگی اس روڈ اور اس کے مضافات کو بڑی تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں مال روڈ اتنی کشادہ سڑک نہیں تھی، پندرہ بیس فٹ چوڑی تھی جس کی دونوں جانب میلی میلی سی روشنیاں اور مین سڑک کے دائیں بائیں کچی سڑکیں جہاں شام کو کارپوریشن کی لاری چھڑکاؤ کرتی۔ ٹریفک میں ٹانگہ، سائیکل اور کاریں شامل ہوتیں۔ فٹ پاتھ پر کوئی دھکم پیل نہ ہوتی اور نہ میلے کپڑے پہنے ہوئے دیہاتیوں کے انبوہ ہوتے۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بیشتر راہرو ایک دوسرے کو جانتے اور سر کے اشاروں سے ایک دوسرے کی موجودگی کی تصدیق کرتے۔(۲۸)

برقعہ اور پردہ قیام پاکستان سے قبل لاہور کی ثقافت کا اہم حصہ سمجھا جاتا تھا۔ یہاں کے ماحول میں اسلامی اثرات کی وجہ سے ایک تو خواتین کا باہر نکلنا ہی معیوب سمجھا جاتا تھا اور اگر کوئی کسی مجبوری کے تحت بازار میں قدم رکھتی بھی تو اسے بھی اپنے آپ کو برقعے میں ملفوف کر کے نکلنا پڑتا تھا۔ یوں وہ دور لاہور کی ثقافت میں پردے کے حوالے سے اہم سمجھا جاتا تھا۔ اس دور میں اگرچہ لاہور کی آبادی بھی اتنی زیادہ نہیں تھی اور آج کی طرح کا گنجان آباد بھی نہیں تھا لیکن پھر بھی پردہ کو ایک ثقافتی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ انیس ناگی قدیم لاہور کی ثقافت کے اس پہلو کو سامنے لاتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> اس زمانے میں عورتیں خال خال ہی سڑکوں پر نظر آتی تھیں۔ اگر کہیں دکھائی بھی دیتیں اور وہ سیاہ برقعوں میں اس طرح ملفوف ہوتیں کہ انھیں دیکھ کر طبیعت گھبرانے لگتی۔ وہ برقعہ پوش لڑکیاں اور عورتیں جو پردے کی قید سے کچھ آزادی چاہتیں، وہ نقاب کا ایک حصہ منہ پر لپیٹ کر آنکھیں برہنہ کر لیتیں۔ ان کی متحرک اور بے چین آنکھیں دیکھنے والے کے اندر تجسس پیدا کرتیں کہ ان آنکھوں کے نیچے کیسا چہرہ مہرہ ہے؟ البتہ کہیں کہیں بے پردہ لڑکیاں بھی نظر آتیں جن پر لوگ آوازے کستے۔ اس زمانے میں مال روڈ ایک فیشن ایبل علاقہ تھا۔(۲۹)

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے لاہور کی ثقافت میں آنے والی تبدیلی کو بھی خاص طور پر موضوع بنایا ہے۔ ثقافت جامد نہیں ہوتی، جو سماج یا ثقافت جامد ہو جاتے ہیں وہ بہت جلد معدوم ہو جاتے ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ تبدیلی اسی تحرک کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس سماج اور اس کی ثقافتی اقدار میں جاری رہتا ہے۔ لاہور جیسا شہر جو اپنا خاصا تہذیبی اور ثقافتی پس منظر رکھتا ہے،

اس کی ثقافت میں بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلی آتی چلی گئی۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ثقافت میں تبدیلی پیدا کرنے والے عناصر میں بھی سب سے زیادہ متحرک ثقافتی عناصر ہی ہوتے ہیں۔ یہ ثقافتی عناصر جب کسی سماج میں پروان چڑھتے ہیں تو پہلے سے موجود ثقافتی اقدار میں تغیر پیدا ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ لاہور کی ثقافت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ لاہور جہاں کسی دور میں برقعہ اور پردے کو ایک اہم ثقافتی عنصر کی حیثیت حاصل تھی، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہاں جب فلم بینی نے رواج پکڑا تو اس کے زیر اثر ان ثقافتی اقدار میں بھی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہو گئی ۔ فلم اور سینما کا شمار بھی ثقافتی عناصر میں ہوتا ہے۔ ان ثقافتی عناصر نے برقعہ اور پردہ کی ثقافتی اقدار کو کس طرح تبدیل کیا یہ ا ایک الگ حقیقت ہے۔ اردو یادداشتوں کے مطالعے سے اس ثقافتی منظر نامے میں آنے والی تبدیلیوں سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے ۔ یادداشت نگاروں نے فلم کے رجحان کے تقویت پکڑنے سے پہلے اور بعد کی ثقافتی اقدار کو بڑی عرق ریزی سے بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں پہلے کی ثقافتی اقدار کی ایک جھلک انتظار حسین کی یادداشتوں کے مجموعے "چراغوں کا دھواں" سے ملاحظہ ہو:

> سائیکلوں میں زیادہ نمایاں زنانہ سائیکلیں کہ انقلاب انگیز فلم جس کا نام "رومن ہالی ڈے" تھا ابھی یہاں نہیں لگی تھی۔ سو ہر کمر چوٹیوں سے آراستہ نظر آتی ۔ کسی کمر پر ایک چوٹیا، کسی کمر پر دو چوٹیاں اور رنگ رنگ قمیصیں اتنی نیچی کہ گٹوں کو چھوتے چھوتے رہ جاتی تھیں۔ سائیکلوں پر دوڑی چلی جا رہی ہیں ۔ رخ یونیورسٹی کی طرف ہے۔(۳۰)

یہ وہ ثقافتی صورت حال تھی جو "رومن ہولی ڈے" فلم سے پہلے کی تھی ۔ یہاں بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ وہ قدیم ثقافت جو لاہور میں برقعے اور پردے کے عناصر سے مزین تھی وہ کہیں پیچھے رہ گئی اوراب لاہور میں نہ صرف زنانہ سائیکلیں دکھائی دینے لگیں بلکہ ان سائیکلوں پر سوار ہونے والیوں کے ملبوسات میں بھی تبدیلی واقع ہوگئی۔ اس سے آگے بڑھیں تو مال روڈ اُس دور میں لاہور کا وہ علاقہ

تھا جسے سب سے زیادہ فیشن ایبل علاقہ ہونا کے اعزاز حاصل تھا۔ ہر نیا فیشن اسی روڈ کے مضافات سے شروع ہو تا تھا۔ اُس عہد کی ثقافت کا جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مال روڈ کے اس فیشن ایبل علاقے نے لاہور کی ثقافت کو نئے رنگ میں رنگ دیا ۔اس کی قدیم ثقافتی پہچان اور پہناوے جس طرح جدت کے نام پر نئے فیشن میں ڈھل کر ثقافتی تبدیلی کا باعث بنے ، اس بارے میں انتظار حسین اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب "چراغوں کا دھواں" میں لکھتے ہیں:

> رومن ہولی ڈے ، کے بعد سے سائیکل والیاں بھی تو بدل گئی تھیں۔ کمر اور چوٹی کا وہ عالم اب کہاں۔ آدرے ہیبرن والا سٹائل اپنا رنگ دکھا رہا تھا۔ زلف دراز کی حکایت مختصر ہوتے ہوتے بس جیسے غزل تک رہ گئی ہو۔ہاں قمیص کے دامن میں بھی تو اختصار آگیا تھا۔(۳۱)

یہاں دیکھا جاسکتا ہے کہ ثقافتی تبدیلی کس طرح طرح دھیرے دھیرے لاہور کے خطے میں سرایت ہوتی چلی گئی ۔ پہلے برقعہ اور پردہ گیا، اس کے بعد وہ قمیض جو گھٹنوں کو چھو رہی ہوتی تھی ، وہ بھی گئی اور ساتھ ہی وہ چوٹیاں بھی ختم ہوئیں بلکہ ان کی جگہ اب آدرے ہیبرن والے ہئیر سٹائل نے لے لی ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بدلتا چلتا گیا۔ ملبوسات اور جسم کی تراش خراش میں ہونے والی اس تبدیلی نے لاہور کی قدیم ثقافت کو بدل کر رکھ دیا اور پھر فیشن کے نام پر یہ سب کچھ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ یہ اقدار اس قدر سماج میں رائج ہو گئیں کہ اب انھیں ثقافتی اقدار کا درجہ حاصل ہو چکا ہے۔ اب لاہور کا کوئی تہوار ہو یا کوئی بھی تقریب، اس میں یہ ثقافتی اقدار اپنا اظہار کھل کر کرتی دکھائی دیتی ہیں ۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پہناووں میں آنے والی تبدیلی نے مردوزن کے اذہان اور نفسیات میں بھی تبدیلی پیدا کی ۔ جدت اور قدامت کے فرق کو بھی انھی ثقافتی عناصر کے ذریعے سمجھا اور جانچا جانے لگا۔ یوں سماجی اور تہذیبی اقدار بھی بدلتی چلی گئیں۔ جس کے نتیجے میں آج کا لاہور سماجی، تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے قدیم لاہور سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اردو آپ بیتی نگاروں

نے اس ثقافتی تبدیلی کو مختلف زاویوں سے جانچا، پرکھا اور خود پر بیتے ہوئے حالات کے تناظر میں اسے آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں بیان کیا ہے۔

لاہور کی ثقافت کا ایک اہم عنصر تانگہ ہے۔ اگرچہ پورے پنجاب میں تانگے کی سواری استعمال ہوتی تھی اور اب بھی بعض علاقے ایسے ہیں جہاں ابھی تک تانگے کا رواج ہے، لیکن لاہور میں تانگے کو ایک ثقافتی عنصر کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک عوامی سواری ہونے کے ناطے یہ خاص وعام کے استعمال میں تھی۔ انسانی زندگی کے روزمرہ امور کا حصہ تھی۔ اس کے علاوہ خاص تقریبات میں اس ثقافتی عنصر کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ پہلوانوں کے اکھاڑے ہوں یا تہواروں کے جلوس ہر جگہ تانگے کی موجودگی لازم تھی۔ خاص ثقافتی مظاہر کے لیے تانگوں کی مخصوص انداز میں سجاوٹ بھی الگ سے ثقافتی اقدار کی عکاسی کرتی تھی۔

اردو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے تانگے کو ایک ایسے ثقافتی عنصر کے طور پر پیش کیا ہے جو لاہور کی قدیم ثقافت کا ایک اہم جزو سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے آپ بیتی نگاروں نے اس ثقافتی عنصر کو پیش کرتے ہوئے عہد بہ عہد اس میں آنے والی تبدیلیوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ اے حمید اپنی یادداشتوں کے مجموعے "لاہور لاہور اے" میں لاہور میں چلنے والے قدیم تانگوں کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور میں تانگے دو طرح کے ہوتے تھے۔ لاہوری تانگے اور پشاوری تانگے۔ یہ تانگے خاص وضع قطع کے ہوتے تھے۔ لاہوری تانگے کے بم آگے سے کمان کی طرح نیچے کو جھکے ہوتے تھے جب کہ پشاوری تانگوں کے بم بالکل سیدھے ہوتے تھے۔ یہ خاص قسم کے تانگے ۱۹۵۰ء کی دہائی کے بعد پھر نظر نہیں آئے۔ ان تانگوں میں جتے ہوئے گھوڑوں کو پانی پلانے کے واسطے پانی کی حوضیاں ہوا کرتی تھیں۔(۳۲)

یہ وہ تانگے تھے جو قیام پاکستان سے قبل لاہور میں عام پائے جاتے تھے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان میں بھی تبدیلی واقع ہوتی چلی گئی۔ اس تبدیلی کی وجہ بھی وہ ثقافتی عناصر تھے جنھوں نے جدت کے نام پر قدیم لاہور سے روگردانی اختیار کرنا شروع کر دی تھی ۔ اے حمید کے مطابق بھی یہ تانگے بیسویں صدی کے ابتدائی نصف تک لاہور میں موجود تھے۔ اس کے بعد جب حالات نے پلٹا کھایا اور یہ ثقافتی عنصر بھی مادیت پرستی کی نظر ہوتا چلا گیا۔

لاہور میں تانگے کو شرفا کی سواری بھی سمجھا جاتا۔ آج کے لاہور کو دیکھا جائے تو شرفا کا تانگوں میں سفر کرنا ناقابل یقین محسوس ہوتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تانگہ لاہور کی ثقافت کا اہم جزو قرار پا چکا تھا۔ یہی وجہ ہے لاہور کی ثقافت پر بننے والی مختلف فلموں اورڈراموں میں بھی اس ثقافتی عنصر کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ اگر ہم سینما یا فلم کا ثقافتی تناظر میں مشاہدہ کریں تو بے شمار فلمیں ایسی ملتی ہیں جو لاہور کی ثقافت عکاسی کرتی ہیں۔ ان میں تانگے کو نہ صرف استعمال کیا گیا ہے بلکہ اسے ثقافتی رنگ سے مزین کرنے کے لیے وہ خاص سجاوٹ کا حامل بھی دکھایا گیا ہے جو لاہور کی ثقافت کا اہم عنصر ہوتے تھے۔ انتظار حسین لاہور میں تانگے کی تہذیبی اور ثقافتی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے اپنی یادداشتوں کے مجموعے "چراغوں کا دھواں" میں لکھتے ہیں:

> اور تانگہ وہ اس شہر میں بھی ایک معزز سواری سمجھا جاتا تھا۔ شرفا ٹھسے سے تانگے کی پچھلی نشست پر بیٹھے ہیں اورمال سے گزررہے ہیں۔ دن ڈھلنے لگا ہے۔ ایک تانگہ نمودار ہوا ہے۔ کافی ہاؤس کی سمت اس کا رخ ہے ۔ پچھلی نشست پر ایک بزرگ صورت شخص چھڑی سنبھالے بیٹھا ہے ۔بھاری جثہ ، لمبے تڑنگے، مونچھیں بھری بھری ، آنکھوں پر عینک لگی ہوئی، یہ مولانا چراغ حسن حسرت ہیں۔ معمول کے مطابق کافی ہاؤس پہنچیں گے روزانہ کی صحبت گرم ہوگی۔ (۳۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تانگہ صرف عوامی سواری ہی نہیں تھی بلکہ خواص کی سواری بھی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ ثقافتی عنصر بھی تبدیلی کا شکار ہوتا چلا گیا۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ قدیم لاہور سے لے کر بیسویں صدی کی ساتویں دہائی تک لاہور میں اس ثقافتی عنصر کی موجودگی اور اس کا اظہار اس قدر تھا کہ اس کے بغیر لاہور کی ثقافت کا کوئی مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں آنے والی تبدیلی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان میں ایوب خان کے دور میں جب مختلف اصلاحات کا ڈول ڈالا گیا تو ان کے ملک گیر اثرات سامنے آئے۔ ذرائع آمدورفت میں ہونے والی تبدیلی نے لاہوریوں سے تانگہ بھی چھین لیا۔ یہاں تک کہ مال روڈ جو لاہور کی ثقافت کا اہم مرکز مانا جاتا تھا وہ بھی اس ثقافتی عنصر سے خالی ہوتا چلا گیا اور اس کی جگہ جدید ذرائع نقل حمل نے لے لی۔ ایوب خاں کے دور میں یہ ثقافتی عنصر کس طرح تبدیلی کے عمل کی بھینٹ چڑھا اس بارے میں انتظار حسین اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> جرنیل ایوب نے کوس لمن الملکی بجایا۔ پھر زمانہ بدلا، نئی سواریاں نمودار ہوئیں جو تیز دوڑتی تھیں اور شور سوا کرتی تھیں۔ سکوٹر نمودار ہوا، پھر رکشا کی نمود ہوئی اس کے ساتھ ہی پیلی ٹیکسی کا ورود ہوا۔ ادھر موٹروں کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔ نئی سواریوں کی اس دوڑ میں تانگہ بہت پیچھے رہ گیا۔ بہت جلد مال روڈ پر اس کا داخلہ بند ہو گیا۔(۳۴)

جدید ذرائع نقل وحمل نے اگرچہ سفر کو مختصر اور سہولیات میں اضافہ کر دیا لیکن اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہ جدید ذرائع ثقافتی عنصر کا درجہ نہ پاسکے۔ اس کی وجہ تانگے کے ساتھ کوچوان اور وہاں کے لوگوں کا جو ثقافتی اور تہذیبی رویہ تھا، تانے کی سجاوٹ، اس کے آگے جتے ہوئے گھوڑے اور پھر کوچوان کی اپنی سجاوٹ یہ سب مل کر جس ثقافتی منظر نامے کی عکاسی کرتے تھے، جدید ذرائع نقل وحمل کے شور، آلودگی اور دھویں میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انتظار حسین، جنرل ایوب کے دور میں مال روڈ اور تانگے کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کو سامنے لاتے ہیں کہ وقت

گزرنے کے ساتھ ساتھ لاہور کا ثقافتی مظہر تانگہ بھی معدوم ہوتا چلا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں مال روڈ پر اس ثقافتی مظہر کی معدومی کا ذکر وہ یوں کرتے ہیں:

> مال پر تانگہ کا داخلہ ممنوع ہو چکا تھا۔ اب یہ شاہراہ نئی سواریوں کے شور سے گونج رہی تھی اور شور سا شور۔ ایک شور رکشاؤں کا، دوسرا شور سکوٹروں، پھر موٹر ٹیکسیاں، موٹریں، اومنی بسیں۔(۳۵)

لاہور کے مال روڈ سے تانگے کا نکلنا تھا کہ رفتہ رفتہ باقی لاہور بھی تانگوں سے خالی ہوتا چلا گیا۔ وہ ہلا شیری اور لگاؤ جو تانگے پر بیٹھنے والوں کے دل میں پیدا ہوتا وہ بھی اس کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ انتظار حسین لاہور کے اس ثقافتی عنصر کی معدومی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے متبادل ذرائع کا بیان یوں کرتے ہیں کہ ان کے شور اور آلودگی کے پیچھے دور کہیں تانگے کی معدوم ہوتی ثقافتی اقدار کے نوحے ملتے ہیں۔ تانگے کو لاہور کی ثقافت میں جو مقام حاصل تھا نقل و حمل کے جدید ذرائع اپنی تمام تر سہولیات اور آسائشوں کے باوجود وہ حاصل کرنے سے قاصر رہے۔ اردو آپ بیتی نگاروں نے تانگے کو نقل و حمل کے ذریعے کی بجائے ایک ثقافتی عنصر کے طور پیش کیا ہے۔

فن تعمیرات کسی بھی سماج کے ثقافت پہلو کو نمایاں کرتا ہے۔ کسی بھی سماج میں بنائی جانے والی رہائشی اور دیگر عمارات اس سماج میں بسنے والے لوگوں کے سماجی، تہذیبی اور ثقافتی رویوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس فن میں آنے والی تبدیلیوں سے سماج کے ثقافتی تغیر کو سمجھا جاسکتا ہے۔ تعمیرات کا فن صرف عمارتوں کی تعمیر تک ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ بنظر غائر اس کا مطالعہ کیا جائے تو اس کے پیچھے وہ محرکات ہوتے ہیں جو کسی بھی سماج کی ثقافتی اور تہذیبی صورت حال سے جنم لیتے ہیں۔ اس سے آگے بڑھتے ہوئے یہ فن مذہبی رجحانات کا بھی حامل ہوتا ہے اور مذہب کو کسی بھی ثقافت سے منہا نہیں کیا جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں کی تعمیرات کا انداز مختلف ہوتا ہے۔ کسی مخصوص طرز کی عمارت نہ صرف اس مذہب کی نمائندہ ہوتی ہے بلکہ اس مذہب کی ان ثقافتی اقدار کو بھی نمایاں کرتی ہے جن کے تانے بانے مذہب سے ملتے ہیں۔ دوسری طرف

دیکھا جائے تو مختلف شہنشاہوں اور بادشاہوں کے شوق کو بھی فن تعمیرات میں خاصا عمل دخل ہے۔ یہ شوق بھی کئی حوالوں سے ثقافتی تبدیلی کا باعث بنتا ہے۔

لاہور کے خطے میں فن تعمیرات کے ارتقا کا جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ یہاں مذہب اور بادشاہوں کے شوق دونوں نے اس شہر میں ایسی ایسی شاہکار عمارتیں تعمیر کروائیں جو لاہور کی ثقافت کا اہم جزو بن کر رہ گئیں۔ صدیوں کے زمانے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے یہ عمارات آج بھی لاہور کی ثقافت کا اہم عنصر قرار پاتی ہیں۔ اس شہر میں بننے والی تاریخی عمارتوں کا حسن آج بھی قائم ہے۔ اگرچہ بہت سی عمارتیں جدت کے نام پر زمانے کی دست برد کا شکار ہو گئیں لیکن آج بھی لاہور میں ایسی تاریخی عمارتیں موجود ہیں جو تاریخی کے ساتھ ساتھ ثقافتی اہمیت کی بھی حامل ہیں۔ بعض عمارتیں تو خاص ثقافتی نقطہ نگاہ سے تعمیر کی گئی تھیں۔ انتظار حسین اپنی یادداشتوں "چراغوں کا دھواں" میں مال روڈ کے کونے میں قائم ہونے والی عمارتوں کے ثقافتی پہلو کو سامنے لاتے ہوئے لکھتے ہیں:

> مال روڈ پر یہ نکڑ (ٹولنٹن مارکیٹ) ایک زمانے تک مخصوص اہمیت کا حامل رہا ہے۔ سمجھ لو کہ یہ پورا علاقہ ایک طرح کا کلچرل کمپلیکس تھا۔ سامنے پنجاب یونی ورسٹی، اس کے بالمقابل عجائب گھر اور نیشنل کالج آف آرٹس، اسی کے عقب میں پنجاب پبلک لائبریری، سامنے کافی ہاؤس۔(۳۶)

انتظار حسین نے یہاں جن عمارتوں کا ذکر کیا ہے ان کی تعمیر ہی ثقافتی اور تہذیبی عمل کے ذریعے ہوئی۔ پنجاب یونی ورسٹی، عجائب گھر، نیشنل کالج آف آرٹس، پبلک لائبریری، کافی ہاؤس کون سی ایسی چیز ہے جو لاہور کی ثقافت کا حصہ نہیں ہے۔ کلچرل اہمیت کے حامل اس علاقے میں لاہور کی ثقافتی اقدار اپنے جوبن پر دکھائی دیتی ہیں۔

لاہور کی ثقافت کو مذہب کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہاں ایسی ایسی مساجد بھی تعمیر کی گئیں جو مذہبی عبادات کی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ اسلامی ثقافت کا بھی عمدہ نمونہ قرار پاتی ہیں۔ بادشاہی مسجد، موتی مسجد، مسجد شہدا اور دیگر بہت سی ایسی مساجد ہیں جو اسلامی ثقافت کی آئینہ دار ہیں۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ مذہبی عمارت کی تعمیر کسی بھی مذہب کی ان اقدار سے مخصوص ہوتی ہے جو اس مذہب کی قدر کا درجہ پا چکی ہوتی ہیں۔ اگر ان سے انحراف کیا جائے تو بہت سے تنازعات اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس کی ایک مثال انتظار حسین کی یادداشتوں کے مجموعے "جستجو کیا ہے؟" سے ملتی ہے جس میں وہ لاہور کے ریگل چوک میں موجود مسجد شہدا کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اب جو لاہور کے ریگل چوک میں مسجد شہدا اپنے ایک مینار کے ساتھ کھڑی ہوئی ہے، وہ آسانی سے تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اس کی تعمیر کو عبداللہ چغتائی کی تحقیق سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ انہوں نے پہلے بیانات جاری کیے کہ یہ مسجد مسجدوں کی روایتی طرزِ تعمیر کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔ مسجد کے چار مینار ہوتے ہیں اور اس کا طرزِ تعمیر طے شدہ ہے۔ جب مسجد بنانے والے نہ مانے تو پھر انھوں نے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ غرض محقق نے تو اس ضمن میں تحقیق کے دریا بہا دیے لیکن مسجد پھر بھی بن کر کھڑی ہو گئی۔(۳۷)

انتظار حسین کی یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ثقافت اور ثقافتی اداروں کے بارے میں بڑے حساس ذہن کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنی یادداشتوں میں لاہور کے جن ثقافتی عناصر کا تذکرہ کیا ہے وہ ان کے مشاہدے کا حصہ ہیں۔ لیکن انھیں اس بات کا بھی شدید قلق ہے کہ لاہور کے بہت سے ثقافتی ادارے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے سے قاصر رہے ہیں جس کی وجہ سے لاہور کا ثقافتی تشخص مجروح ہوتا چلا گیا ہے۔ اس ضمن میں وہ ادارے بھی تساہل کا شکار ہوئے جن کی

تشکیل ہی ثقافتی مقاصد کے تحت کی گئی تھی۔ وہ اپنی یادداشتوں کے مجموعے "چراغوں کا دھواں" میں لکھتے ہیں۔

> اس شہر میں ثقافتی ادارے ایسے کون سے بہت تھے۔ لے دے کے ایک آرٹ کونسل، فنون کے ذیل میں جو کچھ ہوتا تھا یہیں ہوتا تھا۔ یہ آرٹ کونسل کیا خوب تھی۔ وسیع و عریض سبزہ زار، اس کے بیچ جابجا کھڑے ہوئے چیڑ کے بلندوبالا درخت۔ ان سے پرے ایک مختصر سی عمارت۔ کمروں کے بیچ ایک مختصر سا آڈیٹوریم۔ اس میں کھیل ہوتے تھے۔ اگر ہال کی ساری نشستیں پر ہوجاتیں تو سمجھا جاتا کھیل سپرہٹ ہوگیا۔ ان دنوں یہاں تھیٹر کی سرگرمی تیز تھی۔(۳۸)

انتظار حسین نے بیسویں صدی کے نصف کے لاہور کی ثقافتی سرگرمیوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ان کی یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے اس حقیقت سے بھی آشنائی ہوتی ہے کہ وہ اس بات پر شدید شاکی تھے کہ اس ثقافتی شہر کی ثقافتی سرگرمیوں اور ثقافتی عناصر کو فروغ دینے کی بجائے تباہ کردیا گیا۔ اس تباہی کا ذمہ دار وہ ان اداروں کو قرار دیتے ہیں جو ثقافت کے نام پر محض خانہ پری کے لیے رہ گئے تھے۔ وہ ۱۹۶۴ء کے لاہور کا ذکر کرتے ہوئے یہی نوحہ پڑھتے ہیں کہ یہ شہر جو تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہوتا تھا اور جس میں تہذیب و ثقافت کی آبیاری ہوتی تھی، نادیدہ قوتوں نے ذاتی مفادات کی خاطر اس کی ثقافت کو تباہ و برباد کردیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لاہور کی ثقافتی سرگرمیاں کم ہوتے ہوتے معدوم ہوتی چلی گئیں اور ثقافت کے نام پر ایسے ایسے کارنامے انجام دیے جانے لگے جن کا ثقافت سے زیادہ ذاتی مفادات سے تعلق تھا۔ ۱۹۶۴ء تک پہنچتے پہنچتے لاہور کا ثقافتی منظرنامہ کیا صورت حال اختیار کرچکا تھا، اس بارے میں انتظار حسین اپنی یادداشتوں کے مجموعے میں لکھتے ہیں:

> ثقافت کی حدتک اس شہر کا اتنا ہی مقدور تھا۔ رہا باہر کی ثقافتی دنیا سے رابطہ تو وہ بس چین کی حدتک تھا اور عجب بات ہے تب سے اب تک

چین ہی کی حد تک ہے ۔ بس یہی کہ ادھر سے کوئی ثقافتی طائفہ یہاں آن وارد ہوا۔ یہاں سے کوئی ثقافتی طائفہ اُدھر چلا گیا۔ چار ادیب ادھر سے آئے اور ہمیں صورت دکھا گئے ۔ یہاں سے ادیبوں کی کوئی ٹولی اٹھی اور علم کی تلاش کے نام پر چین جا پہنچی ۔ خیر چین کوئی ایسا ویسا ملک تو نہیں ہے ۔ ایک قدیم تہذیب کا وارث ہے ، مگر ہمارا تو جتنا بھی رابطہ ہوا ہے ، انقلابی چین کی ثقافت سے ہوا ہے اور یہ ہم آپ جانتے ہیں کہ انقلاب لانے والے ادب اور ثقافت کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں ۔(۳۹)

انتظار حسین کی عالمی حالات پر گہری نظر تھی ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں کے سماج پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں خاص طور پر وہ سرگرمیاں جو جبر کے ذریعے سماج پر نافذ کی جاتی ہیں یا جن کے پیچھے تشدد کارفرما ہو، ایسی سرگرمیاں اگرچہ کچھ عرصہ تک عوام الناس کو اپنے حق میں کرنے میں تو معاون ثابت ہو سکتی ہیں لیکن سماج کے مجموعی مزاج کا حصہ نہیں بن پاتیں۔ یہ الگ بات ہے کہ چین کی طرح انقلاب کے بعد سماجی فلاح کے ایسے اقدامات کیے جائیں اور ایسی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کو فروغ دیا جائے کہ لوگوں کو انقلاب بھی ایک رحمت محسوس ہونے لگے ۔ انتظار حسین نے یہاں بڑے کرب کا اظہار کرتے ہوئے اس لاہور کا نوحہ بیان کیا ہے جو کسی دور میں برصغیر کی تہذیب و ثقافت کا مرکز مانا جاتا تھا لیکن مفاد پرست عناصر نے اس کی اصل ثقافت اور فروغ دینے اور ترقی دینے کی بجائے اسے معدوم کرنا شروع کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ ثقافتی مرکز اصل ثقافتی سرگرمیوں سے دور ہوتا چلا گیا۔

ثقافتی عناصر میں موسیقی ایک ایسے عنصر کے طور پر سامنے آتی ہے جو دنیا کی ہر ثقافت کا اہم جزو رہی ۔ آج بھی، کسی بھی سماج میں رواج پانے والی موسیقی اس سماج کی ثقافتی صورتحال کی عکاسی کرتی ہے۔ لاہور کی ثقافت میں بھی موسیقی کو اہم عمل دخل ہے ۔ موسیقی خواہ صوفیانہ ہو یا کسی بھی اور قسم کی اس کا ترنم سننے والوں پر وہ وجد طاری کرتا ہے کہ وہ اس وقت کسی اور چیز کی طرف دھیان

دینے کا خیال بھی ذہن میں نہیں لا پاتے ۔ لاہور کا ثقافتی تناظر میں مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صوفیانہ موسیقی کے ساتھ ساتھ کلاسیکی اور جدید موسیقی بھی ثقافت کا لازمی جزو رہی ہے اور آج بھی یہ صورتحال کسی نہ کسی صورت میں قائم ہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں بھی اس ثقافتی عنصر کو بڑے جاندار انداز میں بیان کیا گیا ہے ۔ بہت سے آپ بیتی نگار ایسے ہیں جنھوں نے موسیقی کی محفلوں میں خود شرکت بھی کی تھی اور اس اہم ثقافتی عنصر کے بارے میں وہ گہرا مشاہدہ بھی رکھتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان آپ بیتیوں میں اس ثقافتی عنصر کی پیش کش بہت زیادہ ملتی ہے ۔ انتظار حسین اپنی یادداشتوں کے مجموعے " چراغوں کا دھواں " میں لاہور میں موسیقی کے اکٹھ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حیات احمد خاں کی پاکستان موسیقی کانفرنس نے یہ طور اپنایا تھا کہ موسیقی کا سالانہ جشن دھوم سے منایا جاتا اور اس کے لیے کلاسیکی موسیقی کے دو ڈھائی نگ ہندوستان سے بھی منگا لیے جاتے ، مگر یہ سلسلہ بھی ۶۵ء میں جا کر ختم ہو گیا۔(۴۰)

انتظار حسین کو یہاں بھی یہ دکھ ہے کہ لاہور کی ثقافت جس موسیقی کی مرہون منت تھی وہ معدوم ہوتی چلی گئی ہے۔ اردو آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر کئی تخلیق کاروں نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے ۔ یہ ایسے تخلیق کار ہیں جنھوں نے وہی زمانہ پایا جو انتظار حسین کا تھا۔ یوں انتظار حسین جیسے مشاہدات ان کے بھی تھے۔ ایسے تخلیق کاروں میں ایک اہم نام مستنصر حسین تارڑ کا بھی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی یادداشتوں میں لاہور کے مٹتے ہوئے اس ثقافتی عنصر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> وہ نشان بھی ملیا میٹ ہو گئے تھے جہاں بڑے غلام علی خان آیا کرتے تھے ، فریدہ خانم جس کوٹھے پر بیٹھ کر غزل سرا ہوتی تھی ۔ یہاں فلم سٹار نادرہ کا کوٹھا ہوا کرتا تھا۔ مہدی حسن ، غلام علی بھی آتے جاتے رہتے

> تھے۔ یہیں کہیں برصغیر کی نامور کلاسیکی گلوکارہ عنایت بھائی ڈھیروالی کا گھر تھا جو کہ ٹھمری اور دادرے کی گائیکی میں بے مثال تھی۔(۴۱)

موسیقی لاہور کی ثقافت کا نمایاں عنصر ہے۔ یہاں بڑی بڑی مغنیہ اور گویے بھی موجود رہے ہیں جنھوں نے سُر اور تال کی دنیا میں نام کمایا۔ اردو آپ بیتیوں میں نہ صرف موسیقی جیسے ثقافتی عنصر کا تذکرہ ہے بلکہ وہ فن جو اس ثقافتی فن کی آبرو تھے، ان کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عام گلی محلوں کے سُر تال بھی آپ بیتیوں میں سامنے آتے ہیں۔ اس ضمن میں اے حمید کا ایک بیان ملاحظہ ہو:

> گنج شہیداں چوک کے تکیہ سادھواں میں محفل موسیقی ہوتی تھی۔ اس محفل موسیقی میں شوقیہ گانے والوں کے علاوہ استاد عاشق علی خان اور ملکہ موسیقی روشن آرا بیگم بھی حصہ لیا کرتی تھیں۔ اندرون شہر چل پھر کر گانے والوں میں موتی شاہ بڑا مشہور تھا۔ اس کی آواز بڑی طاقتور تھی۔ وہ ہمیشہ بڑی اونچی آواز میں گاتا تھا۔ وہ فقیروں، ملنگوں والا لباس پہنتا تھا۔ اس کی آواز اتنی پاٹ دار تھی کہ اگر وہ موچی دروازے کے باغ میں گا رہا ہوتا تو اس کی آواز دلی دروازے اور ٹکسالی دروازے تک جاتی تھی۔ لوگ بڑے شوق سے اپنے مکان کی بیٹھک یا دکان کے اندر بلا کر اس کا گانا سنتے تھے۔(۴۲)

موسیقی کا یہ ثقافتی عنصر صرف کوٹھوں یا مخصوص محفلوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ گھروں اور سماجی سطح پر بھی اس کا چلن عام تھا۔ یہاں تک کہ غیر مسلم بھی اپنے تہوار مناتے وقت موسیقی کو لازمی ملحوظِ خاطر رکھتے تھے۔ وہ عیسائی جو لاہور کے باسی تھے اور لاہور میں نسل در نسل آباد چلے آتے تھے، آپ بیتی نگاروں نے ان کے بارے میں سماجی مشاہدات بیان کرتے ہوئے بھی اس ثقافتی عنصر کو

خاص اہمیت دی ہے۔ گڑھی شاہو کے علاقے میں آباد عیسائی اپنے مختلف تہواروں میں موسیقی جیسے ثقافتی عنصر کو کتنی اہمیت دیتے تھے، اس بارے میں مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> اُدھر گڑھی شاہو کے علاقے میں پاکستان ریلوے کی ملازمت کرنے والے بہت پر امن اور رنگیلے عیسائی رہا کرتے تھے۔ وہ برٹ انسٹی ٹیوٹ کے ڈانسنگ ہال میں کرسمس اور نیو ایئر نائٹ مناتے مسرت سے ناچتے تھے، گڑھی شاہو کے گھروں کے اندر سے پیانو کی آوازیں ابھرتی تھیں اور مجھے یاد ہے ایک بوڑھا عیسائی پیانو پر بیتھووِن کا "مون لائٹ سناٹا" بجایا کرتا تھا۔ انگریزوں کے رخصت ہونے پر وہ بیچارے سے ہو گئے تھے۔(۴۳)

لاہور کی ثقافت کا ایک اہم مظہر صداکاری بھی ہے۔گلی محلوں میں صدا لگانے والے افراد لاہور کی ثقافت کا ایک ایسا چہرہ تھے جو اب معدوم ہو چکا ہے۔ قدیم لاہور میں صداکاری کا ثقافتی عنصر مختلف صداکار خاندانوں میں نسل در نسل چلا کرتا تھا۔ یہ صداکار ایک طرف خوش الحان ہوتے تھے دوسری طرف ان کی صداکاری میں مہارت اس قدر زیادہ ہوتی تھی کہ ان کی آواز جب گلی محلوں میں گونجتی تھی تو اک سماں باندھ دیتی تھی۔ یہ ثقافتی عنصر اگرچہ بعض دوسرے علاقوں میں بھی پایا جاتا ہے لیکن لاہور میں نسل در نسل چلا آتا یہ ثقافتی ورثہ اپنی خاص اہمیت رکھتا تھا۔ موجود عہد کے تناظر میں دیکھا جائے تو لاہور کا یہ ثقافتی ورثہ بھی اب معدوم ہو چکا ہے۔ مستنصر حسین تارڑ لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> لاہور کی آوازوں اور صداؤں میں ایک صدا ایک بوڑھے گلوکار کی ہے جو دف بجاتا گلی گلی گاتا پھرتا ہے۔ میں لاہور کے گورنر دینا ناتھ کی حویلی کے تباہ ہوتے آثار میں بھٹکتا پھرتا تھا جب وہ گلوکار دف بجاتا آیا اور ایک نعت رسول ﷺ الاپنے لگا، کھڑکیوں کی اوٹ میں چہرے

تھے، حویلی دینا ناتھ کے قدیم کمروں میں زندگی کرتے لوگ اس گلوکار کے لیے اپنے بچوں کے ہاتھوں خوراک، آٹا، پھل فروٹ بھیجتے تھے اور وہ ان تحائف کو اپنی جھولی میں سمیٹتا تھا، کبھی کچھ دس بیس روپے بھی کسی جھروکے میں سے ڈولتے ہوئے اس کے قدموں میں آگرتے، میں نے پوچھا بابا آپ کون ہیں ؟کہنے لگا" میں صدا لگاتا ہوں، میرا باپ، میرا دادا بھی انھی گلیوں حویلیوں میں صدائیں لگاتے تھے، لیکن میرے بچے باغی ہوگئے ہیں۔ انہوں نے کھوکھے بنالیے ہیں، کاروبار کرتے ہیں۔ میں لاہور کا آخری صداکار ہوں۔(۴۴)

صداکاری کا یہ ثقافتی عنصر اب لاہور سے بھی معدوم ہو چکا ہے۔ اب اگر کوئی صداکار دکھائی دیتا بھی ہے تو وہ رمضان المبارک یا ایسے ہی کسی مذہبی موقع پر محض چندہ اکٹھے کرنے یا اپنا مالی مفاد پورا کرنے کے لیے صداکاری کر رہا ہوتا ہے۔ یہ صداکاری کسی طور پر بھی ثقافتی حوالے سے قدیم نسلی صداکاروں کے معیار کی نہیں ہے۔

پہلوانی اور اکھاڑے لاہور کی ثقافت کا وہ عنصر ہیں جو زمانہ قدیم سے لے کر آج تک چلا آرہاہے۔ لاہور زندہ دلوں کی سرزمین ہے۔ اس پر مختلف پہلوانوں نے اپنے تن سازی اور پہلوانی کے جوہر اس طرح دکھائے ہیں کہ آج بھی یہ اکھاڑے اور پہلوانی لاہور کی ثقافت کا لازمی حصہ سمجھے جاتے ہیں۔ اردو آپ بیتیوں میں لاہور کے دیگر بہت سے ثقافتی عناصر کی پیش کش کے ساتھ ساتھ اکھاڑوں اور پہلوانوں کا تذکرہ بھی ملتاہے۔ انتظار حسین نے اپنی یادداشتوں میں لاہور کے گاماں پہلوان سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میں نے رستم زماں گاماں پہلوان کا کیا تصور باندھا تھا۔ کوئی لحیم شحیم قد آور شخصیت ہوگی۔ چلتا ہوگا تو دھرتی کا دل دھڑکتا ہوگا لیکن یہاں میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنی ڈبائی کا الطاف پہلوان یاد آگیا۔ جب اس

سے کشتی میں بہوا پہلوان کو پچھاڑا تھا اور اس کا جلوس نکلا تھا تو وہ کتنا شان وشوکت والا پہلوان نظر آرہا تھا اور یہ گاماں پہلوان ۔۔۔ مگر یہ پہلوان تو اب اپنا لنگر کھول چکا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کی زبان سے اس کی کشتیوں کا احوال سن کر اس کا رعب مجھ پر طاری ہوتا چلا گیا۔(۴۵)

گاماں پہلوان لاہور کی تاریخ اور ثقافت کا ایک ایسا عنصر تھا جسے لاہور والوں کے نزدیک ہیرو کی حیثیت حاصل تھی۔ کشتی اور پہلوانی کا یہ ماہر اپنے عہد میں رستم زماں کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

لاہور کے مختلف اکھاڑوں میں جب پہلوانی کے دنگل ہوتے تھے تو ایک عجب سا ثقافتی سماں بندھ جاتا تھا۔ ثقافت کے ایسے ایسے رنگ نکھرتے اور بکھرتے چلے جاتے تھے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے۔ دنگل سے ایک دن قبل پہلوانوں کا شہر میں گشت کرنا اور پھر ان کی تشہیر کے لیے اختیار کیے گئے مختلف طریقے ثقافتی منظر نامے کی عکاسی کرتے تھے۔ اے حمید اپنی یادداشتوں میں لاہور کے اس ثقافتی عنصر کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لاہور کے مشہور دنگل ہمیشہ سے منٹو پارک میں ہوتے تھے۔ ان دنگلوں کے بڑے بڑے رنگین پوسٹر چھاپے جاتے۔ پوسٹر کی دونوں جانب کشتی لڑنے والے پہلوانوں کا خاکہ بنا ہوتا تھا جس میں انھوں نے گرز اپنے کاندھوں پر رکھے ہوتے تھے۔ کسی دنگل کا نام "شاہی دنگل" تو کسی کا "کانٹے دار دنگل"، "پوپٹ دنگل" ہوتا تھا۔ دنگل سے ایک روز قبل دنگل کے منصف (جج) اور ٹھیکیدار کی سرپرستی میں پہلوانوں کا جلوس نکالا جاتا تھا۔ بڑے جوڑ کے پہلوان سب سے آگے تانگوں میں کیسری رنگ کی پگڑیاں باندھے بیٹھے ہوتے۔ ان کے پیچھے چھوٹے جوڑ کے پہلوانوں کے تانگے ہوتے تھے۔ جلوس کے آگے سوھنی کا بینڈ باجہ ہوتا جو فلمی دھنیں بجاتا جلوس کے ساتھ چلتا تھا۔ لوگ سڑک کے دونوں

> جانب کھڑے ہو کر اپنے اپنے پسندیدہ پہلوانوں کے حق میں نعرے
> لگاتے۔(۴۶)

اکھاڑوں اور پہلوانوں کی اس طرح عکاسی کرتے ہوئے اے حمید نے اس امر کو مد نظر رکھا ہے کہ لاہور کی ثقافت کو جاندار انداز میں پیش کیا جائے۔ تانگوں میں پہلوانوں کا آنا، منصفوں کا ساتھ بیٹھا، کیسری رنگ کی پگڑیاں، ڈھول، فلمی دھنیں یہ سب مل کر ایسا ثقافتی منظر نامہ تشکیل دیتے تھے کہ لاہور کی ثقافت کے رنگ بکھرتے چلے جاتے تھے۔

ثقافتی مظاہر میں کسی بھی خطے میں رہنے والے لوگوں کے روز مرہ کے معمولات بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر فارغ اوقات میں یہ لوگ اپنے روز مرہ کے معمولات مطابق جب کہیں جمع ہوتے ہیں تو ایسے اکٹھ بھی ثقافتی عناصر کو سامنے لاتے ہیں۔ لاہور کے حوالے سے دیکھا جائے تو لاہور کا اقبال پارک ایک اہم ثقافتی مرکز قرار پاتا ہے۔ یہاں لوگ اپنی دن بھر کی تھکن اتارنے جب جمع ہوتے ہیں تو لاہور کی ثقافت کے کئی رنگ بکھرتے نظر آتے ہیں۔ یہ آج کے لاہور کا ہی نہیں بلکہ قیام پاکستان سے قبل جب یہ منٹو پارک کہلاتا تھا اس وقت بھی لاہوری ثقافت کا اہم مظہر تھا۔ شہرت بخاری کی آپ بیتی "کھوئے ہوؤں کی جستجو" اس حوالے سے اہم ہے کہ انھوں نے اقبال پارک کو اس زاویے سے بھی دیکھا ہے اور آپ بیتی میں بیان کیا ہے۔ اجتماع اور اکٹھ خواہ کسی بھی نوعیت کا ہو، وہ کسی نہ کسی حد تک ثقافت کے اظہار کا ذریعہ بن ہی جاتا ہے اور روز مرہ کے اکٹھ، ثقافتی مظاہر کے معمول کے اظہار کو سامنے لاتے ہیں۔ شہرت بخاری اپنی آپ بیتی میں اقبال پارک میں لاہور کے رہنے والوں کے معمولات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> تیسرے پہر سے ڈیڑھ پہر رات گئے تک یہاں خاصی گہما گہمی رہتی ہے۔ شہر کی تنگ گلیوں اور چھوٹے چھوٹے مکانوں میں رہنے والے تازہ اور کھلی ہوا کو ترسے ہوئے لوگ یہاں آتے ہیں۔ بچے کھیلتے ہیں، بڑے چہل قدمی کرتے ہیں، بیٹھے ہوتے ہیں، لیٹ بھی جاتے ہیں۔ ان لوگوں

کی وجہ سے ریڑھیوں اور خوانچے والے بھی جمع ہو جاتے ہیں۔
گنڈیریاں، آلو چھولے ، آئس کریم اور دوسری عام کھانے کی چیزیں
فروخت کرتے ہیں۔ اچھے خاصے میلے کا سماں ہو تا ہے۔(۴۷)

لوگوں کا میلے کی صورت میں یہ اکٹھ ہی لاہور کی ثقافت کو نمایاں کرتا ہے۔ یہاں آنے والے چوں کہ سکون اور آرام کی تلاش میں آتے ہیں۔ بچے بھی ساتھ ہوتے ہیں ، اس لیے ان کے پہناوے، اندازِ نشست و برخاست اور مشروبات سے لاہور ثقافت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔

لاہور کی ثقافت کے متنوع رنگ ہیں۔میلے ٹھیلے، عرس اور اکٹھ کا سماں اور ہوتا ہے جب کہ تعلیمی اداروں اور دیگر کام کی جگہوں پر اور ثقافتی مظاہر دیکھنے کو ملتے ہیں۔ تعلیمی اداروں کے حوالے سے دیکھا جائے تو قیام پاکستان کے فوراً بعد کے دور اور آج کے عہد میں بھی خاصا فرق دکھائی دیتا ہے۔ اس کے علاوہ ان تعلیمی اداروں کے سربراہوں کے ذاتی رجحانات بھی اداروں کی ثقافتی فضا کو متاثر کرتے تھے۔ اس کی ایک مثال ہمیں پنجاب یونی ورسٹی اور ئینٹل کالج لاہور کے ان حالات سے ملتی ہے جب وہاں پابند شریعت ڈاکٹر سید عبد اللہ پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ شہرت بخاری ، سید عبداللہ کے ذہنی میلانات اور ان کے مزاج کا جائزہ لیتے ہوئے کالج کی فضا پر ان کے اثرات اور اس کے نتیجے میں دیگر اداروں سے اس کالج کے ثقافتی فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

آج کا یہ کالج اُس کالج سے اس قدر مختلف ہے کہ پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔میری کلاس میں بیس پچیس لڑکے اور آٹھ دس لڑکیاں تھیں۔ لڑکیاں عام طور پر برقعے میں ہوتی تھیں۔ان میں اور لڑکوں میں میل ملاپ کی عام اجازت نہیں تھی۔ بس دور دور رہتے تھے۔ استاذی ڈاکٹر سید عبد اللہ پرنسپل تھے۔انہوں نے یہ حقوق صرف اساتذہ کے لیے مخصوص کر رکھے تھے کہ کسی طالبہ سے بات کریں۔ لڑکے غریب یتیموں کی طرح طرح ترسے ترسے پھرتے تھے۔ سید صاحب کے علاوہ

اور بھی استاد تھے مگر وہ شاید اس قسم کی پابندیوں کے زیادہ قائل نہیں تھے اس لیے عام طالب علموں میں زیادہ روشن خیال مانے جاتے تھے۔(۴۸)

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کی ثقافت میں تبدیلی کا عمل اُس دور میں بھی ہو رہا تھا۔ روشن خیالی کے نام پر نئی ثقافتی اقدار سماج میں رائج ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ اگرچہ ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے بعض لوگ اس کو پسند نہیں کرتے تھے لیکن یہ ان کا ذاتی فعل اور سوچ ہی بن کر رہ گئی تھی جب مجموعی سماج نئی تہذیبی اور سماجی اقدار کو قبول کر چکا تھا اور ان کے اظہار میں کوئی قباحت بھی محسوس نہیں کی جاتی تھی۔

تہوار کسی بھی ثقافت کا اہم حصہ ہوتے ہیں۔ تہواروں کے مواقع پر ثقافتی رنگ نہ صرف اس علاقے کی ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ وہ مذہب جس کا وہ تہوار ہوتا ہے، اس کی مذہبی روایات بھی ثقافتی مظاہر کے ساتھ جھلکنے لگتی ہیں۔ عید کے تہوار مسلمانوں کے اہم تہوار ہیں۔ یہ تہوار جہاں ہماری اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے کا درس دیتے ہیں وہیں ان تہواروں پر گھروں اور بازاروں میں ہونے والی غیر معمولی سرگرمیاں ثقافتی رنگوں کو بھی نمایاں کرتی ہیں۔ قیامِ پاکستان سے قبل لاہور کے گھرانوں میں عید کے تہواروں پر جو ثقافتی رنگ بکھرتے تھے، خاص طور پر بچوں کے لیے جو لباس اور کھانے تیار کیے جاتے تھے، ان سے اس خطے کی ثقافت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی خودنوشت "اپنا گریباں چاک" میں اپنے بچپن کے حالات بیان کرتے ہوئے، عید کے موقع پر گھر میں ہونے والی مخصوص سرگرمیوں کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں کہ اُس عہد کی ثقافت کی جھلک بھی سامنے آجاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

جب عید کا چاند دکھائی دیتا تو گھر میں بڑی چہل پہل ہو جاتی۔ میں عموماً والد کو عید کا چاند دکھایا کرتا تھا۔ گو مجھے نہانے سے سخت نفرت تھی لیکن اس شب گرم پانی سے والدہ نہلاتیں اور میں بڑے شوق سے

> نہاتا۔نئے کپڑے یاجوتوں کاجوڑاسرہانے رکھ کر سوتا۔ صبح اٹھ کر نئے کپڑے پہنے جاتے، عیدی ملتی، کمخواب کی ایک اچکن جس کے نقرئی بٹن تھے، مجھے والدہ پہنایا کرتیں۔سرپر تلے کی گول مخملی ٹوپی پہنتا۔(۴۹)

عید کے موقع پر ہونے والی یہ چہل پہل صرف اقبالؒ کے گھر تک ہی محدود نہ تھی بلکہ یہ ایک ثقافتی مظہر بن کر پورے خطے میں اپنا جلوہ دکھاتی تھی۔ جاوید اقبال نے جن ملبوسات کاذکر کیاہے یہ بھی اس خطے کے ثقافتی منظرنامے سے خاص ہم آہنگی رکھتے ہیں۔اُس عہد میں عید کے موقع پر بچوں کو اسی طرح کے ملبوسات پہنائے جاتے تھے۔یہ ملبوسات عام طور پر صرف عید یاشادی بیاہ جیسے خاص مواقع کے لیے تیار کروائے جاتے تھے۔

مسلمان قوم کے تہواروں کے ساتھ ساتھ لاہور میں بسنے والی غیر مسلم اقوام کے تہوار بھی ثقافتی عکاسی کا اہم ذریعہ ہیں۔اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ہندوؤں کے مختلف تہواروں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ بیتی نگاروں نے ان کی ثقافتی اہمیت کو اجاگر کیاہے۔ اے حمید اپنی یادداشتوں میں ہندوؤں کے دیوالی کے تہوار کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دسہرے کے چند روز بعد لاہور کے ہندودیوالی کامیلہ مناتے ہیں۔یہ میلہ راجہ رام چندر کے بن باس کاٹ کر واپس اجودھیا آنے کی یاد میں منایا جاتاہے۔ اس دن کی خوشی میں ہندو اپنے مکانوں پر چراغاں کرتے ہیں۔مکانوں کی چھتوں اورمنڈیروں پر چراغ روشن کیے جاتے ہیں۔انارکلی کے ہندودکاندار اپنی دکانوں کو بجلی کے قمقموں سے روشن کرتے ہیں۔(۵۰)

ہندوؤں کے تہواروں میں جہاں ان کے مذہب کے رنگ بکھرتے ہیں وہاں لاہور کی ثقافت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ ثقافت کسی بھی سماج میں رہنے والے افراد کے رویوں اور طرزِعمل سے تشکیل

پاتی ہے۔ مسلمان تہواروں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے تہوار کو منائے جانے کی وجہ سے لاہور کی ثقافت متنوع رنگوں میں ڈھلتی دیتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ بھی ہندوؤں کے تہوار کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور کی یادوں کے دیئے بجھتے جاتے ہیں اور ان میں سے ایک یاد ایسی ہے جو کبھی بھڑکتی ہے اور کبھی بجھتی ہے اور وہ ہے لاہور کی دیوالی کی یادوں کے روشن دیئے۔۔۔کرشنا گلی۔۔۔کے برابر گاندھی سکوئر، ذرا فاصلے پر نسبت روڈ اور دائیں جانب گورو ارجن نگر، عالی شان مکانوں والے علاقے، وہ سب کے سب دیوالی کے موقع پر جگمگانے لگتے، لاکھوں دیئے منڈیروں پر روشن ہو جاتے، ہمارے گھروں میں ہندوؤں کی جانب سے مٹھائی آتی اور۔۔۔ ہم اپنی منڈیروں پر دیئے جلاتے، گوالمنڈی چوک میں درجنوں دکانیں مٹھائیوں سے سج جاتیں اور مٹھائیوں کے تھال سڑک پر آجاتے اور ان کے درمیان میں سے گزرنا مشکل ہو جاتا۔ آسمان آتش بازی کے بھڑکنے سے بھڑک کر روشن ہو جاتا۔ گوالمنڈی چوک کے مٹھائی کے تھالوں کے درمیان ہندو، کرشن کا رُوپ دھار کر رقص کرتے پھرتے۔(۵۱)

لاہور کی ثقافت تغیر پذیر رہی ہے۔ پچھلی چند دہائیوں سے اس شہر کے ثقافتی منظر نامے میں بہت تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ مقامی تہواروں کے ساتھ ساتھ غیر ملکی اور دیگر اقوام کے تہواروں نے لاہور کے رہنے والوں کے دلوں میں جگہ بنالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے ایسے تہوار ہیں جو ہماری اسلامی روایت سے کوئی تعلق بھی نہیں رکھتے لیکن لاہوریے انہیں بڑے شوق سے مناتے ہیں۔ مستنصر حسین تارڑ اس کی وجہ مقامی تہواروں پر لگنے والی پابندیوں کو قرار دیتے ہوئے ان غیر اقوام کے تہواروں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> بسنت کو پہلے تو ایک ہندو یا سکھ تہوار قرار دے کر مطعون کیا گیا اور پھر دھات کی ڈور کو بہانہ بنا کر لاہور کی اس شانداری کے رنگوں پر پابندی لگا دی گئی۔۔۔۔۔ مریض کا مناسب علاج کرنے کی بجائے اسے ہلاک کر دیا گیا۔۔۔۔بسنت یا بیساکھی اور مقامی میلوں ٹھیلوں کی سرکوبی کی جائے گی تو ہمارے ثقافتی مزاج اور اخلاقیات سے الگ، اجنبی تہوار رائج ہو جائیں گے۔ نیو ائیر نائٹ کا ہلا گلا اور پھر " سینٹ ویلنٹائن ڈے " جس روز پورے لاہور میں نہ صرف لڑکیاں بلکہ نہایت عمر رسید خواتین بھی سرخ جوڑے پہنتی ہیں ، گلاب کا ایک پھول سوسو روپے میں فروخت ہوتا ہے۔فارم ہاؤسوں اور حویلیوں میں جشن برپا ہوتے ہیں۔(۵۲)

بسنت لاہور کی ثقافت کا ایک اہم عنصر ہے۔اگرچہ آج کے دور میں دھاتی ڈور کے استعمال کی وجہ سے ہونے والے حادثات اور اموات کی صورت میں قیمتی جانوں کے ضیاع کی وجہ سے اس ثقافتی مظہر کو مختلف قسم کی پابندیوں کا سامنا ہے تاہم یہ بھی حقیقت ہے کہ قیام پاکستان سے قبل سے لے کر اکیسویں صدی کی دوسری دہائی تک بسنت لاہور کی ثقافت کے اہم عنصر کے طور پر سامنے آتا رہا ہے۔ ہر سال بسنت کے موقع پر جہاں پتنگ بازی ہوتی ہے وہاں دیگر ثقافتی مظاہر بھی سامنے آتے ہیں۔ پورا لاہور بسنت کے تہوار کے موقع پر ایک خاص رنگ میں رنگا دکھائی دیتا ہے جو اس شہر کی ثقافت کی پہچان بن کر ابھرتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بسنت کا تہوار جس جوش وخروش اور ثقافتی اہمیت کے تحت لاہور میں منایا جاتا ہے، کسی دوسرے خطے میں اس طرح نہیں منایا جاتا۔ یہ سلسلہ قیام پاکستان سے قبل کے عہد سے جاری ہے۔ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی خودنوشت " اپنا گریباں چاک " میں بسنت کے تہوار کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> بسنت کا دن منانے کے لیے بھی میری خواہش کے مطابق خوب اہتمام کیا جاتا۔ شب کو ڈور کا پنا اور پتنگیں سرہانے رکھ کر سوتا صبح اندھیرے

منہ ہم جولیوں کے ساتھ کوٹھے پر چڑھ جاتا۔ سارادن پتنگیں اڑاتے یا پیچ لڑاتے گزرتا اوررات گئے تک نیچے اترنے کا نام نہ لیتا۔(۵۳)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بسنت کا تہوار قدیم عہد سے لاہور کی ثقافت کا اہم حصہ چلا آرہاہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تہوار کو منانے اور اس کی ثقافتی اہمیت کو اجاگر کرنے کے انداز میں بھی تبدیلی آتی گئی ۔ عصرِ حاضر میں یہ ایک ایسا ثقافتی عنصر بن چکا ہے جسے اہتمام کے ساتھ منایا جاتاہے ۔ اس کے لیے مخصوص لباس تیار کروائے جاتے ہیں جن میں بسنت کی مناسبت سے زرد رنگ زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ مرزا ادیب بسنت کی خوبصورتی کا ذکر اپنی آپ بیتی "مٹی کا دیا" میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

میری دانست میں بسنت ایک ایسا تہوار ہے جس کے کئی عناصر ہیں اور صرف بسنت ہی نہیں ہر تہوار کے کئی عناصر ہوتے ہیں بسنت کے روز پتنگیں اڑانا، اس تہوار کا ایک جزو ہے، اصل تہوار نہیں ہے اصل تہوار وہ فضا ہے جو بسنت اپنے ساتھ لے کر آتی ہے یا یوں کہیے کہ یہ فضا دلوں کی شگفتگی، رنگارنگ لباس، بالخصوص خواتین کے بسنتی دوپٹے اور اچھے اچھے کھانے۔(۵۴)

لاہور کی ثقافت کا اصل اظہار اس وقت ہوتا ہے جب یہاں کسی دربار، درگاہ، خانقاہ وغیرہ پر کوئی میلہ یا عرس منعقد ہوتا ہے۔ یہ عرس قدیم لاہور سے لے کر جدید لاہور تک لاہور کی ثقافت کا اہم حصہ بن چکے ہیں۔ ہر دور میں ان بزرگوں کے درباروں پر جو سالانہ عرس منعقد ہوتے ہیں وہ ایک طرف ان بزرگوں سے عقیدت کا اظہار ہوتے ہیں تو دوسری طرف لاہور کی ثقافت کے بھی عمدہ مظہر ثابت ہوتے ہیں۔ اردو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگار ادیبوں نے اپنی تخلیقات میں لاہور کے ان اہم ثقافتی عناصر کی پیش کش بھی عمدہ انداز میں کی ہے۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتاہے کہ آپ بیتی نگاروں نے ان عروس کا خود مشاہدہ کیا اور ان میں بکھرنے والے ثقافتی

رنگوں کو اصل حقائق کے ساتھ بیان کیا ہے۔ لاہور کا شالیمار باغ اس حوالے سے ثقافتی اہمیت رکھتا ہے کہ اس باغ میں مختلف ثقافتی مظاہر رونما ہوتے تھے ان میں مختلف بزرگوں کے عرس اور دیگر میلے شامل ہیں۔ "پہلے پیر کا میلہ" لاہور کے ثقافتی منظر نامے میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ اس میلے کی خاص بات یہ ہوتی تھی کہ اس میں صرف خواتین کو شرکت کی اجازت ملتی تھی مستنصر حسین تارڑ اس میلے کے ثقافتی رنگوں کو نمایاں کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یہ رات کا نہیں دن کا سماں تھا۔ شالیمار کی روشوں کے دونوں جانب عاضی کھوکھوں میں مختلف اشیا اور فواروں کی نمائش لگی تھی۔ چوڑیاں، چنریاں، چادریں، زنانہ کھسے، چاندی کے زیور، گڈیاں اور پتنگیں کہ ان زمانوں میں لڑکیاں بھی آزادانہ پتنگیں اڑاتی تھیں، اور پھر خوراک کے کھوکھے، آلو چھولے، لڈو پیٹھیاں والے چٹنی اور مُولی کے قتلوں کے ساتھ، کھٹے میٹھے چنے، املی کا شربت، چنے اور حلوہ پوری۔(۵۵)

اس طرح کے ثقافتی رنگ لاہور میں ہونے والے مختلف چھوٹے بڑے میلوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ میلوں میں چوں کہ مختلف لوگوں کا اکٹھ ہوتا ہے اس لیے ایک ثقافتی سماں بندھتا دکھائی دیتا ہے۔ یہ میلے عقیدت کے اظہار کے ساتھ ساتھ ثقافت کے بھی عمدہ مظہر بن کر سامنے آتے ہیں۔ لاہور کی ثقافتی تاریخ اور ثقافتی منظر نامے میں ان میلوں اور عرسوں کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اے حمید لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں میں ان میلوں کی ثقافتی اہمیت اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور میں میلوں کی روایت بڑے قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔ ان میلوں ٹھیلوں میں لاہور کی ثقافتی زندگی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لاہور کا میلہ چراغاں سب سے مشہور میلہ ہے۔ اس میلے کی نسبت پنجاب کے صوفی شاعر شاہ حسین سے ہے۔۔۔۔ قیام پاکستان سے قبل پنجاب کے دور دراز دیہات سے سکھوں کی ٹولیاں، بولیاں اور ماہیا گاتیں میلے میں

شریک ہونے کے لیے آیا کرتی تھیں۔ آج بھی پنجاب کے دیہات سے دیہاتیوں، ملنگوں اور درویشوں کی ٹولیاں ڈھول کی تھاپ پر دھمال ڈالتی جلوس کی شکل میں آتی ہیں۔۔۔۔۔ شہر سے زندہ دلان لاہور ریڑھوں، تانگوں میں بیٹھ کر ٹولیوں کی شکل میں گاتے بجاتے میلے میں شریک ہونے آتے ہیں۔ تھیٹر لگ جاتے ہیں۔۔۔ جب رات بھیگ جاتی ہے تو سرخ کپڑوں والے ملنگوں کی ٹولیاں گھنگھرو باندھ کر ڈھول کی تھاپ پر دیوانہ وار رقص کرتے ہیں۔(۵۶)

لاہور میں شیخ علی ہجویریؒ کا مزار ایک طرف مرجع خلائق ہے تو دوسری طرف لاہور کی ثقافتی عکاسی کا بھی بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس دربار پر ہر سال منعقد ہونے والے میلے میں بھی لاہور کی ثقافت کے رنگ بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک آپ بیتی میں لاہور کی ثقافت کے حوالے سے اس دربار پر ہونے والے میلے میں ثقافتی عکاسی کی جھلک ملاحظہ ہو:

اس موقع پر داتا صاحبؒ کے مزار کے علاوہ سارے علاقے کو قمقموں کی روشنیوں سے سجایا جاتا ہے۔ زائرین دور دور سے ہزاروں کی تعداد میں اس میلے میں شرکت کے لیے آتے ہیں۔ یہ بڑا عظیم الشان میلہ ہوتا ہے۔ مزار کے باہر ٹکسالی اور موچی دروازے تک دکانیں لگتی ہیں۔ان دکانوں پر کھانے پینے کی اشیا کے علاوہ روزمرہ استعمال کی ہر شے دستیاب ہوتی ہے۔یہ میلہ دو دن تک لگتا ہے۔ اس میں ملک کے مشہور قوال حصہ لیتے ہیں۔(۵۷)

داتا دربار کے عرس کے موقع پر لگنے والے اس میلے میں کھانے کے سٹالوں کے ساتھ ساتھ یہاں آنے والے عقیدت مندوں کے لباس، ان کے رقص اور دیگر ایسی سرگرمیوں سے بھی ثقافتی رنگ بکھرتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ہونے والی قوالی سامعین کے دل و دماغ کو

معطر کرنے کے ساتھ ساتھ لاہور کی ثقافت کا بھی مثبت چہرہ سامنے لاتی ہے۔ اسی طرح دیگر درباروں پر ہونے والے میلے بھی لاہور کی ثقافت کا عمدہ نقشہ پیش کرتے ہیں۔ اردو آپ بیتی نگاروں نے ان میلوں اور عرسوں کی ثقافتی اہمیت کو آپ بیتیوں میں عمدہ انداز میں اجاگر کیا ہے۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتی نگاروں نے آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی ثقافت کی عکاسی بڑے عمدہ انداز میں کی ہے۔ انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کے تناظر میں لاہور کی ثقافت کے متنوع رنگ آپ بیتی اور یادداشتوں کی صورت میں نمایاں کیے ہیں۔

ج۔ سیاسی سماجی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کی ثقافت

اردو ادب میں ادیبوں کی لکھی ہوئی آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے علاوہ بعض ایسی آپ بیتیاں اور یادداشتیں بھی شائع ہوئی ہیں جو مختلف سیاسی و سماجی افراد کے قلم سے نکلی ہیں۔ ان آپ بیتیوں کی بھی ادبی حیثیت اہم ہے۔ ان میں پیش کیے گئے واقعات اور حالات میں زیادہ تر اُس عہد کے سیاسی و سماجی حالات کا عمل دخل ملتا ہے تاہم ان میں ادبیت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔ ایسی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں مختلف خطوں کے سیاسی و سماجی حالات کے ساتھ ساتھ ان خطوں کی تہذیب و ثقافت بھی جھلکتی دکھائی دیتی ہیں۔

لاہور کا خطہ ادبی اور سیاسی و سماجی حوالے سے خاصا زرخیز خطہ ہے۔ یہاں کی ادبی سرگرمیوں نے یہاں ایک ایسی فضا کی تشکیل کی کہ ہر لکھنے والے کی تحریروں میں لاہور جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی آپ بیتیاں اور یادداشتیں جن میں لاہور کے سیاسی و سماجی حالات کی عکاسی کی گئی ہے، ان میں اہلِ لاہور کے ثقافتی رنگوں کو بھی خاص اہمیت دی گئی ہے۔ ایسی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اگرچہ ادبی نقطہ نظر کو سامنے نہیں رکھا گیا بلکہ مختلف سیاسی و سماجی افراد نے اپنی زندگی کے سیاسی و سماجی اتار چڑھاؤ کو بیان کیا ہے تاہم اس عمل کے دوران میں وہ لاہور کی ثقافت کو بھی سامنے لاتے گئے ہیں۔ یہاں ہمارا موضوع بحث ایسی ہی سماجی و سیاسی آپ بیتیاں اور یادداشتیں ہیں جن میں مصنفین نے لاہور کے ثقافتی رنگوں کو اجاگر کیا ہے۔

سیاسی و سماجی افراد کا سماج سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ سماج کے دکھ سکھ میں شریک ہونا ان کی بنیادی ذمہ داریوں میں شمار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایسے افراد جب آپ بیتی یا یادداشت نگاری کے عمل سے گزرتے ہیں تو وہ مختلف سماجی، ثقافتی اور تہذیبی عناصر ان کے قلم سے قرطاس پر منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایسی آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سب سے زیادہ جو ثقافتی عناصر بیان ہوئے ہیں وہ مختلف تہواروں پر ہونے والے ثقافتی مظاہر ہیں۔ سیاسی

اور سماجی سطح پر متحرک مصنفین ان تہواروں میں بالخصوص شرکت کرتے تھے ۔ یہ شرکت مذہب اور قوم کے تصور سے ماورا ہوتی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان تہواروں کی تصویر کشی ان مصنفین نے بڑی تفصیل اور عرق ریزی سے کی ہے ۔ لاہور میں مسلمانوں کے علاوہ ہندو قوم کے افراد بھی کثیر تعداد میں آباد تھے ۔ یہ ہندو قوم اپنے تہواروں کے حوالے سے انتہائی حساس تھے ۔ ان تہواروں پر اپنے علاقے کی سجاوٹ کے ساتھ ساتھ دیگر ثقافتی عناصر کا خاص اظہار کیا جاتا تھا۔ " سوہنا شہر لاہور" کے مصنف اپنی یادداشتوں میں ہندوؤں کے ان تہواروں پر بکھرنے والے ثقافتی رنگوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور کے اندر اور باہر ویسے تو بارہ مہینے میلے لگے رہتے مگر خاص خاص تہواروں پر اور موقعوں پر بڑے بڑے میلے لگتے۔۔۔ ہندوؤں کے تہواروں پر ہندوؤں کے علاقے دلہن کی طرح سج جاتے، تھیٹر کی طرز کی جھاکیاں نکلتی تھیں گڈوں ریڑھوں پر یا ویسے ہی لکڑی کے تختوں پر پہیے لگا کر اوپر بڑے بڑے اسٹیج سجائے جاتے، اوپر مندر اور متبرک مقامات کے نقشے کاغذی عمارتیں اور ماڈل بنائے جاتے ۔ ناچ گانا، کھیل تماشا اور تہوار کی مناسبت سے پوری کہانی جھلکیوں میں پیش کی جاتی ۔ رام، لچھمن، سیتا، کرشن سب کے کردار پیش کیے جاتے ۔ بھرت ملاپ کا سین بہت خوب صورت انداز میں پیش کیا جاتا۔ یہ جنم اشمٹی، بھرت ملاپ وغیرہ کے ڈرامے ہوتے ۔ بڑا اژدھام ہوتا بڑی رونق ہوتی، چراغان ہوتا۔ ہندوؤں کے علاقے روشنیوں سے جگ مگ جگ مگ کرتے، مٹھائیاں تقسیم ہوتیں۔(۵۸)

ہندوؤں کے مختلف تہواروں میں یوں سجاوٹ، مٹھائی کی تقسیم ، کھیل تماشا، ناچ گانا اور کاغذی عمارتیں وغیرہ وہ ثقافتی عناصر ہیں جو ہندو ثقافت کا اہم جزو ہیں۔ لاہور میں منائے جانے والے یہ تہوار

لاہور کی ثقافت کو بھی ان رنگوں میں رنگ دیتے تھے۔ ان تہواروں کے مواقع پر ہندوؤں کے علاقوں میں ایک نئی دنیا بسی دکھائی دیتی تھی۔ ہر طرف خوشیاں بکھیرتے چہرے اور جگ مگ جگ مگ کرتے ثقافتی عناصر ہندوؤں مذہب کے ماننے والوں کے ساتھ ساتھ لاہور کے دیگر مذاہب کے افراد کے لیے بھی خوشی کا سامان لیے ہوتے تھے۔ اس کی وجہ وہی ثقافتی رنگ ہیں جو ان تہواروں میں دیکھنے کو ملتے تھے۔ یہ ثقافتی رنگ لاہور کی ثقافت کو بھی اجاگر کرتے تھے جس کی وجہ سے لاہور میں بسنے والے ہر شخص کے لیے یہ تہوار مسرت کا باعث بنتے تھے۔ ان تہواروں کی ثقافتی اہمیت مسلمہ ہے۔ ہندو ثقافت کے ساتھ ساتھ یہ لاہور کی ثقافت کی ترویج کا باعث بھی بنتے تھے۔

دیوالی کا تہوار ہندو مذہب کا ایسا تہوار ہے جسے انتہائی شان وشوکت سے منایا جاتا ہے۔ اس تہوار پر ثقافتی رنگ خوب بکھرتے ہیں۔ ہندوؤں کے علاقوں میں اس تہوار پر ایک ایسا سماں دیکھنے کو ملتا تھا جو مسرت وشادمانی کے ساتھ ساتھ عیش وعشرت کا بھی ساماں ہوتا تھا۔ لاہور کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں میں اس تہوار کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ یہ تہوار جہاں ایک طرف ہندو مذہب کے عقائد اور ثقافت کی ترویج کا باعث تھا تو دوسری طرف ایک ایسے مشترکہ سماجی اور ثقافتی منظر نامہ کا بھی محرک تھا جس میں ہندو مسلم دونوں ایک دوسرے کی ثقافتی اور مذہبی اقدار کا تحفظ کرنے والے تھے۔ اس ثقافتی تہوار سے برداشت اور تحمل کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے نظریات وعقائد کی قدر کرنے کا جو جذبہ پروان چڑھتا تھا، اس کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

> دیوالی پر سارا شہر جگ مگ کرتا ہر طرف چراغاں، ہر طرف روشنی، یہ میلے کئی کئی دن رہتے، دکانیں کئی کئی دن لگی رہتی، دیوالی پر جواء بہت ہوتا تھا۔ اس رات جشن منانا، رنگ رلیاں منانا، عیش وعشرت، جواء شراب ہندوؤں میں پن سمجھ کر سب کچھ ہوتا۔ ہولی پر رنگ کی پچکاریاں ایک دوسرے پر ماری جاتیں، ہندو اکثر مسلمان دوستوں پر

بھی رنگ ڈال دیتے، لڑائی جھگڑا نہیں ہوتا تھا، ایسے موقعوں پر ایک دوسرے کو برداشت کیا جاتا تھا۔(۵۹)

یہاں جو تفصیلات بیان کی گئی ہیں وہ اس تہوار کی ثقافتی اہمیت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ مشترکہ سماجی و ثقافتی منظر نامہ کی تشکیل کے محرکات کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ ایک دوسرے کو برداشت کرنے کا جذبہ ان تہواروں کے موقع پر دیکھنے کو ملتا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان تہواروں پر ہونے والے ثقافتی مظاہر بھی اہم قرار پاتے ہیں۔

ہندوؤں کے ساتھ لاہور میں سکھ قوم بھی آباد تھی۔ اب بھی اس قوم کے افراد یہاں موجود ہیں لیکن قیام پاکستان سے قبل کے لاہور میں سکھ قوم کی کثیر تعداد اس شہر کے باسیوں میں شامل تھی۔ سکھ قوم کے بھی اپنے ثقافتی تہوار ہوتے ہیں جو خاص مواقع پر منائے جاتے ہیں۔ یہ تہوار بھی ثقافتی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ خاص طور پر سکھ قوم جن کا مسکن بھی پنجاب ہے ، ان کے تہواروں میں لاہور کی ثقافت جھلکتی دکھائی دیتی ہے۔ بیساکھی کا تہوار سکھوں کا مشہور تہوار ہے۔ اس تہوار نے اس قدر شہرت حاصل کی کہ پنجاب کے کم وبیش ہر چھوٹے بڑے گاؤں میں بھی بیساکھی کے میلے منائے جاتے تھے۔ پچھلے چند سالوں سے پنجاب میں سرکاری سطح پر جو ثقافتی دن منایا جارہا ہے وہ بھی یہی بیساکھی کے تہوار کی مناسبت سے یکم بیساکھ کو منایا جاتا ہے۔ شاہد حمید اپنی آپ بیتی میں لاہور کے باسیوں کے ثقافتی دن کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> یکم بیساکھ ، بیساکھی کا دن ہوتا ہے۔ یہ دن ہمیشہ ۱۳ اپریل کو آتا تھا اور اب بھی ۱۳ اپریل کو ہی آتا ہے۔ اگرچہ پنجاب کے اکثر دیہاتی علاقوں میں اسے موسمی تہوار کے طور پر بڑے جوش وخروش سے منایا جاتا تھا۔ اور بھنگڑے ڈالے جاتے تھے کیونکہ اس وقت تک گندم کی فصل پک کر تیار ہو چکی ہوتی اور کٹائی کی منتظر ہوتی تھی ، تاہم سکھوں کے

نزدیک اس کی مذہبی اہمیت بھی تھی کیونکہ یہی وہ دن تھا جب سکھوں

نے بحیثیت قوم خالصہ جنم لیا تھا۔(۶۰)

شاہد حمید بیساکھی کے تہوار کی عکاسی کرتے ہوئے اس کی تاریخی اور مذہبی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہ تہوار سکھوں سے زیادہ پنجابی لوگوں کا تہوار ہے اور لاہور پنجابی ثقافت کا گڑھ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تہوار پر ہونے والی سرگرمیاں لاہور کی ثقافت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ تہوار دراصل پنجاب میں گندم کی فصل کے پک کر تیار ہونے کی خوشی میں منایا جاتا ہے اور اس تہوار کے بعد گندم کی فصل کا باقاعدہ آغاز ہوتا ہے۔ گندم کی کٹائی کے دوران بھی ثقافتی رنگ پورے پنجاب میں بکھرتے چلے جاتے ہیں۔ موجودہ عہد میں مختلف مشینوں نے احساس مروت کو کچلتے ہوئے انسان سے اس کے ان تہواروں کی رونق بھی چھین لی ہے تاہم چند دہائیاں قبل یہ ثقافتی میلے کسان کی سال بھر کی تھکن اور اکتاہٹ کو دور کرنے کے لیے کافی ہوتے تھے۔ سکھوں کے حوالے سے دیکھا جائے تو سکھوں کے ہاں یہ تہوار ان کی خالصہ قوم کے آغاز کا دن ہونے کی وجہ سے مذہبی اہمیت کا حامل بھی قرار پاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف پنجاب کے باسی اس تہوار کو موسمی تہوار کے طور پر منا رہے ہوتے ہیں تو دوسری طرف سکھ اسے ایک مذہبی تہوار کا درجہ دیتے ہوئے مناتے ہیں۔ یوں یہ ایک ایسا تہوار بن کر ابھرتا ہے جو پنجاب اور بالخصوص لاہور کے مشترکہ ثقافتی ورثے کو سامنے لاتا ہے۔ اس تہوار پر ہونے والی مختلف ثقافتی سرگرمیاں لاہور کی ثقافت کے مختلف رنگ بھی سامنے لاتی ہیں۔

سیاسی سماجی آپ بیتیوں میں زیادہ تر ان ثقافتی رنگوں کو نمایاں کیا گیا ہے جو اجتماعی رنگ ہیں۔ یہ اجتماعی رنگ مختلف تہواروں اور تقریبات کی صورت میں سامنے آتے ہیں۔ مذہبی اور موسمی تہواروں کے ساتھ ساتھ شادی بیاہ کی رسومات کے ثقافتی رنگ بھی ان آپ بیتیوں میں دکھائے گئے ہیں۔ ایک جھلک ملاحظہ ہو:

شادی کی ساری رسوم طے کرنے کے بعد رخصتی کا وقت آتا، روتی

دھوتی دلہن کو ڈولی میں بٹھا دیا جاتا۔ مردوں کے ساتھ رشتہ دار خواتین

بھی الوداع کہنے کے لیے گھر سے باہر نکل آتیں۔ وہ روتی بھی جاتیں اور رخصتی کے گیت بھی گاتی جاتی تھیں۔ برات کا سربراہ دلہن کی ڈولی پر چھوٹی مالیت کے سکے نچھاور کرتا۔(۶۱)

جدید عہد کے لاہور میں یہ ثقافتی رنگ بھی پھیکے پڑتے چلے جارہے ہیں۔ اگرچہ اب بھی شادی بیاہ کی رسومات پر خاص اہتمام کیا جاتا ہے لیکن ڈولی اور اس سے متعلقہ بہت سی ثقافتی علامت آہستہ آہستہ معدوم ہو رہی ہیں ۔یہ بھی ایک ثقافتی تغیر ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ ہر ثقافت میں پیدا ہوتا جاتا ہے۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اس ثقافتی تغیر کی عکاسی ملتی ہے۔

اردو میں لکھی جانے والی ادیبوں کی آپ بیتیوں میں جس طرح لاہور کے مال روڈ کو ایک ثقافتی عنصر قرار دیتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس علاقے نے لاہور کی ثقافت میں اہم کردار ادا کیا ہے، اسی طرح مختلف سیاسی وسماجی آپ بیتیوں میں بھی لاہور کے مال روڈ کا تذکرہ ایک ثقافتی عنصر کے طور پر ہی ملتا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل کا وہ دور جب لاہور کی آبادی زیادہ گنجان نہیں تھی ،اس دور میں مال روڈ نہ صرف ایک پر فضا مقام ہوتا تھا بلکہ یہاں مختلف ثقافتی رنگ بھی بکھرتے رہتے تھے۔ "گئے دن کی مسافت" کے مصنف قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کے کے مال روڈ کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس کی ثقافتی اہمیت کو یوں سامنے لاتے ہیں:

اس وقت کی مال روڈ آج کی مال روڈ سے بالکل مختلف تھی۔ اپنے گھنے اور تناور درختوں کی وجہ سے یہ ٹھنڈی سڑک کہلاتی تھی۔ اس پر "میٹرو"،" لورینگز "،"سٹیفلز"،"اور " سٹینڈرڈ" کے نام کے نہایت اعلیٰ ریستوران ہوتے تھے۔ ان میں بعض میں ایک اینگلو انڈین لڑکی اینجلا، ایوب کے زمانے تک ڈانس کرتی رہی اور ہم سب اسے دیکھنے جاتے تھے۔ اس کے فٹ پاتھ بہت چوڑے تھے۔۔۔۔۔۔ گرمیوں کے موسم میں خاص طور پر یہ گمان گزرتا تھا جیسے لاہور کا سارا حسن ان

فٹ پاتھوں پر امنڈ آیا ہو۔ مردوں نے تو خیر گھومنا پھرنا ہی ہوتا ہے، عورتیں بھی کم نہیں تھیں۔انتہائی خوب صورت اوردیدہ زیب ملبوسات میں حسین سے حسین نوخیز دوشیزاؤں اورخواتین کی ٹولیوں کی ٹولیاں ہر طرف مٹر گشت کرتی نظر آتی تھیں۔اس زمانے کے لاہور کو سارے ہندوستان میں فیشن کا گڑھ تصور کیا جاتا تھا۔ تقریباً ہر نئے فیشن کا آغاز یہیں سے ہوتا تھا۔(۶۲)

مال روڈ کی یہ سرگرمیاں لاہور کی ثقافت کی عکاسی کرتی ہیں ۔ یہی وہ مرکز تھا جو لاہور کی ثقافت کا دل سمجھا جاتا تھااور یہیں سے شروع ہونے والا کوئی بھی فیشن پہلے پورے لاہور پھر پورے ہندوستان میں پھیل جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں موجود مختلف ہوٹلوں اورریستورانوں میں بھی ثقافتی سرگرمیاں جاری رہتی تھیں۔ موجودہ عہد میں اگرچہ مال روڈ کی وہ پہلے سی حالت باقی نہیں رہی اور مادیت پرستی اور مفاد پرستی نے بہت کچھ نگل لیا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مال روڈ لاہور کا اہم ثقافتی مرکز رہا ہے ۔اس کا تذکرہ منیر احمد منیر کے اس انٹرویو میں بھی ملتا ہے جو انھوں نے ایف ای چودھری کا کیا تھا۔ ایف ای چودھری بھی مال روڈ اور تانگہ کو لاہور کی ثقافت کا اہم مرکز سمجھتے ہیں ۔ انھیں بھی اس امر کا شدید قلق ہے کہ جدید عہد میں مال روڈ کا وہ ثقافتی حسن اور تانگہ دونوں ہی غائب ہوگئے ہیں۔ وہ مال روڈ کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں:

مال روڈ ٹھنڈی سڑک کہلاتی تھی ،کیونکہ دونوں جانب بڑے بڑے درخت ہوتے تھے ۔چوڑائی اس کی کم ہوتی تھی کیوں کہ تانگے چلتے تھے۔ کاریں لوگوں کے پاس بہت کم ہی ہوتی تھیں۔ سڑک کو نائس طریقے سے صاف کرتے تھے ۔موٹر آگے ہوتی تھی ۔ پیچھے ایک لمبی سی راڈ ہوتی تھی ، اس میں جھاڑو لگے ہوتے تھے ۔۔۔ اس کے بعد ایک گاڑی آتی تھی وہ چھڑکاؤ کرتی جاتی تھی ۔(۶۳)

لاہور کی ثقافت کے حوالے سے سیاسی و سماجی آپ بیتیوں کا جائزہ لینے سے اس حقیقت سے بھی آشنائی ہوتی ہے کہ اگرچہ ان آپ بیتیوں میں زیادہ زور لاہور کی سیاسی تاریخ کو بیان کرنے پر دیا گیا ہے تاہم لاہور میں فلم سازی، فن کاروں اور گلوکاروں جیسے ثقافتی عناصر بھی ان آپ بیتیوں میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔ بعض آپ بیتی نگاروں نے لاہور کو ایک ایسے مرکز کے طور پر سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو اس طرح کے ثقافتی مظاہر کے لیے بنیاد گزار کا کام کرتا تھا۔ جن فن کاروں کو لاہور نے متعارف کرایا آگے چل انھوں نے فلم اور موسیقی کی دنیا پر راج کیا۔ اس ضمن میں خلیق ابراہیم خلیق اپنی آپ بیتی "منزلیں گرد کے مانند" میں لاہور سے پروان چڑھنے والی موسیقاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ماسٹر غلام حیدر نے اگلے دو چار سال میں غیر معمولی ترقی کی اور برصغیر کی فلمی دنیا میں ان کا شمار چوٹی کے میوزک ڈائریکٹروں میں ہونے لگا۔ وہ کلاسیکی اور لوک موسیقی کے امتزاج سے نئی نئی راہیں نکالنے پر تو قادر تھے ہی، مختلف گلوکاراؤں کی آوازوں کے رنگ و آہنگ اور اثر پذیری کو پرکھنے کے معاملے میں بھی جوہر شناس واقع ہوئے تھے۔ فلمی موسیقی کی تین عظیم گلوکاراؤں شمشاد بیگم، نور جہاں اور لتا منگیشکر کو سب سے پہلے انھوں نے ہی اپنی فلموں میں گایا۔ شمشاد بیگم کو پنچولی سٹوڈیو کی "خزانچی" میں، نور جہاں کو اسی اسٹوڈیو کی "خاندان" میں اور لتا منگیشکر کو فلمستان اسٹوڈیو بمبئی کی فلم "مجبور" میں۔ ماسٹر غلام حیدر رجحان ساز میوزک ڈائریکٹر تھے۔ انھوں نے پنچولی اسٹوڈیو لاہور کی فلموں "خزانچی" اور "خاندان" میں جو موسیقی ترتیب دی تھی اس نے پورے برصغیر کی فلمی موسیقی کو ایک خوش گوار انقلاب سے دوچار کر دیا۔(٦٤)

لاہور کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں میں لاہور کی ثقافت کے متنوع رنگ سامنے آتے ہیں۔ لاہور میں چوں کہ مختلف اقوام اور مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ اگرچہ ایک مشترکہ سماج میں رہتے تھے اور بہت سی اقدار مشترک تھیں تاہم مذہبی حوالے سے یہ سب اپنی انفرادیت قائم رکھے ہوئے تھے۔ اگر عرق ریزی سے مشاہدہ کیا جائے تو مذہبی حوالے سے پائی جانے والی یہ انفرادیت بھی لاہور کی ثقافت میں تنوع کا باعث بنتی رہی ہے۔ سوہنا شہر لاہور کے مصنف طاہر لاہوری نے اپنی یادداشتوں میں اس لاہور کی ثقافت کے ایسے نقشے کھینچے ہیں جو اسی مذہبی انفرادیت سے نمو پاتی دکھائی دیتی ہے۔ قدیم لاہور کی ثقافت کو بیان کرتے ہوئے وہ مختلف مذاہب کے لوگوں کا صبح اٹھ کر اپنی عبادت گاہوں کا رخ کرنے کا منظر نامہ اس دلفریب انداز میں بیان کرتے ہیں کہ یہ سماں لاہور ہی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ جاتا ہے۔ عبادت گاہوں کی طرف جانے کا عمل اور مذہبی عبادات ادا کرنا مذہبی انفرادیت کے ساتھ ساتھ ایسا مشترکہ ثقافتی ورثہ بھی بن جاتا ہے جو متنوع رنگوں کا گلدستہ معلوم ہوتا ہے۔ طاہر لاہوری اس مشترکہ ثقافتی منظر نامے کی عکاسی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صبح سے پہلے لاہور میں ایک عجیب سماں ہوتا، ایک رومانی کیفیت ہوتی، ویسے تو لوگ رات بھر پھرتے پھراتے رہتے مگر جو جلدی سونے کے عادی تھے وہ رات دو تین بجے جاگ اٹھتے۔ گلیوں بازاروں، کوچوں اور باغوں میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ جاتا۔ مسلمان خدا کا نام لیتے ہوئے مسجدوں کو جا رہے ہوتے۔ ہندو رام رام کرتے ہوئے دریا کی جانب رواں دواں ہوتے، ہندو مرد عورتیں سب منہ اندھیرے دریا پر جاتے، اشنان کر کے پاپ جھاڑتے۔ اذان شروع ہو جاتی، مندروں میں گھنٹیاں اور سنکھ بجنا شروع ہو جاتے۔(۶۵)

لاہور کی ثقافت میں عرس اور میلوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اردو آپ بیتی نگاروں نے لاہور کے مختلف کا تذکرہ بڑے جاندار انداز میں کیاہے ۔ ان میلوں ٹھیلوں میں ثقافتی رنگ بھی دکھائی دیتے ہیں بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ ہو گا کہ لاہور میں لگنے والے میلے لاہور کی ثقافت کا سب سے بڑا مظہر ہوتے ہیں ۔ ان میلوں پر جن ثقافتی امور کا اظہار ہوتا تھا، اس کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ میلے مسلمان قوم اپنے ان بزرگوں اور اولیااللہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے منعقد کرتی ہے تاہم اس خطے میں بسنے والے ہندو بھی ان میلوں میں کئی حوالوں سے شرکت کرتے اور ثقافتی فضا کی تشکیل میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں ۔ طاہر لاہوری ان مشترکہ تہذیبی اور ثقافتی مظاہر کی عکاسی بڑے منفرد انداز میں کرتے ہیں ۔ وہ اس سماج کی تہہ میں اتر کر ثقافتی موتی تلاش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> حضرت داتا گنج بخشؒ کے آستانے پر ہمیشہ سے لنگر جاری ہے ۔ سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگ اس لنگر سے پیٹ بھرتے ہیں ۔ اس طرح کے لنگر ہندوؤں نے بھی کھول رکھے ہیں ۔ سکھ عطر فروشوں کی مشہور دکان تھی " بھائیوں کی دکان " ان کی دکان پہلے شہر کے اندر ڈبی بازار میں تھی پھر روشنائی اور نوگزے پیر کے مزار کے پاس ان کی دکان آ گئی ۔ یہاں ایک بڑی بلڈنگ میں ان کا کاروبار تھا ۔ ان کے ہاں بھی لنگر ہوتا تھا ۔ ویسے تو لاہور میں ہر روز کوئی نہ کوئی میلہ ہوتا ہے یا کسی بزرگ کا عرس ہوتاہے اس طرح شہر میں ہر قوم کے لنگر بارہ ماہ جاری رہتے ہیں ۔ آخری چہار شنبہ کو جگہ جگہ نیاز پکتی، خاص طور سے موچی اور شاہ عالمی کے درمیان ایک سودیگیں بریانی کی پکتیں تھیں ۔ خلقِ خدا صبح وشام تک کھاتی یہ لنگر ختم نہیں ہوتا تھا ۔(٦٦)

ان میلوں اور لنگروں نے لاہور کی ثقافت میں مختلف اقوام کے درمیان ثقافتی ہم آہنگی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ بلا تفریقِ مذہب جاری کیے جانے والے یہ لنگر ایک دوسرے کو تہذیبی اور ثقافتی حوالے سے قریب لانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

سیاسی وسماجی آپ بیتیوں میں لاہور کی ثقافت کی پیش کش کرتے ہوئے آپ بیتی نگاروں نے لاہور کے ان مختلف اداروں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو ثقافتی اور تہذیبی سرگرمیوں میں پیش پیش ہوتے تھے۔ ایسی ثقافتی سرگرمیوں میں لاہور کا دیال سنگھ اور دیگر کئی کالجوں میں ایسی ثقافتی سرگرمیاں ہوتی تھیں جو مختلف مذاہب اور اقوام کا مشترکہ ثقافتی ورثہ قرار پاتی تھیں۔ سید مینو چہر گورنمنٹ کالج اور دیال سنگھ کالج کی ثقافتی سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی "میرے شب وروز" میں لکھتے ہیں:

> عابد صاحب کی پرنسپلی کے دوران میں ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کے لحاظ سے کالج تمام درسگاہوں سے ممتاز تھا۔ تقریری مقابلے، ڈرامے اور مشاعرے یہ سب معمول کا حصہ تھے۔ ایک نہایت اچھا ڈراما جو عابد صاحب کا لکھا ہوا ہے 'روپ متی اور باز بہادر' دیال سنگھ کالج میں سٹیج ہوا اور شہر کے ثقافتی حلقوں میں بہت مقبول ہوا۔ ان دنوں ہندوستان اور پاکستان کے درمیان آنے جانے پر اتنی پابندی نہ تھی۔ ہندوستانی فلمیں بھی معمول کے مطابق پاکستان میں دکھائی جاتی تھیں یہ سلسلہ ۱۹۶۵ء کی جنگ تک چلتا رہا جس کے بعد تعلقات میں کافی کشیدگی آگئی۔(۶۷)

لاہور کی ثقافتی اقدار میں سب سے زیادہ تغیر اس وقت دیکھنے میں آیا جب قدیم لاہور کے باسیوں نے تنگ جگہوں کی بجائے لاہور شہر سے باہر بننے والی خوب صورت کالونیوں کو اپنا مسکن بنانا شروع کیا۔ نسل در نسل ایک جگہ پر بستے آتے کئی گھرانے بھی اس ترکِ سکونت کے عمل میں شریک

ہوئے اور یوں لاہور کے قدیمی شہر سے باہر بھی لاہور بسنا شروع ہو گیا۔ یہ نئی نسل جب اسلاف کے مکانوں سے قطع تعلق ہوئی تو بہت سی ثقافتی اقدار سے بھی بے بہرہ ہوتی چلی گئی۔ تاہم کچھ گھرانے ایسے بھی ہیں جو آج بھی ان نئی آبادیوں میں منتقل ہونے کے باوجود اسلاف کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ایسے گھرانوں اور ان کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کی پیش کش بھی ملتی ہے۔اس ضمن میں ایک بیان ملاحظہ ہو:

> تہذیب نو کا اثر ضرور اندرون شہر پڑا ہے اور نئی نسل کے بعض لوگ اپنی پرانی حویلیوں اور اندھیرے مکانوں سے نکل کر بیرون شہر فیشن ایبل کالونیوں میں آباد ہو رہے ہیں ۔یہ لوگ اپنے قدیمی مکانوں کو ضرور چھوڑ رہے ہیں لیکن یہ لوگ اپنی تہذیبی اور ثقافتی روایات کی کچھ نشانیاں اپنے ساتھ ضرور لے جاتے ہیں۔ چنانچہ آج بھی ڈیفنس کی پوش کالونی میں جسٹس خواجہ محمد شریف سال کے سال رش مالو پیر کی زردے کی دیگ، کھٹی مولیاں اور مونگی کی دال ضرور پکاتے ہیں اوراپنے تمام دوستوں کو بلا کر بڑی پاکیزہ تقریب کا اہتمام کرتے ہیں۔ گلبرگ ،جوہر ٹاؤن اورڈیفنس میں جدید ریسٹورنٹ کی شکل میں قلچے ، روغنی ، ہریسہ اور سری پائے مل جاتے ہیں۔(۶۸)

دورِ حاضر کے لاہور کا منظر دیکھ کر پرانے لاہور کے باسیوں کے دل میں ایک اداس سا خلا جنم لیتا ہے۔ وہ گلیاں جہاں کبھی پتنگ بازی کی رونقیں تھیں، جہاں مشاعروں اور محفلِ سماع کی محفلیں آباد رہتی تھیں، اور جہاں میلوں ٹھیلوں کی گہما گہمی دلوں کو جوڑتی تھی، آج وہاں بلند و بالا عمارتوں، تجارتی بورڈز اور شور زدہ ٹریفک نے ڈیرہ ڈال لیا ہے۔ ان کے لیے یہ محض عمارتوں کا بدل جانا نہیں بلکہ ایک تہذیبی روح کا رخصت ہونا ہے۔ وہ اپنے ماضی کو یاد کر کے سوچتے ہیں کہ لاہور کبھی دلوں کو جوڑنے والی

محبت کی بستی تھا، اور آج ایک تیز رفتار بازار میں ڈھل چکا ہے۔ اسی ثقافتی تبدیلی کا اظہار کرتے ہوئے مستنصر حسین تارڑ لکھتے ہیں:

> لاہور جو بنیادی طور پر ایک جین شہر ہوا کرتا تھا، بعد میں ہندو، سکھ اور مسلم ہوا تو اس عہد کی سب سے بڑی پہچان 'جین مندر" زمین بوس کر دیا گیا تھا۔۔۔اورنگ ٹرین نے ان آثار کو بھی ملیامیٹ کر دیا اور اب وہاں ایک میدان تھا، اینٹوں کے ملبے سے اٹا ہوا ایک ویرانہ تھا۔ اورنج ٹرین کے ہاتھی کے سامنے جو کچھ بھی آیا اس نے روند دیا۔ چوبرجی، لکشمی چوک، متعدد تاریخی گرجا گھر۔۔ یہاں تک کہ شالیمار باغ۔۔(۶۹)

یہی وجہ ہے کہ پرانے باسیوں کے دل میں ایک مستقل حسرت اور مضمحل کیفیت چھائی رہتی ہے، جیسے ان کی یادوں کا لاہور کہیں وقت کی گرد میں گم ہو گیا ہو۔ اس بارے میں واصف ناگی لکھتے ہیں:

> لاہور کیا خوبصورت شہر تھا۔ اس کی ہر گلی اور محلہ روایات کا امین تھا۔ شہر کی کچھ چیزیں کچھ لوگوں کے ساتھ جڑی ہوئی تھیں۔ لوگ ان روایات کے پاسدار تھے پرانے لوگ چلے گئے۔ نئے لوگ آ گئے جو شہر کی قدیم روایت، ریت، ثقافت سے آشنا نہیں تھے۔ لاہور کی زمین کو باہر سے آنے والے لوگوں نے بنجر کر دیا، اب یہ ہر روایت رواج سے عاری شہر ہے جہاں ہر فرد پیسہ کمانے کی فکر میں ہے۔(۷۰)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی ثقافت کو بڑے جاندار انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ان تخلیق کاروں نے لاہور کے مختلف ثقافتی رنگوں کا خود مشاہدہ کیا جس کی وجہ سے یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں اصلیت کے جوہر سے معمور دکھائی دیتی ہیں۔ لاہور میں بسنے والے اپنی تہذیب و ثقافت سے کس درجہ مخلص ہیں اور اپنی ثقافتی اقدار کو کس قدر عزیز سمجھتے ہیں،

اس کی عکاسی ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں سے ہوتی ہے۔ لاہور کی ثقافت کے مختلف رنگ ان آپ بیتیوں میں بکھرے دکھائی دیتے ہیں۔

لاہور کی ثقافت کے تناظر میں اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے اس حقیقت سے بھی آشنائی ہوتی ہے کہ آپ بیتی اور یادداشت نگاروں کے ہاں تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے حوالے سے جدید لاہور کی نسبت قدیم لاہور زیادہ اہم قرار پاتا ہے۔ قدیم لاہور کی ثقافتی اور تہذیبی اقدار میں جو اپنائیت اور حسن پایا جاتا تھا وہ جدید لاہور کی تہذیب وثقافت سے معدوم ہو چکا ہے۔ یہ معدومی کے نوحے بھی اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں سنائی دیتے ہیں۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ بیتی نگاروں نے لاہور کی ثقافت کے ان رنگوں کو نمایاں کیا ہے جن کا انھوں نے خود مشاہدہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ آپ بیتیاں جو ادبی تخلیق کاروں کے قلم کا شاہکار ہیں ان میں زیادہ تر ان ثقافتی عناصر کا تذکرہ ہے جو کسی نہ کسی طرح ادب، ادیبوں یا ادبی بیٹھکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ جب کہ وہ آپ بیتیاں جو سیاسی وسماجی تخلیق کاروں نے تحریر کی ہیں ان میں زیادہ تر ان ثقافتی اجتماعات کا تذکرہ ملتا ہے جن میں ان سیاسی افراد کی شمولیت لازم ہوتی ہے۔ ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ثقافت کے وہ اصلی رنگ نمایاں ہوتے ہیں جن کا مشاہدہ ان آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے خود کیا تھا۔ ان آپ بیتیوں کا ایک اور اہم خوب صورت زاویہ غیر جانبدارانہ اندازِ تحریر ہے۔ آپ بیتی نگاروں نے اس امر کا خاص خیال رکھا ہے کہ لاہور کی ثقافتی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس امر کو مد نظر رکھا جائے کہ یہ ثقافتی منظر صرف مسلمان قوم کی ثقافتی اقدار سے ہی تشکیل نہیں پایا بلکہ یہاں ہندوؤں اور سکھوں کے ساتھ ساتھ عیسائیوں کی بھی کثیر تعداد آباد تھی اور اب بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ یہ غیر مسلم اقوام بھی اپنا خاص تہذیبی اور ثقافتی تشخص رکھتی ہیں۔

آپ بیتی نگاروں نے اپنے ماضی تجربات اور مشاہدات کو بیان کرتے ہوئے جہاں بھی ثقافت کی پیش کش کی ہے وہاں مسلم ثقافت کے ساتھ ساتھ غیر مسلم اقوام کے ثقافتی رنگوں کو بھی نمایاں

کیاہے۔ اس سے آپ بیتی نگاروں کی غیر جانبداری کا ثبوت ملتاہے۔آپ بیتی نگاروں نے غیر مسلم اقوام کی تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پیش کرتے ہوئے یہ خیال رکھاہے کہ انھیں بھی مسلمان ثقافت میں زندگی گزارنے والوں جتنی ہی اہمیت دی جائے۔ اس کا ایک بڑا وصف یہ بھی سامنے آیا کہ غیر جانبدارانہ انداز اختیار کرنے کی وجہ سے لاہور کی ثقافت کے متنوع رنگ ان آپ بیتیوں میں جھلکنے لگے،یوں یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں لاہور کی ثقافت کی اہم دستاویز بنتی چلی گئیں۔

ان آپ بیتیوں میں لاہور کی ثقافت کو جس طرح پیش کیاگیاہے اس سے ظاہر ہوتاہے کہ آپ بیتی نگاروں نے لاہور کو اپنے دل ودماغ میں بسانے کے بعد یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں تحریر کی ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں کہیں کہیں یادِماضی کا عنصر بھی جھلکتا دکھائی دیتاہے جو عصرِ حاضر کے لاہور میں ثقافتی اعتبار سے ہونے والی تبدیلیوں سے مصنفین کا مطابقت نہ کرنا ظاہر کرتاہے۔یہ مطابقت اس وجہ سے بھی قائم نہیں ہوسکی کہ آپ بیتی نگاروں کی اکثریت نے اس لاہور کی ثقافت اور سماج کو خود پر بیتاہے جو ثقافتی اعتبار سے پورے ہندوستان کامرکز مانا جاتا تھا۔ جدید عہد کالاہور ان ثقافتی اقدار سے کوسوں دور نکل گیاہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ثقافتی بدلاؤ محض فطری ارتقا کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کے پس منظر میں سیاسی وسماجی عوامل کارفرما ہیں۔کل کی محفل آرائی، میلوں ٹھیلوں، مال روڈ کی رقص و نغمگی اور تہذیبی ہم آہنگی نے رفتہ رفتہ جدید شہریت، صنعتی ترقی، میڈیا کے غلبے، حکومتی پالیسیوں اور دورِ جدید کے تقاضوں کے تحت اپنی صورتیں بدل لیں۔ ان عوامل کے زیر اثر روایتی اقدار ایک نئے سانچے میں ڈھل گئیں۔ آپ بیتیوں میں بیان کردہ یہ تبدیلیاں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ جہاں کل کے لاہور میں روایتی تہوار اور محفلیں ثقافتی روح کی علامت تھیں، وہیں آج کے لاہور میں تیز رفتار شہری زندگی اور جدت پسندی نے نئے سماجی رویے اور اقدار کو جنم دیا ہے۔ تاجر مافیا نے معاشرتی اقدار کو منافع پر مبنی رویوں میں ڈھالا، بدلتی ہوئی اقدار نے روایتی سماجی ڈھانچے کو کمزور کیا اور غیر ملکی ثقافتی یلغار نے مقامی ثقافتی عناصر کو پس منظر میں دھکیل دیا۔ ان عوامل

نے مل کر اس شہر کی ثقافتی روح کو نہ صرف تبدیل کیا بلکہ اس کے اظہار کے طریقوں کو بھی از سرنو متعین کر دیا۔ اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں ان تبدیلیوں کی جیتی جاگتی تصویر ہیں، جو ماضی کی رونق اور آج کے بدلتے مزاج کا تقابلی مطالعہ فراہم کرتی ہیں اور مستنصر حسین تارڑ کی یہ بات اس کی گواہی پیش کرتی ہے:

> اگر موت ہے اور لاہور، لاہور ہے تو وہ لاہور تو کب کا مر چکا اور اگر اُس میں کچھ آخری سانس تھے تو تاجر مافیا نے ان کا گلا گھونٹ دیا ۔۔۔۔ میرا شہر آرزو ایک خواب ہوا، ایک سراب ہوا، تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہوا۔ اس کے سارے چراغ، سارے دیئے، سب دیپ بجھ گئے (۱۷)

حوالہ جات

۱۔ نسیمہ رحمان، اردو نثر کے ارتقامیں لاہور کی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۳

۲۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، لاہور، سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص ۲۷

۳۔ خلیق ابراہیم خلیق، منزلیں گرد کے مانند، فضلی سنز، کراچی، اشاعت دوم، اگست ۲۰۱۶ء، ص ۵۲۱

۴۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۱۵

۵۔ مرزا ادیب، مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، پاکستان، ۱۹۸۴ء، ص ۱۳

۶۔ نور احمد چشتی، تحقیقاتِ چشتی، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۲۰۱

۷۔ ایضاً، ص ۴۳۷

۸۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، لاہور، الفیصل پبلشرز، ۲۰۰۸ء، ص ۴۲

۹۔ ایضاً، ص ۴۲

۱۰۔ ریحانہ کوثر، اردو ناول میں لاہور کی تہذیب وثقافت، مشمولہ، ادراک، مانسہرہ، شمارہ ۱۶، ص ۴۲

۱۱۔ شمس الرحمان فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، شہرزاد، کراچی، ۲۰۱۱ء، ص ۱۰۰

۱۲۔ نسیمہ رحمان، اردو نثر کے ارتقامیں لاہور کی خدمات، ص ۲۰

۱۳۔ سوم آنند، باتیں لاہور کی، سیونتھ سکائی پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص ۸۹

۱۴۔ واصف ناگی، وہ لاہور کہیں کھو گیا، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۹۸

۱۵۔ مستری محمد شریف (انٹرویو)، از منیر احمد منیر، اب وہ لاہور کہاں؟، آتش فشاں، ۲۰۲۰ء، ص ۲۵۸

۱۶۔ سوم آنند، باتیں لاہور کی، ص ۱۰

۱۷۔ مرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص ۱۴۹

۱۸۔ منیر احمد منیر، مٹتا ہوا لاہور، ص ۱۸

۱۹۔ مرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص ۱۳۹

۲۰۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۶۰

۲۱۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۶۶

۲۲۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشانِ جگر سوختہ، ص ۱۲۹

۲۳۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص ۷۱

۲۴۔ ایضاً، ص ۱۹۳

۲۵۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، ص ۱۳۱

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۳۲

۲۷۔ واصف ناگی، وہ لاہور کہیں کھو گیا، ص ۱۴۸

۲۸۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سر گزشت، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۸

۲۹۔ ایضاً، ص ۱۱۸

۳۰۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۵۹

۳۱۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۳۲۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص ۶۸

۳۳۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۱۵۹

۳۴۔ ایضاً، ص ۱۶۱

۳۵۔ ایضاً، ص ۱۶۷

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۳۵

۳۷۔ انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۲۹

۳۸۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۱۸۱

۳۹۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۴۰۔ ایضاً، ص ۱۸۴

۴۱۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہو، آوارگی، ص ۱۷۴

۴۲۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص ۱۱۸

۴۳۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص ۱۷۸

۴۴۔ ایضاً، ۱۹۵

۴۵۔ انتظار حسین، جستجو کیا ہے؟، ص ۱۲۸

۴۶۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص ۹۹-۱۰۰

۴۷۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۳۰۵

۴۸۔ ایضاً، ص ۳۶۸

۴۹۔ جاوید اقبال، اپنا گریباں چاک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۱۸

۵۰۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص ۱۷۱

۵۱۔ تارڑ، مستنصر حسین، لاہور آوارگی، ص ۲۰۶

۵۲۔ ایضاً، ص ۱۹۶

۵۳۔ جاوید اقبال، اپنا گریباں چاک، ص ۱۹

۵۴۔ مرزا ادیب، مٹی کا دیا، ص ۱۴۸

۵۵۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص ۲۰۵

۵۶۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص ۱۶۸

۵۷۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۵۸۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۹۶

۵۹۔ ایضاً، ص ۹۷

۶۰۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، القا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶، ص ۷۲-۷۳

۶۱۔ ایضاً، ص ۱۰۳

۶۲۔ ایضاً، ص۲۱۷

۶۳۔ ایف ای چودھری (انٹرویو)، از منیر احمد منیر، مشمولہ، اب وہ لاہور کہاں؟، ص۲۰۱

۶۴۔ خلیق ابراہیم خلیق، منزلیں گرد کے مانند، ص۵۴۹

۶۵۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص۳۱

۶۶۔ ایضاً، ص۳۳

۶۷۔ سید مینوچہر، میرے شب و روز، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۸۰

۶۸۔ اے حمید، لاہور لاہور اے، ص۱۱۷

۶۹۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص۲۲۶

۷۰۔ واصف ناگی، وہ لاہور کہیں کھو گیا، ص۳۶

۷۱۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، ص۲۰۶

باب چہارم

لاہور کی ادبی صورتحال : اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں

الف۔ لاہور بطور ادبی مرکز : اجمالی جائزہ

لاہور برصغیر کے اُن قدیم شہروں میں شمار ہوتا ہے جو تاریخی ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی، تہذیبی اور ادبی اعتبار سے بھی ایک نمایاں مرکز کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس شہر نے اردو، پنجابی اور دیگر زبانوں کے فروغ اور ان کے ادب کی ترویج و اشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ آج بھی لاہور کی ادبی اہمیت مسلمہ ہے اور اسے ایک معتبر ادبی گہوارے کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔

اگر لاہور کی علمی و ادبی تاریخ پر نگاہ ڈالی جائے تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ غزنوی عہد ہی سے اس کی ادبی حیثیت مستحکم ہونا شروع ہوئی۔ اس دور میں برصغیر کے مختلف خطوں میں علم و ادب کی سرپرستی کی جارہی تھی، اور لاہور بھی اس فیض سے محروم نہ رہا۔ یہی وہ زمانہ تھا جب اس شہر میں شعری و ادبی سرگرمیوں کو فروغ ملا اور رفتہ رفتہ لاہور علمی و ادبی لحاظ سے ایک مستحکم اور معتبر مرکز کی صورت اختیار کرتا گیا۔ سعدیہ نور غزنوی عہد کے لاہور کی ادبی حیثیت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> غزنوی عہد لاہور کا شاندار اور یادگار دور کہلاتا ہے، کیونکہ اس دور میں لاہور نے ایک اہم ترین شعری، علمی، ادبی اور لسانی رویوں کے مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ ثقافتی، فنی، تجارتی اور تاریخی لحاظ سے بھی ممتاز شہر کا درجہ حاصل کرلیا تھا۔۔۔اسی عہد میں لاہور کے شعر وادب کی تخلیقات میں جو نت نئے جدید رجحانات ظاہر ہوئے، ان کی بنا پر لوگوں نے تحریری، شعری طور پر لاہور کی عظمت کا اعتراف کیا۔(۱)

غزنوی عہد میں لاہور نے جن مختلف شعبہ ہائے زندگی میں نمایاں ترقی کی منازل طے کیں، ان میں شعر و ادب کو بھی ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اس دور میں نہ صرف شعری و ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا بلکہ ان کے معیار میں بھی قابلِ ذکر بہتری دیکھنے کو ملی۔ لاہور کے موجودہ ادبی مرتبے اور اس کی ثقافتی شناخت کی بنیاد اسی دور کی علمی و ادبی سرگرمیوں پر استوار ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سلطان محمود غزنوی محض ایک کامیاب سپہ سالار ہی نہیں تھا بلکہ علمی و ادبی ذوق شوق بھی رکھتا تھا۔ اس نے علما، فضلا اور ادبا کی سرپرستی کی اور علم و ادب کے فروغ کے لیے عملی اقدامات کیے۔ چوں کہ اس زمانے میں لاہور ایک اہم سیاسی مرکز کے طور پر ابھر رہا تھا، اس لیے سلطان کی خصوصی توجہ اس کے علمی و ادبی فروغ پر بھی مرکوز رہی۔ جب لاہور کو آلِ غزنہ کے دارالسلطنت کا درجہ ملا تو اس شہر کی علمی و ادبی زندگی میں ایک نئی جہت پیدا ہوئی، جس نے آنے والے ادوار کے لیے ایک مستحکم بنیاد فراہم کی۔ ڈاکٹر گوہر نوشاہی لکھتے ہیں:

> جب ایاز بادشاہ کے حکم سے پنجاب کا حاکم بنا تو اس نے اس شہر کی آبادی پر توجہ کی اور فرمان اجازت سلطان سے حاصل کیا اور اس سرگرمی سے شہر بسایا کہ چند سال میں وہ ویرانہ علما و فضلا کا معدن بن گیا اور مخدوم شیخ علی گنج بخش ہجویری جیسے عالم فاضل ولی لوگ غزنی و غور وغیرہ ملکوں سے آکر اسمیں قیام پذیر ہوئے۔(۲)

غزنی عہد میں لاہور میں زبان وادب کے میدان میں خدمات انجام دینے والوں میں ان شعرا کا بڑا حصہ ہے جو اس وقت لاہور میں موجود تھے۔ ان میں فارسی گو شعراء ابوعبداللہ روزنکی، مسعود لازی، ابوالفرج رونی اور مسعود سعد سلمان وہ نمایاں شعرا تھے جو اہلِ لاہور کو اپنی شاعری اور ادبی خدمات سے مستفید کر رہے تھے۔ لاہور کے ادبی مرکز کی تشکیل میں ان فارسی شعرا کی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی شعری اور ادبی خدمات کو دیکھا جائے تو لاہور کے ادبی منظرنامے میں یہ بنیاد گزار کا درجہ رکھتے ہیں۔

لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں غزنی عہد کے بعد کسی قدر تعطل بھی واقع ہوا جس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ غزنی عہد کے بعد آنے والے سلاطین کی اکثریت نے لاہور کے علاوہ دیگر شہروں کا اپنا دارالسلطنت قرار دیا یوں اس شہر کو نظرانداز کیا جانے لگا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تعطل کا یہ عرصہ بھی ختم ہوا اورلاہور ایک بار پھر ادبی حوالے سے ترقی کی منازل طے کرنے لگا۔ ڈاکٹر علی محمد خان غزنی عہد کے بعد کے لاہور کی ادبی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> خاندان غلاماں کے بعد حکومت کی باگ ڈور خاندانِ خلجی کے ہاتھ آ گئی۔ ان کے بعد خاندانِ تغلق، خاندانِ سادات اور پھر خاندانِ لودھی بر سر اقتدار رہالیکن اس عرصہ میں لاہور کی قدر و قیمت اور اہمیت وہ نہ رہی تھی جو ماضی میں اسے حاصل تھی البتہ یہاں مختلف النوع اقوام آپس میں رچ بس گئی تھیں جن کے آپس میں برتاؤ، لین دین اور گفت و شنید سے اردو کا ملغوبہ گاڑھا ہوتا جارہا تھا۔(۳)

لاہور غزنی عہد کے بعد ادبی حوالے سے جس تعطل کا شکار رہوا تھا وہ مغلیہ حکمرانوں بابر اور ہمایوں کے دور میں بھی جاری رہالیکن اکبر کے دور میں لاہور نے سیاسی، سماجی اور ثقافتی ترقی کے ساتھ ساتھ ادبی حوالے سے بھی ترقی کی منازل طے کرنا شروع کیں۔ تاریخی حوالے سے دیکھا جائے تو اکبر کا عہدادبی حوالے سے لاہور کے لیے خاصا زرخیز ثابت ہوا۔ اس عہد میں لاہور میں جو علم وادب کو فروغ ملااس کے بارے میں ڈاکٹر علی محمد خان لکھتے ہیں:

> اکبر کے اس زمانے میں لاہور کو جو رونق اور شہرت نصیب ہوئی اس کی نظیر عہد شاہجہان کے سوا کسی اور عہد میں نہیں مل سکتی۔ اس دوران بے شمار فنی اور علمی کارنامے سرانجام پائے۔(۴)

اکبر علم وادب کا رسیا تھا۔ وہ اگرچہ خود ناخواندہ تھا لیکن علمی اورادبی شخصیات کا بہت بڑا معترف ہونے کے ساتھ ساتھ ان کا قدردان بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب علم وادب کو سرکاری

سرپرستی میسر آئی تو اس نے فروغ پانا شروع کیا۔ اکبر نے اگرچہ آگرہ کو دارالحکومت بنایا تھا لیکن لاہور سے اس کو خاص الفت تھی۔ تقریباً نصف صدی تک حکمرانی کے دور ان میں اس نے لاہور کو بنانے سنوارنے اور علمی وادبی حوالے سے ترقی دینے کے بارے بہت سے اقدامات کیے۔ وہ لاہور میں کئی دن گزارتا تھا جس کی وجہ سے لاہور کو آگرہ ہی طرح دار لحکومت جیسی سہولیات میسر ہورہی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ علم وادب سے اکبر کی وابستگی اوراس کی قدر دانی کی وجہ سے اس کے دربار میں ادبی اور علمی شخصیات کی آمد اور قدر بھی تھی۔ اکبر ہی وہ بادشاہ تھا جس نے اپنے دربار میں سب سے پہلے "ملک الشعرا" کا عہدہ قائم کیا اوراس پر باقاعدہ شاعر کا تقرر کیا جاتا تھا۔ ملک الشعرا کے عہدہ کے قیام اور اس پر پہلے ملک الشعرا کے تقرر کے بارے میں اکبر کے کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے سید سبط حسن لکھتے ہیں:

> اکبر گو ان پڑھ تھا لیکن چغتائیہ سلاطین میں ملک الشعرا کا عہدہ سب سے پہلے اسی نے قائم کیا اور غزالی شہیدی کو اس اعزاز سے نوازا۔ غزالی کے بعد ابوالفضل فیضی ملک الشعرا مقرر ہوئے اور مرتے دم تک کشور سخن کا تاجدار رہا۔(۵)

مغلیہ عہد میں اکبر کا عہد ہندوستان بھر کے ادب کے ساتھ ساتھ لاہور کے لیے بھی خاصا سازگار ثابت ہوا۔ اس عہد میں نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کی ترویج اور ترقی کی راہیں کھلتی چلی گئیں۔ اکبر کو علم وادب سے جو لگاؤ تھا وہ اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ اپنی شخصیت اوراپنے مزاج کی تسکین کے لیے علمی مباحثے بھی کرواتا تھا اور اہلِ علم وادب کو نوازتا بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے عہد میں ہندوستان میں مختلف زبانوں نے تیزی سے ترقی کی منازل طے کیں۔ سید سبط حسن کا یہ بیان اس حقیقت سے آشنائی دلاتا ہے کہ اکبر کے عہد میں کس قدر علم کی ترویج کا کام ہورہا تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> اکبر کے دورِ حکومت سے سلطنت مغلیہ میں نظامِ تعلیم کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ اکبر نے آگرہ، فتح پور سیکری، لاہور اور دوسرے مقامات پر نہ صرف اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج قائم کیے بلکہ نصاب میں بھی اصلاحیں کیں۔(۶)

اکبر کے دور میں چوں کہ لاہور کو اہم حیثیت حاصل تھی ، اس لیے اس کی اس علم پروری اور خوش اخلاقی کے اثرات لاہور پر بھی پڑے اور لاہور بھی علمی اور ادبی حوالے سے ترقی کی منازل طے کرتے ہوئے ایک ادبی مرکز کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔

اکبر کے عہد میں لاہور نے علمی اور ادبی حوالے سے جو ترقی کا سفر شروع کیا تھا وہ جہانگیر کے عہد میں بھی رواں رہا۔ جہانگیر بھی اکبر ہی کی طرح علم و ادب کا رسیا تھا۔ وہ بھی علمی اور ادبی مباحثے کرواتا اور اہلِ علم کی قدردانی بھی کرتا تھا۔ اس کے ساتھ تصوف سے بھی اسے خاص لگاؤ تھا۔ اس کے بعد شاہجہاں کے دور میں بھی لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں ترقی ہوتی چلی گئی۔

شاہجہاں کے بعد مغلیہ سلطنت کا تاج اورنگ زیب عالمگیر کے سر رکھا گیا۔ اورنگ زیب عالمگیر شریعت کی پابندی کرنے والا حکمران تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ملکی اور حکومتی امور کو بھی شرعی سانچے میں ڈھالنے کے لیے اقدامات کیے ۔ ان اقدامات میں سے بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے شعروادب کے سفر میں رکاوٹ کھڑی کی۔ اورنگزیب نے موسیقی پر پابندی لگادی، ملک الشعرا کا عہد ختم کردیا۔ شعروشاعری اورادب سے اسے کوئی خاص لگاؤ نہ ہونے کی وجہ سے اس کے عہد میں ہندوستان کے دیگر علاقوں کی طرح لاہور بھی ادبی حوالے سے متاثر ہوا۔ تاہم وہ علم کا قدردان تھا۔ اس نے رعایا کو علم کے زیور سے منور کے لیے بہت سے احسن اقداما ت بھی کیے۔ لیکن مجموعی طور پر علمی اورادبی حوالے سے اورنگزیب کا دور ہندوستان بھر کی طرح لاہور کے لیے بھی مایوس کن رہا۔ سبط حسن اس بارے میں لکھتے ہیں:

> یوں کہنے کو تو اورنگ زیب نے بھی اکبر کی مانند پچاس برس حکومت کی لیکن اکبری عہد مغلیہ تہذیب کے چڑھتے سورج کا عہد تھا اور عالمگیری عہد ڈھلتے سورج کا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں شریعت کی سخت گیریوں کے باعث فکروفن اور علم وادب کے سوتے خشک ہوگئے۔(۷)

لاہور میں ادبی سرگرمیوں میں تحرک اس وقت آیا جب انگریزوں نے اس خطے پر اپنے قبضے جمائے۔ انگریزوں نے برصغیر میں آنے کے بعد اس امر کو محسوس کیا کہ علم وادب کے شعبے پر مسلمان چھائے ہوئے ہیں۔ اس کا توڑ کرنے کے لیے انہوں نے فارسی کی بجائے اردو کو سرکاری زبان کا درجہ دیا۔ بعد میں جب پنجاب انگریزی سلطنت کا حصہ بنا تو یہاں بھی اردو کو ہی دفتری اور سرکاری زبان قرار دیا گیا۔۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں مقامی ہندوستانیوں کی ناکامی کی بعد یہ خطہ مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں چلا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب لاہور ہندوستان بھر میں ایک اہم ادبی مرکز کے طور پر ابھرا۔ بعد کے حالات کو دیکھا جائے تو بڑی بڑی علمی وادبی تحریکیں لاہور سے اٹھتی اور پروان چڑھتی دکھائی دیتی ہیں۔ لاہور کے ادبی مرکز بننے میں اہم پیش رفت اس وقت ہوئی جب انگریزوں نے ۱۸۵۹ء میں دہلی کو پنجاب کے زیر اثر کر دیا۔ لاہور کی طرح دہلی میں بھی ادیبوں اور شعرا کی کثیر تعداد موجود تھی جو دہلی کی مرکزی حیثیت کی وجہ سے وہاں سے کسی طور پر بھی ترک سکونت کو آمادہ نہ ہوئے تھے۔ لیکن دہلی کو پنجاب کے زیر اثر کرنے کے بعد لاہور جو پنجاب کا اہم مرکز تھا، یہ ادبی مرکز کے طور پر ابھرنا شروع ہوا۔ چنانچہ دہلی کے شعراء اور ادبا نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ یوں لاہور ادبی مرکز کے طور پر اپنی شناخت کو مستحکم کرنے میں کامیابی کی طرف بڑھنا شروع ہوا۔

اردو کے سرکاری زبان کا درجہ پانے کے بعد مسلمانوں کا کثیر طبقہ چوں کہ اردو دان تھا اور اردو سے واقفیت رکھتا تھا اس لیے فارسی کی بجائے اردو میں ادبی تخلیقات زیادہ ہونے لگیں۔ اس کے علاوہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد مقامی ہندوستانیوں پر جو عتاب نازل ہوا تھا، اس میں لکھنؤ،

دہلی ،کلکتہ اورآگرہ کے شہر زیادہ متاثر ہوئے تھے۔انگریزوں کے عتاب سے بچنے کے لیے بھی یہاں کے بہت سے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ شعر و ادب سے وابستہ شخصیات نے بھی لاہور کا رخ کیا۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ محمد حسین آزاد، مولانا الطاف حسین حالی، مولوی قادر بخش، پیارے لال آشوب ، مرزااشرف علی خان، مرزاراشد گورگانی اور مولانا فیض الحسن وغیرہ جیسی قد آور ادبی شخصیات لاہور کو مسکن بناتی دکھائی دیتی ہیں۔ اس ترک سکونت نے بھی لاہور کے ادبی مرکز بننے کی راہ ہموار کی۔

انگریزوں کے عہد میں لاہور کی ادبی حیثیت میں اس وقت اضافہ ہوا جب کرنل ہالرائیڈ نے یہاں "انجمن اشاعت مطالب مفیدہ" کی بنیاد رکھی ۔ بعد میں یہ انجمن پنجاب کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا قیام لاہور کی ادبی تاریخ میں ایک ایسا سنگ میل ثابت ہوا جس نے آگے چل لاہور کے ادبی منظرنامے کے ساتھ ساتھ ہندوستان بھر کی ادبی فضا کو متاثر کیا۔ اگرچہ اس انجمن کے قیام کے زیادہ تر مقاصد سیاسی تھے، لیکن اس کی سرگرمیوں نے اردو زبان وادب کے فروغ میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ شہرت بخاری اس انجمن اور محمد حسین آزاد کی ادبی کاوشوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> محمد حسین آزاد اورانجمن پنجاب ایک ہی تصویر کے دورخ ہیں۔۔ انجمن کے زیر اثر محمد حسین آزاد نے پنجاب میں اردو شاعری کا وہ ذوق پیدا کیا جس سے اردو شاعری کے ذریعے اہل پنجاب کو اردو سے وہ شیفتگی پیدا ہو گئی کہ آج پنجاب اوراردو دو چیزیں نہیں رہ گئیں۔(۸)

انجمن پنجاب کا قیام چوں کہ لاہور میں عمل میں آیا تھا اس لیے اس کی سرگرمیوں سے سب سے زیادہ تحرک اور تغیر لاہور کی ہی ادبی فضا میں پیدا ہوا۔ بعد میں جب انجمن کے تحت ایک ادبی رسالے کا اجرا کیا گیا تو اس میں شائع ہونے والی ادبی اور تنقیدی تحریروں نے بھی لاہور کی ادبی فضا کو متحرک کیا۔ اس کے علاوہ انجمن کے جلسے بھی لاہور میں منعقد ہوتے تھے۔ان جلسوں میں اس وقت کی معروف ادبی شخصیات شرکت کرتی تھیں یوں لاہور ادبی سرگرمیوں کے مرکز کی حیثیت اختیار کرتا چلا گیا۔ ان

سرگرمیوں نے لاہور سمیت پنجاب بھر کے ادبی منظر نامے کو متاثر کیا۔ عارف ثاقب اس حوالے سے لکھتے ہیں :

> انجمن پنجاب اپنے وسیع تر تناظر میں مختلف امور کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اس زمانے میں بہت سی ادبی انجمنوں میں سے ایک انجمن پنجاب ہی ایسی تھی، جس نے آگے چل کر اردو ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے۔(۹)

انجمن ہی کی کاوشوں سے لاہور میں بعض ایسے ادارے بھی وجود میں آئے جنھوں نے آگے چل کر اس شہر کو ادبی مرکز کے طور پر مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان میں سے ایک اورئینٹل کالج کا قیام ہے۔ مشرقی علوم کے احیاکے لیے قائم کیے گئے اس ادارے نے اردو زبان وادب کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ اس کے علاوہ انجمن پنجاب ہی کی کاوشوں میں لاہور میں سرکاری کتب خانے کا قیام بھی عمل میں لایا گیا۔ اس کے تحت انگریزی تصانیف کے اردو اور دیگر زبانوں میں تراجم کیے جاتے تھے۔ یوں لاہور میں اردو اور دیگر مقامی زبانوں کے فروغ کی راہیں کھلتی چلی گئیں اور لاہور کی ادبی مرکز کی حیثیت مستحکم ہوتی چلی گئی۔

لاہور کے ادبی مرکز کے طور پر ابھرنے میں ان شعرا اور ادبا کا بھی اہم کردار ہے جو بیسویں صدی میں لاہور کے ادبی منظرنامے پر ظہور پذیر ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے ہی ان کی شعری اورادبی نگارشات نے مقبولیت حاصل کرلی۔ ان میں ایک اہم نام علامہ محمد اقبالؒ کا ہے۔ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں ہندوستانی قوم بالخصوص مسلمانوں کو اپنے شاندار ماضی کی روایات سے آشنا کیا۔ ان کی شعری صلاحیتوں کا اعتراف کیاجانے لگا۔ انجمن پنجاب اور دیگر ادبی محافل میں ان کی شعر گوئی کو سراہا گیا۔ ان کے ساتھ ساتھ اختر شیرانی کی رومانوی شاعری بھی اس عہد کے لاہور کی ادبی سرگرمیوں میں ایک اہم اضافہ ثابت ہوئی۔ اقبال اور شیرانی کے علاوہ لاہور میں سامنے آنے والے مختلف ادبی حلقوں نے بھی اس شہر کی ادبی حیثیت کو مسلّم کیا۔ اقبال کی تحریک کے عوامل پہ بات کرتے ہوئے ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں:

> انیسویں صدی کے اواخر میں جب اردو زبان کے مطلع ادب پر اقبال کا ظہور ہوا تو برصغیر میں سیاست، معاشرت، مذہب اور ادب کی متعدد روئیں آپس میں متصادم ہو چکی تھیں چنانچہ اقبال کی تحریک ایک ایسے پسِ منظر سے ابھری جس میں تلاطم اور پیکار زیادہ ہے۔(۱۰)

اورینٹل کالج دراصل انجمنِ پنجاب کی فکری و علمی سرگرمیوں کی توسیع تھا، جس نے علمی و ادبی مباحث کو منظم اور تعلیمی دائرے میں مزید وسعت دی۔ اس کے قیام سے لاہور میں علمی و ادبی فضا کو نئی سمت ملی اور تحقیق و تنقید کے دروازے کھلے۔ تاہم اسی دور میں لاہور میں موجود دیگر ادبی انجمنیں اور تحریکیں بھی فعال تھیں، جن کے باعث ایک صحت مند مسابقت پیدا ہوئی۔ یہی مسابقت شہر کے علمی و ادبی ماحول کو مزید زرخیز بنانے اور متنوع رجحانات کو پروان چڑھانے کا باعث بنی۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر غلام حسین لکھتے ہیں:

> اگرچہ یہ ادارہ ہیت ترکیبی کے اعتبار سے انجمن پنجاب کے اس کالج سے قدرے مختلف تھا جو ۱۸۶۸ء میں بند کر دیا گیا تھا تاہم مقصد اور طریق کے اعتبار سے موجودہ ادارہ اور سابقہ کالج اس تحریک کی قدرتی پیداوار تھے جسے انجمن پنجاب نے ۱۸۶۰ء میں شروع کیا تھا۔۔۔یعنی اورئینٹل یونیورسٹی کی تحریک۔(۱۱)

انجمن پنجاب نے لاہور میں ادبی حوالے سے جو بیج بویا تھا وہ آگے چل کر "دبستان لاہور" کی صورت میں ایک توانا درخت کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دبستان لاہور کے قیام میں ان ادبا اور شعرا کا عمل دخل بہت زیادہ ہے جو ہندوستان کے مختلف خطوں سے لاہور آکر آباد ہوگئے تھے۔ دوسری طرف کسی حد تک دبستان لکھنؤ اور دبستان دہلی کا ردعمل بھی دبستان لاہور کی صورت میں سامنے آتا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر علی محمد خان لاہور کو بطور ادبی دبستان پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> دلی کا تذکرہ کرتے ہیں تو دلی سے ہماری مراد دلی شہر نہیں بلکہ وہ صدھا سال کی تہذیب ہے جس کا مرکز دلی رہا ہے اور جب ہم دبستانِ لکھنو کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے مراد خطہ اودھ کی وہ تہذیب ہے جس کا نمائندہ لکھنو ہے چونکہ لاہور، پنجاب کا مرکز بلکہ دل کہلاتا ہے اور خطہ پنجاب کی تہذیب کی نمائندگی کرتا ہے اور اس مرکز کے باشندوں میں وہ تمام خصوصیات موجود ہیں جو پنجاب کا طرہ امتیاز ہیں اس لیے ہم نے دبستان لاہور کہا ہے۔(۱۲)

لاہور میں ادبی سرگرمیوں کے فروغ اور اس شہر میں ادب سے وابستہ افراد کی کاوشوں سے جو ادبی فضا سامنے آئی وہ اس شہر کو بجا طور پر ایک ادبی دبستان کا درجہ دینے اورادبی مرکز بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ماضی کے تناظر میں ہم جو بحث یہاں تک کر آئے ہیں، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ غزنی عہد سے لے کر بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے لاہور کی ادبی حیثیت ایک ادبی مرکز کے طور پر خاصی مستحکم ہو چکی تھی۔ دبستان لاہور کے تحت وہ ادب شعر و نثر میں تخلیق کیا جارہا تھا جو اپنی خاص پہچان اور شناخت رکھتا تھا۔ اس کے علاوہ تنقیدی حوالے سے بھی اس شہر نے ادب میں خاص نام کمایا تھا۔ یہ تمام عناصر اس شہر کو ایک ایسی ادبی مرکزی کی حیثیت دیتے ہیں جو لکھنؤ اور دلی سمیت کسی بھی دوسرے ادبی مرکز سے کسی طرح بھی کم نہ تھا۔ پروفیسر ممتاز حسین اس حوالے سے لاہور کی بطور ادبی مرکز حیثیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور اردو ادب کا ویسا ہی ایک اہم مرکز رہا ہے جیسے لکھنؤ، دہلی یا حیدر آباد۔لاہور کی خدمات دہلی اور لکھنؤ سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔(۱۳)

لاہور کی ادبی حیثیت اور اس کے ادبی مرکز بننے کا جائزہ لیا جائے تو لاہور نے کسی ایک خاص صنف ادب کی بجائے ادب کی متنوع اصناف اور متنوع جہات کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ جدید شاعری کی تو تحریک ہی لاہور سے اٹھی اور پورے ہندوستان میں بڑھتی چلی گئی، اس کے علاوہ جدید نثر کو

فروغ دینے میں بھی لاہور کا کردار نمایاں ہے۔ اس کے علاوہ ادب کی مختلف اصناف میں ندرت خیال پر بھی محنت لاہور میں بہت کی گئی۔ دبستان لاہور کی خصوصیات کا جائزہ لیا جائے تو ان میں اہم وصف یہ بھی دکھائی دیتا ہے کہ اس دبستان سے تعلق رکھنے والے ادیبوں اور ناقدین نے ادب کے فنی محاسن اور زبان و بیان کی باریکیوں کی بجائے ندرت خیال کو پیش نظر رکھا جس کی وجہ سے لاہور میں فکری اور موضوعاتی حوالے سے ادب میں تنوع بڑھتا چلا گیا جو آگے چل اس دبستان کی بنیادی خصوصیت قرار پایا۔ اس شہر نے دلی اور لکھنؤ جیسے بڑے ادبی مراکز کے مقابلے میں بڑی تیزی سے اپنی ادبی حیثیت کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ ادب کا ارتقائی سفر بھی تیزی سے طے کیا اور برصغیر میں ایک ایسے ادبی مرکز کے طور پر ابھرا جس کی اپنی شناخت، اپنے خصائص اور اپنی فکری و فنی پہچان بنی۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی لاہور کو دلی اور لکھنؤ ہی کی طرح ایک بڑے ادبی مرکز کے طور پر متعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

> شہر لاہو کو دلی اور لکھنؤ کی طرح سیاسی، معاشرتی اور ادبی مرکزیت حاصل ہے۔ علاقہ پنجاب میں آپ کو جو سیاسی، معاشرتی اور ادبی رجحانات نظر آئیں گے ان کی جڑیں لاہور ہی میں ملیں گی۔۔۔ جس طرح دلی کے دبستان شعر کی اہم اور بنیادی خصوصیت فطرت، سادگی اور متانت ہے، لکھنؤ کے دبستان کی معاشرتی احساس، نزاکت اور لطافت ہے، اسی طرح لاہور کے دبستان کی بنیادی خصوصیت خیال اور اسلوب کی توانائی، جدت اور ہر جدت کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے۔ اور یہ بات محض ادب میں ہی نہیں زندگی میں جاری و ساری ہے۔(۱۴)

ادب زندگی اور معاشرے کا عکاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ جب معاشرے میں توانائی، جدت اور جدید افکار و نظریات کو قبول کرنے اور جانچنے پرکھنے کا رواج اور مزاج پایا جائے گا تو لازمی امر ہے کہ ادب میں بھی یہی رجحانات پائے جائیں گے۔ معاشرتی سطح سے ادب کی زینت بننے والے یہ رجحانات

معاشرتی پس منظر رکھنے کی وجہ سے ادب میں مضبوط بنیادوں پر استوار ہوتے ہیں، جس کی وجہ سے اس شہر یا خطے کے ادب کے بنیادی خصائص میں ڈھل جاتے ہیں۔ لاہور کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ادبی سطح پر اس میں پائی جانے والی انفرادیت دراصل ان خصائص کی مرہون منت ہے جو معاشرتی سطح سے اٹھ کر ادب کے سانچے میں ڈھلے ہیں۔ انھی خصائص نے لاہور کے منفرد خصوصیات کے حامل ادبی دبستان اورادبی مرکز بننے میں اہم کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد کے لاہور کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو لاہور نے قیام پاکستان کے بعد بھی اپنی ادبی مرکزیت کو قائم رکھا ہے۔ اگرچہ ہجرت اور تقسیم کے واقعات سے متاثر بھی لاہور ہی سب سے زیادہ ہوا تھا۔ دن رات لٹے پٹے قافلے اور بے بس مہاجرین اس شہر کا رخ کر رہے تھے۔ آباد کاری کے مسائل، بھوک اور افلاس کے مسائل، سماجی سطح پر لوٹ کھسوٹ کے مسائل اور دیگر ان گنت مسائل نے لاہور کے سماجی اور معاشی منظر نامے کو گہنا دیا تھا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان مسائل اوران کے اثرات نے فکری و موضوعاتی حوالے سے ادب کو زرخیزی بھی عطا کی۔ اس کے علاوہ ہندوستان سے آنے والے بیشتر ادیبوں نے لاہور کو ہی اپنا مسکن بنایا تھا۔ اگرچہ یہاں سے بعض ادیب ہندوستان بھی گئے لیکن آنے والے ادیبوں کی ادبی کاوشوں کی وجہ سے اس شہر کی ادبی حیثیت پہلے سے بھی زیادہ مستحکم ہوتی چلی گئی۔ یوں یہ شہر غزنی عہد سے لے کر عصرِ حاضر تک ادبی حوالے سے برصغیر میں اپنی مرکزیت قائم رکھے ہوئے ہے۔

ب۔ قیام پاکستان سے قبل کی آپ بیتیاں اور لاہور کا ادب

لاہور کی ادبی زندگی میں سب سے زیادہ کردار ان محفلوں اورادبی مراکز کا ہے جو ادیبوں کے اکٹھ کا باعث بنتے تھے۔ یہ ادبی مراکز ادیبوں کو نہ صرف مل بیٹھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں بلکہ ادبی نگارشات کو دوسرے تک پہنچانے کا اہم ذریعہ بھی ہیں۔ قبل از تقسیم سے لے کر عصرِ حاضر تک ان ادبی مراکز نے ادبی حوالے سے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں ادبی تخلیق کار اپنی تخلیقی نگارشات پیش کرتے اور ان پر تنقیدی رائے کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ جس سے ایک ادبی فضا کو پروان چڑھنے کا موقع ملتا تھا۔ اب بھی یہ صورت حال قائم ہے لاہور کے ادیبوں کے ایسے اکٹھ کی جگہوں کا سراغ لگایا جائے تو تقسیم سے قبل اس شہر میں بہت سی ایسی جگہیں تھیں جہاں ادیب اور شعرا مل بیٹھتے تھے۔ وہ ادیب جنھوں نے اپنی زندگی کو یادداشتوں یا آپ بیتی کی صورت میں قارئین کے سامنے پیش کیا ہے، انھوں نے ان ادبی محفلوں کے نقشے بھی بڑی تفصیل سے کھینچے ہیں۔ ان ادبی مراکز اور محفلوں میں زیادہ تر مختلف ادیبوں کے گھر اور مہمان خانے ہی شامل ہیں جہاں تقسیم سے قبل ادیب مل بیٹھتے تھے۔ اس کے علاوہ انڈیا ٹی ہاؤس جو اب پاک ٹی ہاؤس بن چکا ہے، یہ بھی ادیبوں کے اکٹھ کا اہم مرکز رہا ہے۔

اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری کا جائزہ لیا جائے تو لاہور کی ادبی صورت حال کی عکاسی کرتے ہوئے یادداشت نگاروں اورآپ بیتی نگاروں نے ان محفلوں اور ادبی مراکز سے اپنی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے وہاں ہونے والی ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ وہاں آنے والی ادبی شخصیات سے بھی آگاہی دلاتی ہے۔ وہاج الدین علوی ادبی خود نوشت کے بارے لکھتے ہیں:

> خود نوشت میں مصنف اپنے دور کی ادبی، سیاسی، سماجی نیز ثقافتی جھلکیاں پیش کرتا ہے اس آئینہ میں اس کا دور پوری طرح نظر آتا ہے لیکن کسی ایک پہلو پہ ضرورت سے زیادہ زور نہیں دیتا۔ دراصل ادبی خود نوشت، خود نوشت کے سارے لوازم کو پورا کرتی ہے۔ ایسی خود نوشتوں کے

خالق شاعر، ادیب اور فن کار ہوتے ہیں یہ تصانیف زبان و بیان کے لحاظ سے اچھی ہوتی ہیں اور ادبی معلومات کے لحاظ سے بھی بہتر ہوتی ہیں بعض اوقات ان کی مدد سے بڑے بڑے علمی و ادبی مسلے حل ہو جاتے ہیں۔(۱۵)

محمد سعید کا شمار ایسے آپ بیتی نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے تقسیم سے قبل اور بعد کے لاہور کے ادبی منظر نامے کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی "آہنگ بازگشت" میں لاہور کی ان ادبی محفلوں اور ادیبوں کے ٹھکانوں کے نقشے کھینچے ہیں۔ تقسیم سے قبل کے لاہور کے ادبی منظر نامے کی عکاسی کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

لاہور ان دنوں بڑے ادبی عروج پر تھا۔ مشاعرے، مباحثے، لیکچر روزمرہ کا معمول تھا۔ ہر میدان میں ایک سے بڑھ کر ایک دیو قامت انسان ملتا تھا۔ اقبال اگرچہ مشاعروں سے دامن کش ہو چکے تھے، تاہم ان کے وجود نے لاہور کو وہ مرتبہ عطا کر رکھا تھا، جو کبھی قدیم دلی کو غالب نے بخشا تھا۔ حفیظ جواں سال اور خوش گلو تھے۔ حفیظ ان دنوں مخزن کے مدیر تھے اور شاہنامہ اسلام کی تدوین میں مشغول تھے۔ ہمارے سامنے ایک حویلی میں کرنل مجید ملک رہتے تھے ان کے ہاں پروفیسر بخاری اور تاثیر کا آنا جانا تھا۔(۱۶)

یہ وہ دور تھا جب لاہور ادبی سرگرمیوں میں عروج کی طرف گامزن تھا۔ آج تقریباً ایک صدی بعد جب ہم تقسیم سے قبل کے لاہور کے اس ادبی منظر نامے کو دیکھتے ہیں تو اُس وقت کے وہ ادیب جو نوخیز ادبا کا درجہ رکھتے تھے اور لاہور کی ادبی فضا کو متحرک رکھے ہوئے تھے، ان کے تخلیقی اور تنقیدی اثرات ایک صدی بعد بھی اردو ادب و تنقید پر دکھائی دیتے ہیں۔ اردو آپ بیتی میں اے حمید کی "یادوں کے گلاب" ایک ایسی آپ بیتی کا درجہ رکھتی ہے، جس میں لاہور کے ادبی منظر نامے کو بڑی وضاحت سے

بیان کیا گیا ہے۔ اے حمید خود بھی ادب کے رسیا تھے اورادبا سے ملنا جلنا اورادبی محفلوں میں شرکت ان کی زندگی کا لازمی حصہ بن چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ایک عینی شاہد کی طرح لاہور کی قبل از تقسیم کی ادبی فضا کو بڑے مؤثر انداز میں بیان کیا ہے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی میں لاہور کے ادیبوں کے معروف ٹھکانوں سے آگے بڑھتے ہوئے ان محفلوں اور ادبی مراکز کی بھی عکاسی کی ہے، جو اب قصہ پارینہ بن چکے ہیں۔وہ ان ادبی مراکز کا ذکر کرتے ہوئے ، ان سے وابستہ شخصیات اور ان کے کارناموں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ لاہور کے معدوم ہو جانے والے میٹر و ہوٹل کی ادبی حیثیت اوراسے ایک ادبی مرکز کے طور پر سامنے لاتے ہوئے وہ اپنی آپ بیتی "یادوں کے گلاب" میں لکھتے ہیں:

اسمبلی ہال کے بالمقابل واپڈا کی عظیم الشان بلڈنگ کے نیچے میٹر و ہوٹل کی لاش دفن ہے۔ اس مدفن میں کہیں مولانا چراغ حسن حسرت کے لطیفوں کی پھلجھڑیاں، کہیں محمود اختر کیانی کے قہقہوں کی گونج، کہیں باری علیگ کے طنزیہ جملوں کی نشتر اور کہیں ڈانسر انجیلا کے گھنگھرو بکھرے ہوئے ہیں۔(۱۷)

اے حمید کا مشاہدہ خاصا وسیع تھا۔ وہ لاہور کے ادبی منظر نامے کا اہم عنصر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ادیبوں کے مختلف ٹھکانوں اور ان کے ادبی محرکات کا تذکرہ اپنی آپ بیتی میں بڑی صراحت سے کیا ہے۔ میٹر و ہوٹل کے علاوہ وہ نقوش کے دفتر کو ادیبوں کے اکٹھ کا اہم مرکز قرار دیتے ہیں۔ نقوش نے اردو ادب پر جو اثرات مرتب کیے وہ اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ نقوش ایک ایسے ادبی مرکز کے طور پر بھی ابھرا جو ادبا کے بالمشافہ رابطے کا بھی باعث بنا۔ اس زمانہ ساز ادبی رسالے کے دفتر میں ادیبوں کے اکٹھ کا تذکرہ کرتے ہوئے اے حمید "یادوں کے گلاب" میں لکھتے ہیں:

ان ہی دنوں ماہنامہ " نقوش " کا اجرا ہوا۔ نقوش کا دفتر ایبک روڈ پر واقع قطب الدین ایبک کے مزار کے پہلو میں تھا۔ اکثر ملک کے مشہور و معروف ادیب اور شعرا حضرات یہاں آکر بیٹھتے اور ادب کے مختلف

> مسائل پر گفتگو ہوتی ۔ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی ، شوکت
> تھانوی، جگر مرادآبادی ، اشفاق احمد، ڈاکٹر عبادت بریلوی ، وقار عظیم ،
> ابوالليث صدیقی اور دوسرے اہلِ قلم کی یہاں محفلیں جمتیں۔(۱۸)

ان ادبی محفلوں نے آگے چل کر نہ صرف لاہور بلکہ برصغیر کے ادبی منظرنامے کو بھی متاثر کیا۔ آج ایک صدی بعد کے ادبی منظرنامے کا جائزہ لیا جائے تو یہ ادبی شخصیات جن کا تذکرہ اے حمید کرتے ہیں، ان کے تخلیقی اور تنقیدی کارنامے آج بھی اردو ادب میں زندہ ہیں۔

لاہور کے ادبی مراکز میں جو حیثیت پاک ٹی ہاؤس کو حاصل ہے، وہ کسی بھی اور مرکز کو نہیں۔ یہ وہ مرکز ہے جو قیام پاکستان کے قبل سے لے کر عصرِ حاضر تک ادیبوں کا ٹھکانہ بناہوا ہے۔ بڑی بڑی ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ اہم ادبی تنظیموں کو متعارف کروانے میں بھی پاک ٹی ہاؤس نے بنیادی کردار ادا کیاہے۔لاہور کی کوئی ادبی شخصیت ایسی نہیں ہو گی جس نے پاک ٹی ہاؤس سے فیض حاصل نہ کیا ہو۔ آج بھی یہ حلقہ ارباب ذوق اور دیگر کئی ادبی تنظیموں کے لیے ایک اہم مرکز کی حیثیت رکھتاہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو کی وہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں، جن میں لاہور کے ادبی منظرنامے کی عکاسی ملتی ہے، ان میں پاک ٹی ہاؤس کا تذکرہ ضرور ملتاہے۔پاک ٹی ہاؤس قیام پاکستان سے قبل انڈیاٹی ہاؤس کے نام سے مشہور تھااور اس وقت بھی ادیبوں کا ٹھکانہ تھا۔ انتظار حسین اپنی یادداشتوں کی کتاب " چراغوں کادھواں" میں اس بارے لکھتے ہیں:

> پاک ٹی ہاؤس آگے انڈیاٹی ہاؤس تھا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بھی اچھے
> خاصے دنوں تک انڈیاٹی ہاؤس رہا۔ پھر ایک دن انڈیاٹی ہاؤس کا بورڈ اتر
> گیا۔ پاک ٹی ہاؤس نیا نام رکھاگیا۔ نیانام اسے راس آیا۔ پھر یہاں بیٹھنے
> والے ادیبوں کی نفری بڑھتی ہی چلی گئی۔(۱۹)

یہاں بیٹھنے والے ادیب مختلف ادبی نظریات اور تصورات کے حامل ہوتے تھے لیکن یہ ٹھکانہ ایساوسیع القلب ثابت ہوا کہ اس نے ہر طرح کے ادبی نظریات اور تصورات کی ترویج میں بنیادی کردار

ادا کیا۔ انتظار حسین نے اپنی یادداشتوں "چراغوں کا دھواں" میں اس کو ایک ایسے مرکز کے طور پر سامنے لانے کی کوشش کی ہے جو عروج کی طرف ہی گامزن رہے گا۔ وہ اس ادبی ٹھکانے کے آغاز کے بارے میں لکھتے ہیں:

> اب پاک ٹی ہاؤس کا زمانہ شروع ہونے لگا ہے۔ اس زمانے کے رستے میں آنکھیں بچھاؤ۔ اس کے جلو میں نئے لکھنے والے رنگ رنگ کے قطار اندر قطار آئیں گے۔ سو یہ ٹھکانہ ادب کے باقی سب ٹھکانوں سے خواہ اس شہر میں ہوں یا اس شہر سے باہر کراچی میں ہوں یا پنڈی میں ہوں زیادہ عمر پائے گا۔ عرب ہوٹل، نگینہ بیکری، کافی ہاؤس، چینیز لنچ ہوم، یہ تو سب تھوڑی تھوڑی بہار دکھائیں گے۔(۲۰)

یہ حقیقت ہے کہ اگرچہ لاہور میں ادیبوں کے کئی اور ٹھکانے بھی موجود تھے، لیکن جو شہرت اور ناموری پاک ٹی ہاؤس کے حصے میں آئی وہ کسی دوسرے ادارے کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس ادارے نے بہت سی ادبی شخصیات کے لیے ایک مہربان کا کام کیا۔ یہ بھی اسی ٹھکانے کا اعزاز ہے کہ اس سے پہلے اور اس کے بعد میں ادبی مرکز بننے والے ٹھکانے بند ہوتے چلے گئے، لیکن یہ نہ صرف قائم رہا بلکہ ہر دور میں یہاں آنے والے ادیبوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔ اے حمید کی یادداشتوں میں لاہور کے دیگر ادبی ٹھکانوں کے بند ہونے اور پاک ٹی ہاؤس کے قائم رہنے اور ممکنہ مستقبل کی پیش کش ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> کافی ہاؤس قصہ پارینہ بن چکا ہے۔ کافی ہاؤس کی جگہ پر مہران بنک کھلا وہ بھی ختم ہو گیا۔ اب اس کے باہر صرف لوہے کا دروازہ ہے اور لوہے کا بڑا سا تالا ہے۔ کافی ہاؤس کے زندگی سے بھرپور دنوں کی بس ایک یاد باقی رہ گئی ہے۔ پاک ٹی ہاؤس چل رہا ہے مگر نہ چلنے کے برابر ہے نیلے گنبد میں آٹو سپیر پارٹس اور خاص طور پر ٹائروں کے بزنس کی یلغار پاک ٹی ہاؤس

تک پہنچ چکی ہے۔ لگتا ہے کہ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب پاک ٹی ہاؤس
کی جگہ اس کی پیشانی پر "پاک ٹائر ہاؤس" لکھا ہوا ہو گا۔(۲۱)

پاک ٹی ہاؤس آج بھی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ قائم ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کے اجلاس آج بھی باقاعدگی سے یہیں منعقد ہوتے ہیں۔ یوں یہ ادارہ ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزار کر اب بھی نو آموز ادیبوں کے لیے ایک سائبان کی حیثیت رکھتا ہے۔ نئے شاعر اور ادیب اب بھی یہاں منعقد ہونے والے اجلاسوں میں اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں، ان پر تنقیدی تبصرے ہوتے ہیں اور یوں لاہور کی ادبی فضا میں تحرک اب بھی اس ادارے کے دم سے قائم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں یادداشتوں اور آپ بیتیوں میں اس کا تذکرہ خصوصی طور پر ملتا ہے۔

لاہور میں کافی ہاؤس بھی ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ادیبوں کا ایسا ٹھکانہ تھا جس کی دید کی خواہش بہت سے لوگوں کے دلوں میں ہوتی تھی۔ اردو یادداشتوں میں لاہور کے اس اہم ادبی مرکز کی بھی عکاسی ملتی ہے۔ اے حمید لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب "لاہور لاہور اے" میں کافی ہاؤس کی ادبی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور میں کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس کے بعد لٹریچر، آرٹ، صحافت اور علم و ادب کا گہوارہ تھا۔ پاکستان کے دوسرے شہروں سے آرٹ اور ادب کے شیدائی کافی ہاؤس دیکھنے اور اس میں بیٹھ کر کافی پینے کی خواہش لے کر لاہور آتے تھے۔ جس زمانے میں ذوالفقار علی بھٹو وزیر اعظم تھے انہوں نے کافی ہاؤس میں دانشوروں کے ساتھ کافی پینے کی خواہش ظاہر کی اور پھر جب وہ لاہور آئے تو کافی ہاؤس بھی آئے۔ کافی ہاؤس پاکستان کے ادبی اور شناختی ورثے کی شناخت تھی۔ پھر ایسا ہوا کہ کافی ہاؤس کی محفلیں بکھر گئیں۔ پرانے بادہ کش ایک ایک کر کے اٹھتے چلے

گئے ۔ کسی نے آبِ بقائے دوام کی تدبیر نہ کی۔ ایک دن کافی ہاؤس بند ہو گیا۔اس کے قینچی دار لوہے کے دروازے پر موٹا سا تالا پڑ گیا۔(۲۲)

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے ادبی منظر نامے کی جائزہ لیتے ہوئے جب ہم یہاں کے ادیبوں کے ٹھکانوں کا کھوج لگاتے ہیں تو کافی ہاؤس اور پاک ٹی ہاؤس کے علاوہ بھی بعض ایسے ٹھکانے ملتے ہیں جنھوں نے اس شہر کی ادبی فضا کو تحرک دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ بعض ایسے ٹھکانوں میں ایسی شاہکار تخلیقات پیش کی گئیں تھیں جو آگے چل کر اردو ادب کا سرمایہ قرار پائیں۔ انہی میں سے ایک اہم مرکز حبیبیہ ہال بھی تھا۔ اس ہال کو ادبی حیثیت اس حوالے سے بھی حاصل ہے کہ حفیظ جالندھری نے اپنی شہرۂ آفاق شعری تخلیق "شاہنامہ اسلام" پہلی بار یہیں پڑھی تھی محمد سعید اس اہم ادبی واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی "آہنگ بازگشت" میں لکھتے ہیں:

انھی دنوں(۱۹۳۳ء میں) سر شفاعت الہ آباد سے لاہور آئے اوران کی صدارت میں حبیبیہ ہال میں ایک تقریب منعقد ہوئی، جس میں حفیظ نے پہلی مرتبہ شاہنامہ اسلام پیش کیا۔ کلام سادہ تھا، طرزِ ادا مسحور کن اور لحن سراپا جادو۔ حفیظ بیاض سے پڑھ رہے تھے، وقت یوں گزر گیا کہ جب حفیظ بیٹھنے لگے اور سامعین نے اور سننے کی فرمائش کی تو انھوں نے کہا: ۲۷ صفحے پڑھ چکا ہوں۔ بہر حال انھیں چار پانچ صفحے اور پڑھنے پڑے۔ حبیبیہ ہال کی یہ نشست ادبی نشستوں میں بڑی معرکہ کی رہی۔ شہر میں شاہنامے کی دھوم مچ گئی۔(۲۳)

یہ واقعہ ۱۹۳۳ء کا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب انگریزی سامراج کے خلاف تحریکیں عروج کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ لاہور کے ادبی منظر نامے پر اقبال جیسے پختہ کار شاعر بھی چھائے ہوئے تھے ۔ اس دور میں ایسے ادبی مراکز نے حفیظ جیسے نو آموز شعرا کو پذیرائی بخشی ۔ آگے چل کر یہی پذیرائی اردو ادب کے لیے بڑے شاہکار تخلیق کرنے کا باعث بنی ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیام

پاکستان سے قبل بھی لاہور کے ادبی منظر نامے میں خاصا تحرک دکھائی دیتا ہے۔ پختہ شعرا اور ادبا کے ساتھ ساتھ ایسی نو آموز نسل بھی وجود میں آرہی تھی، جس نے آگے چل کر اردو شعر و ادب کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ اس میں فکری اور موضوعاتی حوالے سے خاصے تنوع کا باعث بھی بنی۔ اس فکری و موضوعاتی تنوع نے ارد ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ لاہور کی بدلتی ہوئی ادبی فضا میں ان ادبی مراکز اور ادبی محفلوں نے اپنا خوب حصہ ڈالا اور ایسی ادبی فضا قائم کی جو فکری و موضوعاتی حوالے سے خاصی زرخیز ثابت ہوئی۔

کسی بھی ادبی فضا میں مشاعروں کا عمل دخل بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مشاعروں میں چوں کہ شعراء براہ راست عوام سے مخاطب ہوتے ہیں، اور ایک طرح کی معرکہ آرائی بھی دیکھنے میں آتی ہے، اس وجہ سے ادبی فضا میں ایسا تحرک پیدا ہوتا ہے، جو کسی دوسرے ادبی مظہر سے ممکن نہیں ہے۔ مشاعرے شروع ہی سے ادبی منظر نامے کا حصہ رہے ہیں۔ اگر اردو شاعری کی تاریخ پر نگاہ دوڑائی جائے تو مشاعروں کا سلسلہ خاصا قدیم دکھائی دیتا ہے۔ لکھنؤ اور دیگر بہت سے شہروں میں ہونے والے مشاعرے شعرا کے لیے زندگی موت کا مسئلہ بن جاتے تھے۔ ایک دوسرے پر سبقت لے جانے اور فی البدیہہ شعر کہنے میں مہارت کے ساتھ ساتھ مختلف زمینوں میں شعر گوئی میں اپنی مہارت کا لوہا بھی مشاعروں کے ذریعے ہی منوایا جاتا تھا۔

لاہور کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو قیام پاکستان سے قبل بھی لاہور میں مشاعروں کا سلسلہ خاصا مضبوط تھا۔ بہت سے شعرا ایسے تھے، جنھیں ان مشاعروں نے عوام الناس میں مقبولیت حاصل کرنے کے قابل بنایا۔ اس کے علاوہ ان مشاعروں کے ذریعے لاہور کے ادبی منظر نامے کو شہرت حاصل ہوئی۔

اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری کا ادبی جائزہ لینے سے اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے ادبی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے، وہاں ہونے والے مشاعروں کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچا ہے، جس کی وجہ سے ان کی آپ بیتیاں لاہور کی ادبی

فضا کو سامنے لانے کے حوالے سے اہم قرار پاتی ہیں۔ آپ بیتیوں اوریادداشتوں میں مشاعروں کے تذکرے کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کے تخلیق کاروں نے ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعراسے بھی آگاہی دلائی ہے جس سے قاری اُس عہد کا ادبی منظر نامہ دیکھ سکتا ہے۔ غلام نبی کی آپ بیتی اس حوالے سے اہمیت کی حامل ہے کہ انہوں نے لاہور کے ادبی منظرنامے کی عکاسی کرتے ہوئے قیام پاکستان اور لاہور کے ادبی سفر کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے آپ بیتی میں لاہور کے شعراسے آگاہی حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ قبل از تقسیم کے اہم ادبی تخلیق کاروں سے بھی آگاہی دلائی گئی ہے۔ وہ اپنی آپ بیتی میں لاہور کی ادبی فضا کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور کی گہما گہمی قابل دید تھی ،عالیشان مشاعرے ہوتے تھے ۔ علم وادب سے بھرپور محفلیں تھیں، مذاکرات اور دلچسپ بحثیں ہوتی تھیں۔ شعراء میں اختر شیرانی ، حفیظ جالندھری ، عبدالمجید سالک ، حفیظ ہوشیارپوری ، چراغ حسن حسرت ، کرنل مجید ملک بہت مقبول تھے۔(۲۴)

ملک غلام نبی نے یہاں لاہور میں ہونے والے مشاعروں کے ساتھ ساتھ دیگر ادبی محفلوں سے بھی آگاہی دلائی ہے ، اسکے علاوہ ان ادبی شخصیات کو بھی سامنے لائے ہیں جو بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں لاہور کے ادبی منظر نامے پر اپنی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کا لوہا منوا رہے تھے۔

مشاعرہ ایک ایسا ادبی مظہر ہوتا ہے جو مختلف جگہوں پر منعقد ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادبی تنظیموں کے مختلف مراکز پر اگرچہ ادبی اور تنقیدی بحث ہوتی رہتی ہے، لیکن ان کے لیے مخصوص جگہ ہوتی ہے۔ لیکن مشاعرہ مخصوص جگہ پر نہیں ہوتا بلکہ وہ دور جب ادبی محفلیں اپنی رونق سے ہر آنکھ کو خیرہ کیے جارہی تھیں، اس دور میں لاہور میں مشاعروں کا چلن عام ہوچکا تھا۔ ان مشاعروں نے لاہور کی ادبی فضا کو اس قدر اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا کہ کوئی بھی سماجی اکٹھ ہو اس میں کسی نہ کسی طورپر مشاعرہ لازمی ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں مختلف ادبی تنظیمیں بھی اپنا حصہ ڈالتی رہی تھیں۔ اردو آپ بیتیوں

میں لاہور کی ادبی فضا کے اس مظہر کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ وہ مشاعرے جو سماجی اکٹھ کے موقع پر ہوتے تھے، ان میں شعرا کے لیے انعام واکرام کا اہتمام بھی کیا جاتا تھا۔ قیام پاکستان سے قبل ایسے ہی ایک مشاعرے کا ذکر کرتے ہوئے احسان دانش اپنی آپ بیتی "جہانِ دانش" میں لکھتے ہیں:

> لاہور میں ایک آل انڈیا نمائش ہوئی جس میں مصنوعات کے اسٹال، تفریح کے لیے کھیل تماشے اور پہلوانانِ پیل تن کے لیے اکھاڑے کا انتظام بھی کیا گیا۔ عوام الناس کی تفریح کے ساتھ ساتھ ادب دوست اصحاب کی روحانی ضیافت کے لیے "انجمن اردو پنجاب" کی طرف سے ایک عظیم الشان مشاعرے کا اہتمام بھی کیا گیا۔ جس میں نظموں کے عنوان اور غزلوں کے لیے طرح مصرعے بھی رکھے گئے۔ "انجمن اردو پنجاب" اور بعض تاجروں کی طرف سے تمغوں کا اعلان بھی کیا گیا۔ جہاں سنجیدہ مذاق لوگوں کے لیے نظمیں اور غزلیں تفنن کا سامان تھیں وہیں مزاحیہ اشعار پر بھی میڈل کا اعلان موجود تھا۔(۲۵)

احسان دانش اس مشاعرے میں خود شریک تھے۔ انہوں نے اس کا بیان کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی "جہانِ دانش" میں ایک عینی شاہد کے طور پر اس کو بیان کرکے لاہور کی ادبی فضا کا وہ حقیقی نقشہ کھینچا ہے جو ان مشاعروں سے تشکیل پاتا دکھائی دیتا ہے۔

قیام پاکستان سے قبل ہندوستان کے دیگر اہم ادبی مراکز کی طرح لاہور میں بھی مشاعروں کا خاصا مضبوط سلسلہ جاری تھا۔ ان مشاعروں میں شرکت کرنے والے شعرا نہ صرف لاہور بلکہ بیرون لاہور سے بھی تشریف لاتے تھے۔ طاہر لاہوری، لاہور کے بارے اپنی یادداشتوں "سوہنا شہر لاہور" میں قیام پاکستان سے قبل لاہور میں ہونے والے مشاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اردو مشاعرے لاہور میں خاص اہمیت رکھتے تھے، بڑے بڑے نامور شعراء ان محفلوں میں حصہ لیتے تھے۔ اس دور کے جتنے نامور شعراء

تھے لاہور میں ہی رہائش پذیر تھے۔ سی۔پی اور یو۔پی کا اپنا اپنا مکتبہ فکر تھا، اپنا اپنا اسلوب تھا، اپنا اپنا انداز تھا مگر پنجاب کے شعراء جو لاہور میں شعروادب کی دنیا سجائے ہوئے تھے، شہرت میں، اسلوب میں، بلندی فکر میں، اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔اس کے باوجود کہ پنجاب سے باہر کے شعراء بھی لاہور کے اردو مشاعروں میں حصہ لیتے تھے اس شہر کو سب سے بڑا اعزاز تو یہ حاصل ہے کہ اس صدی کا سب سے بڑا شاعر اس شہر کی ادبی اور شعری محفلوں کو منور کئے ہوئے تھا۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ سیالکوٹ کے آفتاب ومہتاب ہونے کے باوجود اقبالؒ لاہوری ہی تھے۔(۲۶)

طاہر لاہوری نے اپنی یادداشتوں کا ذکر کرتے ہوئے نہ صرف مشاعروں کا بیان کیا ہے بلکہ ان مشاعروں میں پیش کیے جانے والے کلام کے ادبی محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ یہ امر بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی شاعر مشاعرے میں اپنا وہ کلام پیش کرتا ہے جو اس کے نزدیک پورے کلام میں بہترین ہوتا ہے۔ لاہور میں جب ایک سے بڑھ کر ایک شاعر موجود تھا اور اقبالؒ بھی شعری اورادبی منظرنامے پر چھائے ہوئے تھے، ایسی صورت حال میں سامنے آنے والی شاعری ادبی محاسن کے حوالے سے اہم قرار پاتی ہے۔ مشاعروں میں پیش ہونے والی اسی شاعری نے آگے چل کر لاہور کی ادبی فضا کو متحرک رکھنے اور نئی جہتوں سے آشنا کروانے میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور کے ادبی منظرنامے میں جو مشاعرے منعقد ہوتے تھے، ان میں ایسے شعرا شامل ہوتے تھے جنھوں نے آگے چل کر اردو کے شعری منظرنامے کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے بڑی مہارت اور عرق ریزی سے ایک صدی قبل کے لاہور کے شعری منظرنامے کو آپ بیتی اور یادداشتوں میں محفوظ کیا ہے۔ مشاعروں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے تفصیل کے ساتھ ان شعرا سے بھی متعارف کروایا ہے جن کا کلام آج بھی

قابل قدر حیثیت کا حامل سمجھا جاتا ہے ۔ طاہر لاہوری اپنی یادداشتوں میں لاہور میں ہونے والے مشاعروں کی عکاسی یوں کرتے ہیں:

> مشاعروں کا جگہ جگہ اہتمام باقاعدگی سے ہوتا تھا۔ میلارام وفا، ہری چند اختر، مولانا عبدالمجید سالک، سید عابد علی عابد، بزرگ شاعر تاجور نجیب آبادی، احسان دانش، برج موہن تاتریا چڑیا کوٹی، فیض احمد فیض، چراغ حسن حسرت، صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، ایم ڈی تاثیر، حفیظ جالندھری ان مشاعروں کی جان ہوتے تھے، جگر اور جوش بھی لاہور آتے تو خاص شعری نشستیں منعقد ہوتی تھیں۔(۲۷)

طاہر لاہوری کے اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قیام پاکستان سے قبل مشاعرہ لاہور کی ادبی زندگی کا اہم حصہ بن چکا تھا۔ نہ صرف لاہور کے ادباء اور شعرا اس میں خاص دلچسپی رکھتے تھے بلکہ باہر کے علاقوں سے بھی جب کوئی ادبی شخصیت لاہور میں تشریف لاتی تو اس وقت بھی اس کے اکرام میں مشاعرے کا خصوصی اہتمام کیا جاتا تھا۔ ان مشاعروں نے لاہور کے ادبی منظرنامے میں بہت سی نئی شخصیات کو متعارف کروایا جنھوں نے آگے چل کر اردو ادب و تنقید پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری میں ان مشاعروں کے خصوصی تذکرے سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے ادبی منظرنامے میں ان مشاعروں کی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور ان سے پروان چڑھنے والی ادبی فضا کو سامنے لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے ادبی منظرنامے میں مشاعروں کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ لاہور کی ادبی تاریخ کا کوئی بھی تذکرہ ان مشاعروں کے بغیر مکمل دکھائی نہیں دیتا۔ وہ آپ بیتی نگار جنھوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا یا وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور میں آکر آباد ہوگئے تھے، وہ بھی ان مشاعروں کی اہمیت سے واقف تھے۔ ان کے نزدیک لاہور کے ادبی منظرنامے میں تحرک کا سبب یہی مشاعرے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کوئی نئی ادبی تنظیم وجود میں آتی ،اس کے زیر اہتمام

مشاعرے کا اہتمام لازمی کیا جاتا تھا۔ اردو آپ بیتی اور یاد نگاری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں پروان چڑھنے والی ادبی تنظیموں نے اپنے نظریات اورافکار کا پرچار خوب کیا لیکن مشاعروں کی اہمیت سے وہ بھی انکار نہ کر سکیں۔ قیام پاکستان سے قبل تو لاہور میں مشاعروں کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کے ادبی منظرنامے کا جائزہ لیں تو اس میں بھی مشاعرہ ایک اہم ادبی مظہر کی حیثیت اختیار کرتا دکھائی دیتا ہے۔

قیامِ پاکستان کے بعد بہت سے ادیب اور شعرا ایسے تھے جو ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آکر آباد ہو گئے تھے۔ لاہور ان دنوں بھی ایک اہم ادبی مرکز کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ سماجی اور ثقافتی حوالے سے بھی اس شہر کی حیثیت مسلمہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے ہجرت کا رختِ سفر باندھنے والے اکثر ادباء اور شعراء کی منزل لاہور ہی قرار پاتی تھی۔ یہاں آکر ان ادبا اور شعرا نے جب اپنی ادبی سرگرمیوں کا نئے سرے اجراء کیا تو مختلف ادبی تنظیمیں قائم ہوتی چلی گئیں۔ ان ادبی تنظیموں نے دیگر ادبی جہات کے ساتھ ساتھ مشاعروں کی طرف بھی خصوصی توجہ دی۔ اردو آپ بیتی اور یادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کر کے آنے والے ادبا اور شعرا نے ان مشاعروں کے ذریعے قیام پاکستان کے بعد لاہور کا ادبی منظر نامہ تشکیل دینے میں اہم کردار ادا کیا۔

قیامِ پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے ناصر کاظمی جیسے نامور شعرسے اگرچہ پاکستان کے ادبی منظرنامے کو جِلا ملی، مگر اس کے باوجود قیامِ پاکستان کے فوراً بعد لاہور کی کئی ادبی بیٹھکوں اور محفلوں کا حسن ماند پڑ گیا۔ پرانے مراکزِ ادب اپنی سابقہ چمک دمک برقرار نہ رکھ سکے، لیکن پاک ٹی ہاؤس ایک ایسا پلیٹ فارم بن کر سامنے آیا جس نے ان ہجرت کرنے والے شعرا و ادیبوں کو اپنی بانہوں میں جگہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ پاک ٹی ہاؤس بعد کے زمانوں میں ادبی سرگرمیوں کا اہم مرکز اور پاکستان کی فکری و تخلیقی زندگی کی پہچان بنا۔ اے حمید اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> قیام پاکستان کے بعد عرب ہوٹل کی محفلیں بھی بکھر گئیں۔ اس کے ساتھ ہی ادبی محفلوں کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ بزرگ صحافیوں نے اپنے

> پرَ سمیٹ لیے۔ ان کے پاس پرانی یادوں کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ تھا۔اب ان کی مجلسیں کافی ہاؤس، لارڈز اور میٹرو ہوٹل کے لان میں لگتیں جہاں بیٹھ کر وہ بڑی گرم جوشی سے بیتے دنوں کے قصے کہانیاں بیان کرتے۔ نوجوان اور سینیر صحافیوں کی جس نسل نے ان بزرگ صحافیوں کے زیر سایہ صحافت کا درس لیا تھا اس نے صحافت کی اعلی اقدار کی روایات کو آگے بڑھایا۔ دوسری طرف پاک ٹی ہاؤس میں پاکستانی ادب کے بانی ادیبوں، افسانہ نگاروں اور شاعروں نے شعر و ادب کی نئ شمع روشن کی۔(۲۸)

ادب تحرک کا حامل ہوتاہے۔جمود ادب کے لیے موت کادرجہ رکھتاہے۔جب تک ادب میں نئے نظریات وافکار اور نئے تصورات سامنے آتے رہتے ہیں اور ان تصورات اور نظریات وافکار کے تحت ادیب اور شعرا اپنی تخلیقی اور تنقیدی نگارشات پیش کرتے رہتے ہیں، اس وقت تک ادب ترقی کی منازل طے کرتا چلاجاتا ہے ۔ نئے نظریات وافکار اور تصورات کو ادب میں رائج کرنے اور پروان چڑھانے میں بنیادی کردار ادبی تنظیمیں ادا کرتی ہیں۔اردوادب کی تاریخ کاجائزہ لیاجائےتو بیسویں صدی میں اس کو ترقی دینے میں جن عناصر نے اہم کردار ادا کیا، اور نئے ادبی نظریات کواردو ادب تک پہنچانے اوران کے تحت ادب تخلیق کروانے میں جو عناصر ہراول دستہ کا کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں،ان میں ان ادبی تنظیموں کا شمار بھی ہوتاہے۔

ادبی تنظیم ایک خاص منشور کے تحت وجود میں آتی ہے۔ یہ منشور ہی اس تنظیم کے نظریات وافکار کی تشکیل کرنے اور اس کے تحت ادب کی تخلیق میں معاونت کرتاہے۔ لاہور کا ادبی منظرنامہ اس حوالے سے بھی اہمیت کا حامل ہے کہ یہاں سیاسی اور سماجی تنظیموں کے ظہور اور پروان چڑھنے کے ساتھ ساتھ ادبی تنظیموں کی تشکیل اور ترویج بھی ہوتی رہی ہے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشتوں کا مطالعہ

کرنے سے اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ لاہور میں ادبی تنظیموں کی داغ بیل بیسویں صدی عیسوی میں ہی پڑ چکی تھی جو ہر گزرتے دور کے ساتھ اپنے سلسلے کو مضبوط کرتی چلی گئیں۔

اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے جس ادبی منظر نامے کے نقشے اپنی تخلیقات میں کھینچے ہیں ، اس میں ان تنظیموں کی تشکیل اوران کے نظریات وافکار کا بیان بڑی صراحت سے ملتاہے۔ انہی آپ بیتیوں اور یادداشتوں سے لاہور میں ادبی تنظیموں کے آغاز کا بھی سراغ ملتاہے مرزا ادیب ترقی پسند ادبی تحریک کے متعلق اپنی رائے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ۱۹۳۶ء کا زمانہ ترقی پسند تحریک کا زمانہ ہے ۔۔۔ افراط و تفریط نے اسے واقعی ایک خواب پریشاں بنا دیاہے جہاں تک میری اپنی سوچ کا تعلق ہے میں اسے اردو کی ایک ہمہ گیر اور انقلابی تحریک سمجھتا ہوں مگر یہ عرض کر دوں کہ میرے ذہن میں اس کا مکمل تصور وہ نہیں ہے جسے انتہا پسندوں نے پیش کیاہے اور جسے میں تاریخی تناظر میں قرین حقیقت نہیں سمجھتا۔(۲۹)

انتظار حسین نے اپنی یادداشتوں میں انجمنِ ترقی پسند مصنفین کو محض ایک ادبی تحریک کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اسے القابات سے یاد کیاہے جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے ترقی پسند مصنفین دوسرے ادیبوں سے کس قدر مختلف شناخت رکھتے تھے۔ انتظار حسین لکھتے ہیں:

> یاروں نے ترقی پسند ادیبوں اور اشتراکی دانشوروں یا بائیں بازو والوں کے لیے ایک مشترکہ نام رکھ چھوڑا تھا۔ سرخا۔ تو اس کوچے میں صبح و شام وقت بے وقت رنگ رنگ کے سرخے اہلے گہلے پھرتے نظر آتے تھے۔ یہاں کے چائے خانے کچھ فلمی مخلوق کے دم سے کچھ اس سرخ مخلوق کے دم سے آباد تھے۔ چار قدم کے فاصلے پر دیال سنگھ لائبریری تھی جہاں ترقی پسند مصنفین کی ہفتہ وار مجلسیں ہوتی تھیں۔(۳۰)

اردو ادب میں جن ادبی تنظیموں نے خاص تحرک پیدا کیا اور اپنے نظریات وافکار کے ذریعے ادب کے دھارے کا رخ یکسر بدل کر رکھ دیا، ان تنظیموں میں ایک اہم نام "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا ہے۔ انجمن ترقی پسند کا شمار ایسی ادبی تنظیموں میں ہوتا ہے جو ادبی منظرنامے پر ظاہر ہوتے ہیں ہر طرف چھا گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پورے ادبی منظرنامے کو بدل کر رکھ دیا۔ لاہور کے ادبی منظرنامے میں بیسویں صدی میں تحرک اور تغیر پیدا کرنے والی تنظیموں میں انجمن ترقی پسند مصنفین کا کردار نمایاں ہے۔ اگرچہ اس تنظیم کے افکار و نظریات تنقید کی زد میں بھی رہے اور اس کے خلاف ادبی اور سیاسی محاذ بھی کھڑے ہوئے جنھوں نے اس کی ترویج کی راہ میں رکاوٹیں بھی پیدا کیں، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اس تنظیم نے اردو ادب و تنقید کو نئی جہتوں سے آشنا کروانے اور ادب کو نئی سمت عطا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

لاہور میں اس تنظیم نے جس طرح ادب کو متاثر کیا اور جس طرح مقبولیت حاصل کی، اردو آپ بیتی اور یادنگاروں نے اسے اپنی تخلیقات میں بڑے احسن انداز میں پیش کیا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل اس ادبی تنظیم اوراس کے تحت چلنے والے ترقی پسند تحریک کے عروج کے دور کا نقشہ کھینچتے ہوئے انتظار حسین اپنی یادداشتوں "چراغوں کا دھواں" میں لکھتے ہیں:

> شہر میں ترقی پسند کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ لاہور سے کراچی تک ان کا طوطی بول رہا تھا۔ ویسے بھی پورے برصغیر میں یہ زمانہ ترقی پسند تحریک کے عروج کا تھا۔ جو ترقی پسند نہیں تھے وہ بھی کسی نہ کسی طور ان سے اثر قبول کر رہے تھے۔ اگر کوئی مخالف بھی تھا تو اس کی مجال کہ ان کے مقابلے میں چوں کر جائے۔۔۔۔۔انجمن کے جلسے میں ہر پھر کر وہی بحث کہ ادب اور زندگی میں کیا رشتہ ہے۔ جلسہ کے ختم ہوتے ہی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جاتا۔ دو ٹوک فیصلہ کہ ادب زندگی اور زندگی ادب ہے۔ اور خود زندگی کیا ہے۔ سماجی معاملات اور اپنے وقت کے

سیاسی مسائل ۔جوادیب ان سے آنکھ چراتاہے ، وہ زندگی سے بھاگتاہے۔(۳۱)

انتظار حسین نے ترقی پسند تحریک کے عروج کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس تحریک کے نظریات وافکار کو بھی واضح کیاہے۔ ترقی پسندوں نے ادب اورزندگی کا نعرہ لگایا اور ادب کوزندگی کا ترجمان بنانے اور ادب میں زندگی کے مسائل کی پیش کش کو بنیادی نکتہ قرار دیا۔ آگے چل کر اس تحریک کے ان افکار پر خاصی تنقید بھی ہوئی، جس کی بڑی وجہ ان نظریات کے زیر اثر اس تحریک میں ادب کے ساتھ ساتھ سیاست کا عمل دخل بھی تھا۔ انتظار حسین کے اس بیان سے ظاہر ہو تاہے کہ ترقی پسندوں کے عروج کے دور میں ہر طرف اسی تحریک کا نعرہ گونجتا تھا۔ وہ دور یقیناً ترقی پسندیت کا دور تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف تو کہنہ مشق ترقی پسند اپنے نظریات وافکار کی ترویج بڑی شدومد سے کر رہے تھے تو دوسری طرف وہ ادیب جو ترقی پسندوں سے الگ نظریات کے حامل تھے وہ بھی کسی نہ کسی طور اس تحریک سے متاثر ہورہے تھے۔ گویایہ تحریک پھیلتی ہی چلی جارہی تھی۔ یہ قیام پاکستان سے قبل اردو ادب میں آنے والے ایک ایسی تحریک قرار دی جاسکتی ہے جس نے ادب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایسا مدوجزر پیدا کیا جس کے اثرات آج بھی اردو ادب پر واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ انتظار حسین ایک زیرک اور عمیق مشاہدے والی ادبی شخصیت تھے ۔ اپنے عہد میں انہوں نے مختلف ادبی تحریکوں اور تنظیموں کو پروان چڑھتے ، عروج حاصل کرتے اور زوال کی گھاٹیوں میں گرتے دیکھا۔ وہ ان تنظیموں اور تحریکوں کے چشم دید گواہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے نظریات اوران نظریات کے زیر اثر پروان چڑھنے والے ادب سے بھی گہری واقفیت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنی یادداشتوں میں جہاں بھی ترقی پسند اوردیگر ادبی تنظیموں کا تذکرہ کیاہے، وہاں ان کے ان نظریات کو بھی زیر بحث لائے ہیں، جن کے تحت یہ تحریکیں ابھری اور آگے بڑھتی چلی گئیں۔

اردو آپ بیتی اوریادداشتوں میں ترقی پسند تحریک اور اس کے اثرات کا تذکرہ دیگر کئی تخلیق کاروں نے بھی کیاہے۔ ترقی پسند تحریک چوں کہ ایک بڑی تحریک تھی اور اس کا آغاز بھی اس انداز سے

ہوا تھا کہ ہندوستان بھر میں اس کا ڈنکا بجنا شروع ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کے بارے میں لکھنے والے آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے بھی اسے خصوصی اہمیت دی ہے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس عہد میں جہاں ترقی پسند نظریات کے حامل افراد کی کثیر تعداد موجود تھی، وہاں ان نظریات سے اختلاف رکھنے والے ادیب بھی موجود تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی قابل ذکر ہیں جنھوں نے اس تحریک کے زیر اثر ادبی فضا کو مختلف حوالوں سے دیکھااور اس کے اثرات کا تجزیہ کیا ہے۔ طاہر لاہوری نے لاہور کے بارے میں اپنی یادداشتوں " سوہنا شہر لاہور" میں بیسویں صدی میں پروان چڑھنے والی ادبی تنظیموں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس حقیقت کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے کہ ان تحریکوں کے زیر اثر لاہور کی ادبی فضا میں خاصا تحرک پیدا ہوا تھا۔ یہ تحرک اس نوعیت کا تھا اس نے بنے بنائے ادبی سانچوں کو بھی متاثر کیا۔ اس کے اثرات اس قدر تیزی سے پڑے کہ دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کی ادبی فضا دو واضح دھڑوں میں تقسیم ہوتی چلی گئی۔ وہ ترقی پسند کے آغاز کے دنوں کا نقشہ کھینچتے ہوئے اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں:

> ترقی پسندی کی وباء ابھی پھیل ہی رہی تھی۔ شاعروں میں دو دھڑے سے بن گئے۔ ایک پرانے روایتی شاعر، دوسرے ترقی پسند شاعر، ان میں نوجوان شاعر زیادہ تھے۔ اس دھڑے میں مذہب سے کچھ فرار سا تھا اور معاشرے میں دولت کی تقسیم میں لوٹ کھسوٹ اوراقتصادی ناہمواری کے خلاف ایک محاذ قائم ہوگیا۔ بظاہر تو یہی نعرہ تھا لیکن درپردہ بین الاقوامی سطح پر دو نظاموں کے تصادم کا شاخسانہ تھا۔ مارکس ازم، سوشلزم، کمیونزم ایک دھڑا تھا دوسری جانب سرمایہ دارانہ نظام تھا۔(۳۲)

طاہر لاہوری کی یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے اثرات کو مختلف زاویوں سے دیکھا ہے۔ یہ زاویے صرف قومی نوعیت کے نہیں بلکہ اس عہد

میں جب ترقی پسند ادب ترویج پا رہا تھا ، اس کے نظریات کو وہ عالمی منظر نامے کے ساتھ جوڑ کر دیکھتے ہیں۔ عالمی سطح پر اس وقت تک دنیا دو واضح حصوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک طرف سرمایہ دارانہ ذہنیت فروغ پا رہی تھی جو مزدور طبقے اور کمزور طبقے کے معاشی استحصال کا باعث بن رہی تھی تو دوسری طرف کمیونزم، سوشلزم اور مارکسزم کا رجحان بھی بڑھ رہا تھا۔ بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں آنے والے روسی انقلاب نے دنیا کے محنت کشوں اور مزدوروں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کہ سرمایہ دارانہ ذہنیت کے خلاف بند باندھنا اور اس کے خلاف توانا مزاحمت ناممکن نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے بیشتر خطوں میں اس سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کے خلاف آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ ترقی پسند تحریک نے جب لاہور میں اپنے نظریات وافکار کا پرچار کیا تو یہاں بھی ایسی ہی صورت حال سامنے آئی۔ نوجوان طبقہ سوشلزم، مارکسز اور کمیونزم کا حامی تھا اور اپنے حق کے لیے ہر ذریعہ اختیار کرنے کو تیار تھا جب کہ دوسری طرف سرمایہ دارانہ ذہنیت بھی موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند کو شروع میں سب سے زیادہ توانائیاں نوجوان ادیبوں کی میسر آئیں۔ اس طبقے نے معاشرے میں لوٹ کھسوٹ اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کے خلاف علم بلند کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے مقبولیت حاصل کرتے چلے گئے۔ ادب میں ان نظریات وافکار کی ترویج ترقی پسند شاعری اور افسانے میں بڑی شدومد سے ہونے لگی۔

ترقی پسند تحریک ایک بڑی تحریک تھی۔ اس نے اپنے دور میں بہت کامیابیاں بھی سمیٹیں جس کی وجہ سے ادبا کی کثیر تعداد اس سے منسلک ہو گئی تھی۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ اس دور میں لکھنے پڑھنے والے لوگوں کی اکثریت اس سے وابستہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے اجلاس بھی باقاعدگی سے ہو رہے تھے اور اس کے تحت کانفرنسیں بھی منعقد ہوتی تھیں، جن میں ادبا بڑے جوش سے شرکت بھی کرتے تھے۔ نثار عزیز بٹ کا شمار بھی اردو کے نامور ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی آپ بیتی "گئے دنوں کا سراغ" میں لاہور میں ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں اور خاص طور پر اس کے تحت ہونے والے کانفرنس کا حال بڑی عمدگی سے لکھا ہے۔ انھوں نے خود بھی ان کانفرنسوں میں شرکت کی تھی، یوں وہ ایک چشم دید گواہ کے طور پر سامنے

آتی ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں لاہور میں ہونے والی ترقی پسند تحریک کی کانفرنس کا ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

> لاہور، لاہور ہےً ٦۵۔ بی میں منتقل ہوئے ہفتہ دس دن ہی ہوئے ہوں گے کہ صفورا اور آذر ذوبی مجھے لینے آ گئے۔ آذر نے اپنا سٹوڈیو، بیڈن روڈ والے اپنے مکان سے، لارنس باغ کے اوپن ائیر تھیٹر کے عقب میں منتقل کر لیا تھا اور اوپن ائیر تھیٹر میں ترقی پسند مصنفین کی سالانہ کانفرنس ہو رہی تھی۔ وہ دونوں چاہتے تھے کہ میں بھی اس کانفرنس میں شریک ہوں۔۔۔ سوموار ١٦ اکتوبر ۱۹۶۹ء، جمعے کی سہ پہر میں آرام کرنے کے لیے لیٹی تھی۔ کہ تین بجے آذر، ذوبی اور صفورا مجھے لینے آ گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس اسی روز شروع ہوئی تھی۔۔۔ آذر نے کئی ترقی پسند مصنفین کے مجسمے بنائے ہیں۔ جو وہاں موجود تھے، مثلاً، احمد ندیم قاسمی، سعادت حسن منٹو اور ظہیر کاشمیری کے مجسمے میں نے دیکھے ہیں۔۔۔ احمد ندیم قاسمی کی صدارت تھی۔ خدیجہ مستور نے تقریر کی۔ چند اور ادیب بھی چلتے پھرتے نظر آئے۔ اے حمید، عبداللہ ملک، محمد صفدر، مرزا ادیب۔۔۔(۳۳)

ترقی پسند نظریات کے پرچار کا جو خواب سجاد ظہیر نے لندن میں دیکھا تھا اس کو صحیح معنوں میں تعبیر لاہور نے ہی عطا کی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لاہور اُس دور میں بھی ادب کا ایک ایسا مرکز قرار پا چکا تھا جہاں سے اٹھنے والی ہر تحریک پورے ہندوستان کو متاثر کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور میں ترقی پسند تحریک نے گہرے اثرات مرتب کیے۔ لاہور کے بارے میں لکھنے والے وہ ادبا جنہوں نے اپنی زندگیاں لاہور میں گزاری ہیں، ان کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اس تحریک کا ذکر بڑی جامعیت کے ساتھ ملتا ہے۔ بعض تخلیق کاروں نے اس تحریک کی اٹھان اور عروج کا ذکر کیا ہے تو

بعض نے اس سے وابستہ عہدیداران اور دیگر ادبی شخصیات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔یوں لاہور میں ترقی پسند تحریک کا ایک پورا نقشہ ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں سامنے آتا ہے۔ طاہر لاہوری کی لاہور کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں پر مبنی کتاب" سوہنا شہر لاہور" میں جہاں لاہور کے دیگر بہت سے سماجی، سیاسی اور ادبی عناصر کی جھلک ملتی ہے وہاں، انہوں نے اس تحریک اوراس سے وابستہ افراد کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ وہ لاہور میں اس تحریک کے اس عہد کا ذکر کرتے ہیں جب احمد ندیم قاسمی اور دیگر نوجوان نسل کے ذریعے لاہور میں یہ تحریک پروان چڑھ رہی تھی۔ طاہر لاہوری اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور میں محترم احمد ندیم قاسمی ترقی پسند تحریک کے اہم نمائندے تھے۔ نوجوان شاعروں کی ایک لمبی فہرست ہے، البتہ فیض احمد فیض روسی نظریات کی نمائندگی کرتے تھے، بڑے شاعر تھے اورآخری دم تک اپنے نظریات پر قائم رہے۔ البتہ دوسرے ترقی پسند شاعروں میں کھچاؤ پیدا ہوتا رہا، اختلافات ہوتے رہے مگر یہ حقیقت ہے کہ ان لوگوں نے بھی شاعری اورادب کو خوب صورت اسلوب دیا۔(۳۴)

طاہر لاہوری کی یادداشت نگاری کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدارانہ انداز میں صورتحال کو سامنے لاتے ہیں۔لاہور کے مختلف عناصر کے ساتھ ساتھ ادبی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے اس غیر جانبداری کو برقرار رکھا ہے۔ وہ صورت حال کا تجزیہ کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی لکھی ہوئی یادداشتوں میں لاہور اپنے تمام خدوخال کے ساتھ سامنے آتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے بھی انہوں نے ترقی پسندوں کے نظریات پر بحث کی ہے او ر اس حقیقت کو بھی سامنے لائے ہیں کہ ایک تحریک سے وابستہ ہونے کے باوجود ان میں بھی اختلاف رائے پایا جاتا تھا۔ دوسری طرف وہ اس تحریک کے مثبت پہلوؤں کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس تحریک نے ادب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں ایک ایسا ارتعاش پیدا کیا تھا جو آگے چل کر بڑے تحرک کا سبب

بنا۔ یہ تحرک ادب میں فکری اور موضوعاتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فن اوراسلوب کی سطح پر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ طاہر لاہوری کی اس رائے کا جائزہ لیاجائے تو یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ادب کا فکری اور موضوعاتی منظر نامہ بدلنے سے کسی حد تک اس کے فنی اوراسلوبیاتی خصائص میں بھی تبدیلی پیدا ہوتی ہے۔ کیوں کہ ہر موضوع اپنے اظہار کے لیے بھی ایک خاص طرزِ ادا کا متقاضی ہوتا ہے۔ ترقی پسندوں نے جب ادب کو زندگی کے قریب کیا اور سوشلزم اور مارکسزم سے متاثرہ خیالات اور نظریات کو ترویج دی تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس فکری تبدیلی نے فنی اوراسلوبیاتی جہات کو بھی بدلنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی پسند ادب صرف فکری اور موضوعاتی حوالے سے ہی تغیر کا سبب نہیں بنا تھا بلکہ فنی اوراسلوبیاتی حوالے سے بھی ادب میں تبدیلیاں پیدا ہوئی تھیں۔

ترقی پسند تحریک نے بہت کم وقت میں بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اثرات ادبی دنیا پر گہرے ہوتے جا رہے تھے اور یہ تحریک عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لیکن اس تحریک کی سیاسی سرگرمیوں اور دیگر کئی عناصر کی وجہ سے اس پر عتاب نازل ہونا بھی شروع ہو چکا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس تحریک پر سیاسی سطح پر شکنجہ کستا چلا گیا اور اس تحریک سے وابستہ افراد کو قید وبند کی صعوبتوں سے بھی گزرنا پڑا۔ اسی دوران میں راولپنڈی سازش کیس نے فیض احمد فیض سمیت دیگر کئی ترقی پسندوں کو پابند سلاسل بھی کر دیا۔ یہ وہ دور تھا جب ترقی پسندوں پر زوال آیا۔ اس زوال نے بھی اس تحریک کو خاص متاثر کیا اور جس طرح اس تحریک کا پہلا شاہکار "انگارے" حکومتی عتاب کا نشانہ بنا تھا اسی طرح یہ تحریک بھی کمزور پڑتی چلی گئی۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اس تحریک کے عروج کے ساتھ ساتھ اس کے زوال کا بیان بھی ملتا ہے۔ وہ ادیب جنھوں نے اس زوال کا مشاہدہ کیا تھا، ان میں ایک اہم نام انتظار حسین کا ہے۔ انتظار حسین اگرچہ نظریاتی طور پر اس تحریک سے وابستہ نہیں تھے، لیکن انہوں نے اپنی زندگی لاہور میں اس عہد میں گزاری جس عہد میں یہ تحریک عروج سے زوال کی طرف چل نکلی۔ انہوں نے اس تحریک کے عروج کی طرح اس کے زوال کا مشاہدہ بھی خود کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی یادداشتوں میں ہمیں اس تحریک اوراس سے وابستہ فکرو

نظریات کے زوال کی عکاسی بھی ملتی ہے۔ فیض احمد فیض کی پنڈی سازش کیس میں گرفتاری کے بعد یہ تحریک جس صورت حال سے دوچار ہوئی اس کی عکاسی کرتے ہوئے انتظار حسین اپنی یادداشتوں " چراغوں کا دھواں " میں لکھتے ہیں:

> انجمن ترقی پسند مصنفین برباد، میکلوڈ روڈ ویران۔ فیض صاحب ہنوز جیل میں ہیں۔ وہ پنڈی سازش کیس کے بڑے ملزموں میں شامل کیے گئے ہیں۔ جو ادیب اس ریلے میں پکڑے گئے ہیں، وہ چھوٹ تو گئے ہیں مگر خاموش ہیں۔ جن ادیبوں نے ترقی پسند نظریئے کے خلاف علم بلند کیا تھا ان کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی۔ ڈاکٹر تاثیر دنیا سے کوچ کر گئے۔ عسکری صاحب نے کراچی کی راہ لی۔ پہلے والا جوش و خروش غائب ہے۔ اب انہیں ادب میں جمود نظر آتا ہے۔ ترقی پسند جو میدان میں نہیں ہیں کس سے لڑیں۔ پھر ادب میں جمود تو نظر آنا ہی تھا۔ (۳۵)

انتظار حسین نے ترقی پسندوں کے ساتھ ساتھ ترقی پسند نظریات کے مخالفین کی صورت حال کی بھی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے اس دور کا نقشہ کھینچا ہے جب ملک میں کسی قدر آمریت کا راج تھا۔ زبان و بیان کی پابندیوں کی وجہ سے ادیبوں کی خاص نگرانی بھی کی جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے اس دور میں جہاں ترقی پسند حکومتی عتاب کے ماتحت آچکے تھے وہاں اس کے مخالفین بھی چپ سادھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ بعض اہم ادیب منظر عام سے ہٹ چکے تھے اور گوشہ نشینی اختیار کر چکے تھے۔ ایسی صورت حال میں نظریات کیسے پنپ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ دور ادب میں فکری اور موضوعاتی حوالے سے جمود کا شکار دور دکھائی دیتا ہے۔ انتظار حسین نے اپنی یادداشتوں میں لاہور کی فضا میں ادبی حوالے سے جمود کا نقشہ بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ انتظار حسین کا بڑا وصف یہ ہے کہ وہ ادبی صورت حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے ان اسباب اور محرکات کو بھی سامنے لاتے ہیں جو اس صورت حال کا باعث بنتے ہیں۔ یہاں بھی وہ لاہور کی ادبی فضا میں جمود کی صورت حال کو بیان کرتے ہوئے ترقی پسندوں پر عائد ہونے والی حکومتی

پابندیوں اور ترقی پسند نظریات کے مخالفین کے چپ سادھ جانے کو ادب میں جمود کی وجہ قرار دیتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور کے ادبی منظر نامے کے حوالے سے ان کا مشاہدہ خاصا گہرائی اور گیرائی کا حامل تھا۔ انہوں نے ادب سے وابستہ افراد کے مسائل کو بھی سامنے رکھا ہے اور ان کے بارے میں ارباب اقتدار کے رویوں کو بھی پیش نظر رکھا ہے۔ اس تمام صورت حال کا تجزیہ وہ بڑی جرأت اور غیر جانبداری سے کرتے ہیں۔

لاہور کی ادبی فضا میں کچھ ایسے ادیب بھی موجود تھے جو یہ چاہتے تھے کہ روایت کے بوجھ سے نکل کر ادب کو ایک نئی اور جدید سمت عطا کی جائے۔ لاہور کے چند نوجوان اہلِ قلم نے یہ طے کیا کہ ادب کو ماضی کے سانچوں میں جکڑنے کے بجائے مستقبل کے تقاضوں کے مطابق ڈھالا جائے۔ انہی رجحانات کے تحت ایک ادبی تنظیم "نئی پود" کے نام سے وجود میں آئی جس کا مقصد روایت شکنی اور عصری حسیت کو ادب میں جگہ دینا تھا۔ اس حوالے سے شہرت بخاری اپنی آپ بیتی میں ذکر کرتے ہیں:

> ایک وقت ایسا آیا کہ لاہور کے بعض ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں نے "نئی پود" کی ایک تحریک چلانے کی کوشش کی۔ ناصر کاظمی ایک طرح سے اس کا ترجمان تھا۔ ۔۔۔۔اس تحریک کا آغاز یوں ہوا تھا کہ نوجوان نسل نے اپنے راستے میں بعض رکاوٹیں محسوس کر کے فیصلہ کیا کہ جتنے بزرگ ادیب اور شاعر اس وقت موجود ہیں خواہ ابو الاثر حفیظ جالندھری کی نسل سے تعلق رکھتے ہوں خواہ قیوم نظر اور یوسف نظر کی نسل سے، ان کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جائے۔ (۳۶)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے ساتھ لاہور میں دیگر کئی اور ادبی تنظیمیں بھی قائم ہوئیں جو اپنے عہد میں اپنے نظریات وافکار کے ذریعے ادبی فضا کو متحرک کرنے کا باعث بنیں۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تنظیموں کی وجہ سے لاہور کی ادبی فضا میں

خاصی ہلچل رہی اور نئے ادبا کو اپنی تخلیقی اور تنقیدی نگارشات پیش کرنے کے لیے پلیٹ فارم ملتے رہے ۔یہی وجہ ہے کہ لاہور کا ادبی منظر نامہ ہر دور میں عروج کو بڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

لاہور کی ادبی تنظیموں میں ایک اہم تنظیم "فکشن فرینڈز " کے نام سے بھی سامنے آئی۔ اس تنظیم کے روح رواں مستنصر حسین تارڑ تھے۔ مستنصر حسین تارڑ اپنی یادداشتوں "لاہور آوارگی" میں لاہور کی ادبی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے اس تنظیم کے بارے میں لکھتے ہیں:

> انہی زمانوں میں، میں نے چند ہم خیال نثر نگاروں کے تعاون سے "فکشن فرینڈز" کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی داغ بیل ڈالی۔ اس کا منشور بہت سادہ سا تھا کہ یہاں شاعری شجر ممنوعہ تھی، ہم کسی بھی گھر میں اکٹھے ہوں گے، ناول اور افسانے کے بارے میں بات کریں گے اور کسی ایک تازہ ترین ناول کے بارے میں تنقیدی گفتگو کریں گے۔(۳۷)

ان مختلف تنظیموں کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کے ادبی منظر نامے پر ترقی پسند تحریک کے عروج کے دنوں میں بھی کئی دیگر تنظیمیں فعال تھیں۔ ان تنظیموں کے اجلاس بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتے تھے اور ان سے وابستہ شخصیات بھی اردو ادب کی اہم شخصیات تھیں۔ آپ بیتی نگاروں اور یاد نگاروں نے ان ادبی شخصیات تنظیموں کا تذکرہ کر کے لاہور کے ادبی منظر نامے کو حقیقی انداز میں سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

حلقہ ارباب ذوق کا شمار ان ادبی تنظیموں میں ہوتا ہے جنھوں نے ترقی پسند تحریک کی طرح نہ صرف عوام میں مقبولیت حاصل کی بلکہ اس کے نظریات وافکار نے ادبی منظر نامے کو متاثر کرنے اور ادبی کو نئی جہتوں سے آشنائی دلانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ بیسویں صدی کی یہ ایسی ادبی تنظیم ہے جو تقریباپون صدی کا عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی نہ صرف لاہور میں پوری آب وتاب کے ساتھ قائم ہے بلکہ اب پاکستان کے دیگر بہت سے شہروں میں بھی اس کی شاخیں قائم ہو چکی ہیں۔ اس کے اجلاس اب بھی باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں، جن میں نو آموز ادبا کی تخلیقات پر تنقیدی بحث کی جاتی

ہے۔ حلقہ ارباب ذوق کی خوش قسمتی یہ ہے کہ اس کو شروع ہی سے ایسے ناقدین اور ادیب میسر آ گئے تھے جو ادب کی تفہیم کے ساتھ ساتھ اس کے اغراض و مقاصد سے بھی آگاہی رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس ادبی تنظیم کے پلیٹ فارم سے بہت سی ادبی شخصیات سامنے آئیں جنھوں نے آگے چل کر اردو ادب کو شعری، نثری اور تنقیدی حوالے سے اہم سرمایہ فراہم کیا۔

حلقہ ارباب ذوق جب لاہور میں قائم ہوا تو اس تنظیم کا پہلا نام بزم داستاں گویاں تھا۔ شروع میں اس کی سرگرمیاں محدود تھیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس بزم میں ہونے والی بحثیں عموماً بے نتیجہ ہی رہتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ادبا کے نزدیک یہ ایک لاحاصل تنظیم کا درجہ رکھتی تھی لیکن یہ خیالات اس تنظیم کے شروع کے حالات کے حوالے سے سامنے آئے تھے۔ آگے چل کر اس تنظیم نے ادبی دنیا میں بہت ناموری کمائی۔ انتظار حسین اپنی یادداشتوں میں حلقہ ارباب ذوق کے ابتدائی دنوں کے حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> اس شہر میں ادب کا ایک کھونٹا اور بھی تھا۔ حلقۂ ارباب ذوق۔ اتوار کی اتوار وائے ایم سی اے کے بورڈ روم میں اس کی نشست سجتی۔ مگر اس کا رنگ انجمن کی نشست سے کتنا مختلف ہوتا تھا۔۔۔حلقہ میں جو سوال اٹھتے وہ طے ہونے ہی میں نہ آتے۔ نظم پڑھی جاتی تو سوال اٹھ کھڑا ہوتا کہ شاعری کیا ہوتی ہے ۔ڈرامہ پڑھا جاتا تو پوچھا جاتا کہ ڈرامہ کیا ہوتا ہے۔ اصغر بٹ یہاں ڈرامے کے ایکسپرٹ کے طور پر بیٹھے نظر آتے۔ فوراً بتانا شروع کر دیتے کہ ڈرامہ طریقہ یہی تھا کہ دریا گنج سے بیٹھے اور بارہ کھمبے اتر گئے۔ وہاں سے پیدل ریڈیو کی طرف ۔تو عسکری صاحب اس تانگہ میں بیٹھ گئے۔ دیکھا کیا ہوتا ہے۔ کبھی یہ بحث شروع ہو جاتی کہ غزل کی تعریف کیا ہے۔ جتنی بحث ہوتی اتنا مسئلہ الجھتا جاتا۔ جلسہ ختم ہو جاتا اور مسئلہ جوں کا توں رہتا۔(۳۸)

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ادبی حوالے سے مشہور اور اہم تنظیموں میں سے اکثریت کا قیام لاہور میں ہی عمل میں آیا۔ لاہور نے ہی ان تنظیموں کو سینچا اور ان تنظیموں کو پروان چڑھایا۔ حلقہ ارباب ذوق کے بارے میں بھی لاہور نے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا اور اس تنظیم کو بھی وہ خون میسر آیا جس نے آگے چل کر اسے ایک زندہ جاوید تنظیم کا درجہ دے دیا۔ انتظار حسین نے اپنے بیان لاہور میں حلقہ ارباب ذوق کے ادیبوں کی شرکت اور پھر ان کے بحث مباحثے کے انداز کو بڑی جامعیت سے واضح کیا ہے۔ انتظار حسین کی یادداشتوں "چراغوں کا دھواں" کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظار حسین نے حلقہ کے ارتقائی سفر کو بڑے قریب سے دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ آگے چل کر اس کو اہم تنظیم کا درجہ دیتے ہیں۔ اور اس میں شرکت کرنے والوں کی ادبی حیثیت اور ادبی مقام و مرتبے کے قائل دکھائی دیتے ہیں۔ پاک ٹی ہاؤس جو شروع ہی سے ادیبوں کا اہم ٹھکانہ چلا آرہا تھا، اس نے بھی اس حلقے کو شہرت کی بلندیوں پر لے جانے میں اہم کردار ادا کیا۔ انتظار حسین "چراغوں کا دھواں" حلقہ ارباب ذوق اور پاک ٹی ہاؤس کے بارے میں لکھتے ہیں:

> گورنمنٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی سے قرب اپنی جگہ مگر زیادہ فیض اس (پاک ٹی ہاؤس) نے حلقہ ٔارباب ذوق سے حاصل کیا۔ اتوار کی اتوار حلقہ کا جلسہ وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں۔ اس کے بعد چندے کی چائے ٹی ہاؤس میں۔ قیوم نظر، شیر محمد اختر، انجم رومانی، شہرت بخاری، ریاض احمد، اعجاز حسین بٹالوی، ضیا جالندھری، امجد الطاف۔ کیا کیا دانہ حلقہ کی محفل سے اٹھ کر آتا اور یہاں چائے کی میز پر آکر پھر سے رواں ہو جاتا۔(۳۹)

انتظار حسین نے پاک ٹی ہاؤس پر آنے والے حلقے کے ادبا کا بیان کرتے ہوئے، اس حقیقت کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے یہ لوگ ادبی بحث کے رسیا تھے۔ کچھ حلقے کے مزاج اور کچھ ان لوگوں کے طبع کی وجہ سے حلقے کا اجلاس ختم ہونے کے بعد بھی یہ بحث کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ لاہور کے

ادبی منظر نامے کو دیکھا جائے تو اگرچہ قیام پاکستان سے قبل بھی ترقی پسند تحریک کی وجہ سے لاہور ادبی حوالے سے خاصا متحرک تھا تاہم قیام پاکستان کے بعد حلقہ ارباب ذوق کی وجہ سے لاہور نے ادبی حوالے سے ترقی کی منازل بڑی سرعت سے طے کرنا شروع کیں۔ حلقے سے وہ لوگ وابستہ ہوئے تھے جو اپنی مستحکم ادبی شناخت کے حامل ہونے کے ساتھ ساتھ ادب کے بارے میں واضح نظریات بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے حلقہ ارباب ذوق کو ان نظریات کی ترویج کا ذریعہ بنایا۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کا سب سے بڑا وصف اس کے اجلاسوں اور محفلوں میں ہونے والی باقاعدگی ہے۔ اس تواتر اور باقاعدگی نے لاہور کے ادبی منظر نامے میں نہ صرف حلقہ ارباب ذوق کو مستحکم کیا بلکہ اس کے نظریات وافکار کو بھی اہم گردانا گیا۔ حلقہ ارباب ذوق کی اسی ادبی حیثیت اوراہمیت کی وجہ سے ہی اردو آپ بیتی نگاروں اور یاد نگاروں نے بڑی وضاحت سے اس کے قیام، نظریات وافکار، اس سے وابستہ ادبی اور تنقیدی شخصیات اور اس کے ادب و تنقید پر پڑنے والے اثرات کا بیان کیا ہے۔ اردو آپ بیتیوں میں یہ ایک ایسی تنظیم ہے جس کے بارے میں سب سے زیادہ لکھا گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے بھی کہ ترقی پسند تحریک کو زوال آنے اور پابندی لگنے کے بعد حلقہ نے لاہور کے ادبی منظر نامے کو سمت عطا کی اور اسے متحرک رکھا۔ اس وقت کے لکھنے والوں ادیبوں، شاعروں اور ناقدین کو اپنی نگارشات پیش کرنے کے لیے ایک مرکز عطا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس سے وابستہ ادبی شخصیات نے اس کی ترویج واشاعت میں بنیادی کردار ادا کیا۔ حبیب جالب اور ان کے ساتھ دوسرے ادبا حلقے سے الگ ہو گئے اور انہوں نے یہ اعلان کیا کہ اصلی حلقہ ارباب ذوق تو ہم ہیں اس کے مقابلے میں ایک اور حلقہ بنا جو حلقہ ارباب ذوق ادبی کہلایا۔ اس حلقے کی کاروائیوں کا ذکر کرتے ہوئے انتظار حسین اس طرح لکھتے ہیں:

> اور لیجیے اب حلقہ ارباب ذوق ادبی کی نشستیں ٹی ہاؤس کی بالائی منزل میں شروع ہو گئیں۔ کچھ پرانے حلقئی جیسے شہرت بخاری، انجم رومانی، سلیم شاہد، کچھ نو وارد چہرے۔۔۔ ان میں سب سے نمایاں سہیل احمد

خاں تھے۔ اس نووارد کے ادبی جوہر اب کھلنے لگے تھے تنقید میں بھی اور شاعری میں بھی۔ پھر اس نے اس حلقہ کا انتظام سنبھالا۔(۴۰)

حلقۂ اربابِ ذوق اور دیگر ادبی تنظیموں کے منشور میں بنیادی فرق یہ تھا کہ ترقی پسند تحریک نے ادب کو انصاف، مساوات، سماجی برابری اور عوامی زندگی کی ترجمانی کرنے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی، جب کہ حلقۂ اربابِ ذوق نے ادب کو فن برائے فن کے زاویے سے دیکھتے ہوئے فرد کی داخلی کیفیات اور فنی اظہار پر زیادہ زور دیا۔ تاہم دونوں کے مابین یہ مماثلت ضرور تھی کہ دونوں تحریکیں ادب کو جمود اور روایت پرستی سے نکال کر نئی جہتوں سے روشناس کرانا چاہتی تھیں اور جدید حسیت کو جگہ دینے پر متفق تھیں۔ چنانچہ شہرت بخاری نے بھی اس کو بیان کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھا ہے :

> ترقی پسند اور جدید ادب کی متضاد تحریکوں میں جو باتیں مشترک تھیں ان میں سے ایک غزل کی مخالفت تھی۔ غزل کو جاگیرداری عہد کی یادگار اور قدامت پرستی کی علامت سمجھا جاتا تھا۔۔۔حفیظ ہوشیار پوری حلقہ ارباب ذوق کے بانیوں میں سے ایک تھے۔ اپنے عہد کے بہترین غزل گو شاعروں میں شمار ہوتے رہے ہیں مگر وہ حلقے میں غزل نہیں پڑھتے تھے یوسف ظفر کی ابتدا غزل سے ہوئی اس نے لاتعداد غزلیں کہہ کہہ کر ضائع کر دیں اس لیے کہ وہ خود کو غزل گو کہلانا پسند نہیں کرتا تھا۔(۴۱)

شہرت بخاری نے اپنی آپ بیتی میں اس امر کا ذکر کیا ہے کہ انہوں نے غزل کو شعوری طور پر ترک کر کے نظم کی طرف توجہ دی، اور یہ رویہ اس زمانے کے ادبا کی بدلتی ہوئی سوچ کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس دور میں غزل کو ایک محدود اور روایتی قالب سمجھا جانے لگا تھا جو زیادہ تر عشقیہ مضامین تک محدود تھی، جب کہ نظم کو ایک زیادہ وسیع اور مؤثر ذریعہ اظہار مانا جا رہا تھا، جس میں سماجی، معاشرتی اور

قومی مسائل کو زیادہ بہتر طور پر پیش کیا جا سکتا تھا۔ لہٰذا نظم کی ترویج دراصل اس بات کی علامت تھی کہ ادبا ادب کو نئے تقاضوں اور بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کرنے کے خواہاں تھے۔

حلقہ ارباب ذوق ایک متحرک اور فعال ادبی تنظیم ہے۔ اس سے بہت سے لوگ وابستہ رہے۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے قیوم نظر اور بعض دوسرے لوگ بھی اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے منفی سرگرمیوں میں بھی ملوث رہے۔ اردو آپ بیتیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو بہ نفسِ نفیس حلقہ کے اجلاسوں میں نہ صرف شرکت کرتے تھے، بلکہ تنقیدی بحث میں بھی شریک ہوتے تھے، وہ حلقہ سے وابستہ مختلف شخصیات کے باطن سے بھی واقف تھے اور انہیں آپ بیتیوں میں بیان کرنے میں کسی تساہل سے کام نہیں لیا۔ انیس ناگی اردو ادب و تنقید کا اہم نام ہے۔ وہ دور جب قیوم نظر حلقہ ارباب ذوق پر چھائے ہوئے تھے، اس دور میں انیس ناگی اور دیگر کئی نوجوان ادیب اور شاعر بھی حلقہ سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان نئے ادبا، شعرا اور ناقدین کی آمد قیوم نظر جیسے افراد کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی اس لیے انہوں نے مزاحمتی انداز بھی اختیار کیا۔ انیس ناگی اپنی آپ بیتی میں اس صورت حال کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جب انہوں (قیوم نظر) نے دیکھا کہ میری شاعری اور جارحانہ تنقید ان کی پریشانی کا باعث بن رہی اور نئے شعرا کی نسل حلقہ اربابِ ذق میں ان کا تختہ الٹنے کی تیاری میں ہے تو شعرا کو میدان سے بھگانے کے لیے انہوں نے خفیہ پولیس سے رابطہ کیا۔ اس زمانے میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ خفیہ پولیس کے لیے کام کرتے تھے۔ ادھر قدرت اللہ شہاب ایوب خان کی خوشنودی کے لیے ادیبوں کو Rope کرنے کے لیے رائٹر گلڈ کی کھیر پکا رہے تھے۔ قیوم نظر اپنے سوا ہر ایک ادیب کے خلاف تھے، اور منٹو کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ (۴۲)

انیس ناگی کی آپ بیتی میں بیان کردہ اس صورت حال سے واضح ہوتا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کے ادیبوں میں بھی خاصی چپقلش پائی جاتی تھی۔ اس چپقلش کی بنیادی وجہ لاہور میں حلقہ ارباب ذوق پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنا تھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسا رویہ عموماً پرانے ادیبوں کی طرف سے سامنے آتا تھا جب کہ نو آموز ادبا اور ناقدین اپنی تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے حلقہ کے اجلاسوں میں شرکت کرتے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان نئے ناقدین اورادبا کی تنقیدی اور تخلیقی نگارشات بنیادی طور پر ادب کے ان پہلوؤں کو سامنے لاتی تھیں جن تک قیوم نظر جیسے ادبا کی رسائی نہیں تھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ اپنے مطالعے کو بڑھاتے اور بدلتے ہوئے ادبی نظریات وافکار کی تفہیم میں اپنی صلاحتیوں کا استعمال کرتے ہوئے ادب کو نئے زاویوں سے جانچنے کی کوشش کرتے لیکن انہوں نے شخصی مخالف کارکا روپ دھار لیا۔ اس رویے نے نئے ادیبوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کیا۔ اور انہی نئے ادیبوں اور ناقدین نے جب اپنی آپ بیتیاں تحریر کیں تو ان ادبی چپقلشوں کو بھی سامنے لائے۔ انیس ناگی کی آپ بیتی "ایک ادھوری سرگزشت" اس کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں انہوں نے لاہور کے ادبی منظر نامے اور خاص طور حلقہ ارباب ذوق کے پلیٹ فارم پر ہونے والی ان مخالفتوں اور چپقلشوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیاہے۔ اسی طرح کا ااظہار ڈاکٹر سلیم اختر کے ہاں بھی ملتا ہے ڈاکٹر سلیم اختر پاک ٹی ہاؤس میں حلقہ ارباب ذوق کے حوالے سے اپنا مشاہدہ یوں بیان کرتے ہیں:

> حلقہ اربابِ ذوق کی ہفت روزہ تنقیدی نشستیں بھی یہیں ہوتی ہیں۔ جہاں بڑے بڑے بقراط زبان سے دشنہ و خنجر کا کام لیتے ہیں، یہیں افلاطون نما تخلیق کے آسمان میں تھگلی لگاتے ہیں جبکہ چھوٹے چھوٹے ارسطو تخلیقات کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔ ماضی میں سینئرز بولتے اور ان سے ادبی رموز سیکھنے کے لیے جونئیرز خاموشی سے سنتے تھے۔ اب شعلہ آواز نوجوانوں کی گفتار کا یہ عالم ہے کہ نیلا گنبد کے چوک میں کھڑا راہ گیر پوچھتا ہے، یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے؟۔(۴۳)

حلقہ ارباب ذوق نے اپنے قیام سے عصرِ حاضر تک لاہور کی ادبی صورت حال کو جس طرح متاثر کیا اور اردو ادب پر جو اثرات مرتب کیے، ان کی جھلک ہمیں اردو آپ بیتی اور یادداشتوں میں ملتی ہیں۔ وہ لوگ جو حلقہ سے وابستہ رہے اور وہ جو اس سے دور رہے، ان دونوں کی یادداشتوں اورآپ بیتیوں میں حلقہ ارباب ذوق اور اس کی سرگرمیوں کا تذکرہ ملتا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کی ادبی اور تنقیدی اہمیت کو ہر ادیب نے سراہا ہے۔ اگرچہ شروع میں حلقہ کی سرگرمیاں کسی خاص سمت میں نہیں ہوتی تھیں اور بہت سے اجلاس بے نتیجہ بحث پر ہی مشتمل ہوتے تھے، لیکن آگے چل کر حلقہ ارباب ذوق نے لاہور کے ادبی منظرنامے کو ادبی حوالے سے وہ سنجیدگی عطا کی، جس نے اردو ادب و تنقید پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی ادبی صورت حال کے ضمن میں حلقہ ارباب ذوق کا تذکرہ بڑی جامعیت سے ملتا ہے۔

لاہور میں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان وادب کی ترویج کا سلسلہ بھی ہر دور میں جاری رہا۔ لاہور پنجاب کا دارلحکومت ہونے کی وجہ سے پنجابیوں پر مشتمل ایک ایسا خطہ ہے، جس میں پنجابی زبان و ادب کے سماجی اثرات گہری طرح مرتب ہوئے ہیں۔ اسکے علاوہ پنجابی صوفیا اور شعرا نے بھی اس خطے میں پنجابی کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی بھی لاہور کے ادبی منظرنامے میں اہمیت کی حامل رہی ہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے ادبی منظرنامے میں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان کی ترویج و اشاعت اور پنجابی ادب کے فروغ کے بارے میں بھی مختلف حکومتی اور سماجی اقدامات ملتے ہیں۔ پنجابی زبان وادب سے دلچسپی رکھنے والی شخصیات نے لاہور میں پنجابی زبان وادب کے فروغ کے لیے مختلف مجالس اور تنظیمیں بھی تشکیل دیں جو مختلف ادوار میں پنجابی تہذیب وثقافت اورزبان وادب کے فروغ میں حصہ ڈالتی رہیں۔ چوں کہ آپ بیتی اور یادداشتوں کے تخلیق کار بھی اسی سماج کا حصہ تھے اور ان میں سے اکثریت پنجابی سے گہرا لگاؤ رکھنے والے لوگوں کی تھی، اس وجہ سے انہوں نے نہ صرف اپنے عہد کی ان پنجابی تنظیموں کے قیام اور ارتقا میں حصہ لیا بلکہ بعد میں جب آپ بیتی

اور یادداشتوں کی صورت میں اپنے حالات زندگی قلم بند کیے تو ان میں بھی لاہور کے ادبی منظر نامے میں پنجابی کو ایک اہم عنصر کے طور پر پیش کیا ہے۔ جنرل ایوب خان کے دور میں جب دیگر سماجی اور سیاسی شعبوں میں اصطلاحات کا ڈول ڈالا گیا تو ادب سے وابستہ لوگوں کی کڑی نگرانی بھی شروع ہوئی۔ اس دور میں ایک طرف حکومت مخالف نظریات رکھنے والے ادیبوں پر شکنجہ کسا جانے لگا تو دوسری طرف من پسند ادبی گروہوں کی تشکیل کے لیے رائٹر گلڈ اور اس طرح کے دیگر ادبی پلیٹ فارم بھی تشکیل دیے جانے لگے۔ اس دور میں لاہور کے ادبی منظر نامے پر جو تنظیمیں پہلے سے کام کر رہی تھیں ان میں ایک اہم تنظیم "پنجابی مجلس" بھی تھی۔ یہ ایک فعال ادبی تنظیم تھی جس کے باقاعدہ سالانہ اجلاس انتخابات بھی ہوتے تھے اور بڑے منظم انداز میں یہ تنظیم پنجابی زبان وادب کے فروغ میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ انیس ناگی کا شمار ان ادیبوں میں ہوتا ہے جو اُس عہد کے لاہور کے ادبی منظر نامے پر خاصے متحرک تھے۔ ایک طرف حلقہ اربابِ ذوق میں قیوم نظر ان سے نالاں تھے تو دوسری طرف پنجابی مجلس میں بھی وہ باقاعدگی سے شرکت کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی "ایک ادھوری سرگزشت" میں پنجابی مجلس کے سالانہ انتخاب جو جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں ہوئے تھے، ان کا نقشہ اس انداز میں کھینچا ہے۔

> پنجابی مجلس کے سالانہ انتخاب کا مرحلہ تھا۔ سب نے متفقہ طور پر کہا کہ میر صاحب (محمد صفدر میر) اس کے سیکرٹری ہوں گے لیکن انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ حکومت انہیں کمیونسٹ سمجھتی ہے۔ میری وجہ سے تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ ادھر ادبی حلقوں میں یہ بات مشہور تھی کہ میر صاحب ہی اس مجلس کے روح رواں تھے اور نوجوان ان کے پیچھے پیچھے تھے۔ ہم سب نے مل کر ظفر اقبال کو سیکرٹری بنانے کا فیصلہ کیا۔ ظفر اقبال کے علاوہ ایک دو اور نام تھے جو سیکرٹری کے عہدے کے لیے تجویز ہوئے۔ میر صاحب نے یک لخت کہا کہ وہ اپنا نام سیکرٹری کے

عہدے کے لیے تجویز کرتے ہیں۔ہم سارے ہکے بکے ہو گئے کہ انہیں
یکا یک کیا ہوا۔ ہم سمجھے کہ میر صاحب نے یہ سب کچھ کسی مصلحت کے
تحت کیا ہے۔ میر صاحب الیکشن ہار گئے ان کا چہرہ شدید غصے سے تمتمانے
لگا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد ہم سب ان کے ہوٹل کے کمرے میں گئے
جہاں انہوں نے بیحد غصے کا اظہار کیا کہ انہیں ایک سازش کے تحت ذلیل
کیا گیا ہے۔(۴۴)

میر صفدر بھی لاہور کے ادبی حلقے کا اہم نام تھے۔ انہوں نے اردو زبان و ادب کی خدمت نمایاں انداز میں کی۔ ان کا تنقیدی شعور خاصا پختہ اور مطالعہ وسیع تھا۔ ان کی تنقیدی کتب اب بھی قارئینِ ادب کے زیر مطالعہ ہیں۔ پنجابی مجلس کے انتخاب کا جو نقشہ انیس ناگی نے اپنی آپ بیتی میں کھینچا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں کمیونسٹ نظریات رکھنے والے ادیبوں پر لاہور میں خاصی پابندیاں بھی تھیں۔ دوسری طرف ادبی حلقوں میں پائی جانے والی کشمکش بھی انیس ناگی کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے۔ انیس ناگی ایک بے رحم قلم کار تھے۔ انہوں نے لاہور کے ادبی منظر نامے کے ساتھ ساتھ اردو ادب کی تنقید کے حوالے سے بھی اپنے قلم کا استعمال انتہائی غیر جانبداری اور بے رحمی سے کیا ہے۔ وہ بے خوف اور نڈر انداز میں حقیقت کو عیاں کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور کے ادبی منظر نامے کو بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے ایک طرف ادیبوں کے نظریات کی عکاسی کی ہے تو دوسری طرف مختلف ادیبوں اور تنظیموں کے مابین پائی جانے والی چپقلش کو بھی نمایاں کیا ہے۔

جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت میں سیاسی، سماجی اور ادبی حوالے سے ہر وہ کام یا تنظیم جس سے حکومت کو خطرہ محسوس ہوتا تھا ایک طرف اسے پابند کرنے کی کوشش کی گئی تو دوسری طرف اس کے متوازی کوئی نیا پلیٹ فارم بھی مہیا کیا گیا، تاکہ عوام الناس کی رائے کو اپنے حق میں کیا جاسکے۔ "پنجابی مجلس" سے وابستہ افراد زیادہ تر کمیونسٹ نظریات کے حامل تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا قلع قمع کرنے

کے لیے اس کے متوازی "پنجابی اکیڈمی" کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ پنجابی مجلس کے متوازی یا کسی حد تک مخالف طرز پر قائم ہوئی جو جنرل ایوب اور سرکار کی چہیتی تھی۔ اردو آپ بیتیوں میں اس پنجابی اکیڈمی کے قیام کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ انیس ناگی پنجابی مجلس پر پابندی لگنے اور پنجابی اکیڈمی کے قیام کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ڈاکٹر باقر وغیرہ نے پنجابی اکیڈمی کے قیام کا اعلان کیا اور حکومت سے مالی مدد بھی حاصل کی۔ ہم نے ایک دن اخبار میں پڑھا کہ حکومت پنجاب نے پنجابی مجلس کو ایک بائیں بازو کی انجمن قرار دے کر ban کر دیا ہے۔ ہم سب خوفزدہ ہوئے کہ مارشل لاء کا زمانہ ہے اور ہماری گرفتاریاں کسی وقت بھی ہو سکتی ہیں۔(۴۵)

یہی جنرل ایوب خان کی اہم پالیسی تھی۔ قدرت اللہ شہاب اور ان کے دیگر حوارین اس میدان میں سرگرم تھے۔ سرکاری مراعات اور سرکاری امداد پر ادبی تنظیمیں قائم کی جاتی تھیں تاکہ ایسا ادب تخلیق کیا جا سکے جو سرکار کی منشا اور مفاد کے مطابق ہو۔ لاہور کے ادبی منظر نامے میں ہونے والی یہ اہم تبدیلی تھی جس کی طرف آپ بیتی نگاروں نے توجہ دلائی ہے۔ جنرل ایوب خان کے دورِ حکومت سے قبل لاہور کا ادبی منظر نامہ جس غیر جانبداری سے آگے بڑھ رہا تھا اور ارتقائی منازل طے کر رہا تھا، اس کے سامنے رکاوٹیں آ گئیں۔ اس سلسلے میں ادیبوں کی کڑی نگرانی بھی کی گئی اور ہم خیال ادیبوں اور ادبی تنظیموں کو مراعات سے بھی نوازا گیا۔ یوں ادب میں غیر جانبداری کی بجائے شخصیت پرستی کا عنصر پروان چڑھنے لگا۔ اردو آپ بیتیوں نے لاہور کے ادبی منظر نامے میں اُس دور میں آنے والی ان تبدیلیوں کا نقشہ بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ پنجابی مجلس کے مقابلے پنجابی اکیڈمی کا قیام اس منظر نامے کی خوب عکاسی کرتا ہے۔

لاہور کے ادبی منظر نامے میں ہونے والی تبدیلیوں اور خاص طور پر پنجابی زبان و ادب کے حوالے سے ہونے والی کاوشوں کو آپ بیتی میں بیان کرنے والوں میں ایک نام شاہد حمید کا بھی ہے۔ شاہد

حمید کی آپ بیتی "گئے دنوں کی مسافت" لاہور کے مختلف ادوار کے سیاسی، سماجی اور ادبی منظر نامے کی خوب عکاسی کرتی ہے۔ انہوں نے جہاں اردو کے ادبا اور شعرا جو لاہور سے تعلق رکھتے ہیں، ان کے احوال سے آگاہی دلائی ہے وہاں پنجابی شعرا اور ادبا کا بھی تذکرہ کیا۔ یہ وہ شعرا اور ادبا تھے جنہوں نے لاہور کی ادبی فضا کو متحرک رکھا ہوا تھا۔ عوام ان سے گہری عقیدت بھی رکھتے تھے اوران کا کلام سننے کے متمنی بھی ہوتے تھے۔ شاہد حمید نے اپنی آپ بیتی میں ادبی ٹھکانوں کا ذکر بھی کیا ہے جو لاہور میں ان پنجابی شعرا اور ادبا کے مراکز ہوتے تھے۔ اس ضمن میں وہ عرب ہوٹل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ہیلی ہوسٹل گیٹ کے ۔۔تقریباً سامنے عرب ہوٹل تھا۔ ہوٹل تو misnomer ہے، اصل میں یہ ریستوران تھا۔ یہاں پر ممتاز صحافی، ادیب اور انشا پرداز چراغ حسن حسرت اپنے مداحین اور اردو / پنجابی کے شاعر عبدالمجید بھٹی اپنے حوارین کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے۔ اس ریستوران میں کڑک چائے ملا کرتی تھی۔ کبھی کبھی عبدالمجید سالک بھی آجاتے تھے کہ ان کے اخبار انقلاب کا دفتر قریب ہی واقع تھا۔(۴۶)

شاہد حمید کے اس بیان سے لاہور کی ادبی فضا کو جو نقشہ سامنے آتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پنجابی مجالس اور محفلوں میں اردو کے شعرا، صحافی اور دیگر ادبی شخصیات بھی شرکت کیا کرتی تھیں۔ شاہد حمید نے اپنی آپ بیتی میں اردو اور پنجابی شعرا اور ادبی شخصیات کے رہائشی علاقوں کی بھی نشاندہی کی ہے۔ اس ضمن میں وہ بھاٹی گیٹ کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی آپ بیتی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ بھاٹی گیت لاہور کی ادبی شخصیات کا اہم رہائشی علاقہ تھا۔ اس ضمن میں ان کی آپ بیتی " گئے دنوں کی مسافت" سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> ایک زمانے میں بھاٹی گیٹ کے اندر چھوٹے موٹے خصوصاً پنجابی کے شاعروں اور ادیبوں کی بھرمار تھی تاہم ان کے علاوہ بعض قد آور شخصیات بھی وہاں مستقلاً یا عارضی طور پر مقیم رہی تھیں۔ علامہ اقبال کے

نام سے تو سبھی آشنا ہیں۔ دیگر اکابرین میں شیخ سر عبد القادر، اورئینٹل کالج کے پروفیسر محمد شفیع، "تہذیبِ نسواں" کے ایڈیٹر، دارلاشاعت کے بانی اور امتیاز علی تاج کے والد محترم ممتاز علی، "تاریخِ لاہور" کے مؤلف سید محمد لطیف، اسلامیہ کالج کے عربی کے یگانہ روزگار پروفیسر اصغر علی روحی، جن کے علم و فضل کا ہر کوئی معترف تھا اردو کے صاحبِ طرز ادیب مولانا محمد حسین آزاد، مشہور ڈراما نگار آغا حشر، ۔۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر، مشہور افسانہ نگار غلام عباس۔۔ وغیرہ شامل تھے۔(۴۷)

قیام پاکستان سے قبل کے لاہور کے حوالے سے اردو آپ بیتی اور یادداشتوں میں لاہور کے جن ادبی ٹھکانوں سے آگاہی ہوتی ہے، ان میں عرب ہوٹل، نگینہ بیکری، انار کلی بازار اہم ہیں۔ یہ وہ ٹھکانے تھے جہاں ادیب اور شعرا باقاعدگی سے نہ صرف اکٹھے ہوتے تھے بلکہ ادبی نگارشات بھی پیش کی جاتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کے بارے میں لکھنے والے مختلف ادیبوں، آپ بیتی نگاروں اور یاد داشت نگاروں نے ان ادبی ٹھکانوں اور یہاں پر ہونے والی ادبی محفلوں کا نقشہ بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ طاہر لاہوری ان ادبی مراکز کے بارے میں اپنی یادداشتوں پر مبنی کتاب "سوہنا شہر لاہور" میں لکھتے ہیں:

بازارِ حکیماں میں ادبی اور شعری نشستیں باقاعدگی سے منعقد ہوتی تھیں، علامہ اقبالؒ ان دنوں اسی علاقے میں رہتے تھے۔ نگینہ بیکری اور عرب ہوٹل وغیرہ میں ادیبوں اور شاعروں کا اٹھنا بیٹھنا بعد میں شروع ہوا، یگانہ چنگیزی، فکر تونسوی، رام پرکاش اشک انارکلی کی محفلوں میں حصہ لیتے تھے۔ معروف شاعر میلا رام وفا اور برج موہن تاتریا چڑیا کوٹی، ہری چند اختر باقاعدگی سے ان شعری محفلوں میں شریک ہوتے تھے۔ بزرگ شاعر تاجور نجیب آبادی بڑے پختہ گو اور استاد قسم کے شاعر تھے وہ بھی انارکلی کے علاقے میں رہتے تھے۔(۴۸)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لاہور ہر دور میں ادبی مرکز رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں ہر دور میں ادبی محفلیں برپا رہی ہیں اور مختلف ادبی تنظیمیں وجود میں آتی رہی ہیں۔ اس کے علاوہ لاہور میں ادبا اور شعرا کی کثیر تعداد کے آباد ہونے کی وجہ سے اس شہر کے مختلف علاقوں میں کئی جگہیں باقاعدہ ادیبوں کے ٹھکانوں کی حیثیت اختیار کر چکی تھیں۔ آج بھی یہ صورت حال قائم ہے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کی ادبی فضا کے مختلف پہلوؤں کو بیان کرتے ہوئے ادیبوں کے ان مراکز اور ٹھکانوں کے ساتھ ساتھ لاہور میں پروان چڑھنے والی ادبی تنظیموں کے عروج وزوال اوران تنظیموں کے ان نظریات کی عکاسی کی ہے، جنہوں نے آگے چل کر اردو زبان و ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کیا۔ادبی حوالے سے لاہور کی فضا خاصی زرخیز رہی ہے۔ اس کی زرخیزی میں نمایاں کردار انہی ادبی تنظیموں اور ادبی ٹھکانوں نے ادا کیا ہے جو مختلف ادوار میں قائم ہوتے رہے۔ آج کے لاہور کا جائزہ لیا جائے تو اس حوالے سے لاہور کا ادبی منظر نامہ خاطر خواہ حد تک متحرک ہے انتظار حسین لاہور کی ادبی فضا کے ماضی اور حال کا نقشہ کھینچتے ہوئے " چراغوں کا دھواں " میں لکھتے ہیں:

> باقی رہی یہاں آنے والی ادبی مخلوق تو وہ ٹولیاں جن کے واسطے سے ٹی ہاؤس آگے جانا جاتا تھا، اب کہاں۔ کیسی کیسی ٹولی آئی اور ہنس بول کر چلی گئی۔ کیا کیا صورت تھی کہ یہاں نمودار ہوئی اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ کتنی خاک کی تہہ میں چلی گئیں۔ کتنی اس رنگ سے بدلیں کہ پہچانی نہیں جاتیں۔ اب اور ٹولیاں ہیں اور ان کے لچھن ہیں۔ رنگ رنگ کے شاعر، رنگ رنگ کے افسانہ نگار۔ جتنے شاعر ہیں، سب صاحب دیوان ہیں۔ ایسے بھی ہیں کہ ان کے دیوانوں کی گنتی گنو تو دونوں ہاتھوں کی انگلیاں گنی جائیں اور ان کی گنتی پوری نہ ہو اور افسانہ نگار ناول نگار ایسے کہ دونوں بغلوں میں مجموعے دبے ہوئے جو سامنے آیا، اسے ایک عدد مجموعہ نظر کر دیا وہ زمانہ گزر گیا جب نوخیز لکھنے والے جھجکتے جھجکتے

ٹی ہاؤس میں قدم رکھتے تھے۔ پھر کوئی کسی بڑے کی انگلی پکڑ کر حلقہ ارباب ذوق میں پہنچتا۔(۴۹)

ان ادبی تنظیموں نے قیام پاکستان سے قبل سے لے کر عصرِ حاضر تک لاہور کی ادبی فضا کو متحرک رکھنے اور نئے ادبی نظریات کو رائج کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انہی ادبی تنظیموں اور ادبی مراکز کا ہی فیض ہے کہ لاہور آج بھی ادبی حوالے سے دیگر شہروں سے بہت آگے ہے اور یہاں اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی زبان وادب کی ترویج واشاعت کا سلسلہ بھی کامیابی سے جاری ہے۔

ج۔ قیام پاکستان کے بعد ادبی آپ بیتیاں اور یادداشتیں: لاہور کا بدلتا ادبی منظر نامہ

کسی بھی ادبی منظر نامے کی تشکیل میں سب سے اہم کردار وہ ادبی شخصیات ادا کرتی ہیں، جو اس خطے میں رہ کر تخلیقِ ادب یا نقدِ ادب کا فریضہ انجام دے رہی ہوتی ہیں۔ ان شخصیات کے افکار و نظریات اور تخلیقی تجربات ہی بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ادب کی سمت متعین کرتے ہیں اور ادب کو نئی جہتوں سے آشنا کرواتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی خطے کے ادبی منظر نامے کا تذکرہ کرتے ہوئے ان ادبی شخصیات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آپ بیتی، شخصی حالات کا مرقع ہوتی ہے، لیکن ان شخصی حالات کے بیان کے ساتھ ساتھ آپ بیتی نگار اور یادداشت نگار اپنے عہد کی ان ادبی اور سماجی شخصیات کا بیان بھی کرتا چلا جاتا ہے، جن سے ان کا تعلق واسطہ ہوتا ہے یا جو ادبی اور سماجی ماحول کی تشکیل اور تفہیم و تعبیر میں اپنا کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو آپ بیتی اور یاد داشت نگاروں نے لاہور کی ادبی فضا کا نقشہ کھینچتے ہوئے لاہور کی ادبی شخصیات کو بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ وہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں جو مختلف ادبا نے تحریر کی ہیں اگرچہ ان میں لاہور کی ادبی شخصیات کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ ادیبوں کا ایک دوسرے سے تعلق واسطہ رہتا تھا، مختلف ادبی محافل اور اجلاسوں میں ملتے تھے۔ مشاعروں میں اکٹھے ہوتے تھے، اس کے علاوہ ایک دوسرے کے سماجی معاملات میں بھی حصہ دار بنتے تھے اس وجہ سے ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور میں بسنے والی مختلف ادبی شخصیات کا ذکر تواتر سے آیا ہے۔ یہاں ہم آپ بیتیوں اور یادداشتوں سے لاہور کی ادبی شخصیات کے تذکرے کے حوالے سے اس نکتے کو سامنے رکھیں گے کہ کب کوئی ادبی شخصیت کس معروف شخصیت سے متعارف ہوئی یا ایسی گمنام شخصیات جو قبل از تقسیم یا بعد از تقسیم لاہور کے ادبی منظر نامے پر موجود تھیں لیکن ادبی مؤرخین نے عموماً انہیں نظر انداز کیا ہے۔ جب کہ آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں وہ زندہ ہیں۔

تقسیم سے قبل کے لاہور کے ادبی منظر نامے میں کئی ایسی شخصیات موجود تھیں جو علم و فضل اور فن شعر گوئی میں مہارت رکھنے کے باوجود ادبی تاریخ کا زیادہ حصہ نہ بن سکیں لیکن آپ بیتی نگاروں نے ایسی شخصیات کا کھوج لگا کر انہیں ادبی تاریخ میں زندہ کر دیا ۔ ایسی ہی ایک شخصیت وقار انبالوی کی ہے۔ وقار انبالوی کا تذکرہ ادبی تاریخ میں بھی ملتا ہے لیکن جس طرح آپ بیتی نگار شاہد حمید نے ان کے ادبی خصائص نمایاں کیے ہیں، اس سے ان کے ادبی مقام و مرتبے اور شعر گوئی میں مہارت سے آگاہی ہوتی ہے۔ وہ ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی میں لکھتے ہیں:

> ایک مسلمان اخبار نویس وقارانبالوی ہوتے تھے ۔ وہ غضب کے فی البدیہہ گو شاعر تھے، آپ کی فرمائش پر کھڑے کھڑے سو اشعار کی نظم یا غزل گھڑ کر سنا دیتے تھے۔ یہی نہیں انہیں اردو، فارسی، پنجابی، عربی، ہندی اور سنسکرت پر بھی عبور حاصل تھا۔(۵۰)

شاہد حمید کا اندازِ بیان خاصا دلفریب ہے۔ وہ معروف ادبی شخصیات کی بجائے سماج میں گم، اپنے آپ میں مگن اور ادبی مراکز سے دور ایسے جواہر تلاش کرنے اور ان کے بارے میں بیان کرنے میں خوب مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ طاہر لاہوری کا انداز بیان بھی ایسا ہی ہے ۔ طاہر لاہوری نے لاہور کے مختلف سماجی ، سیاسی ، تہذیبی اورادبی عناصر کو اپنی یادداشتوں میں محفوظ کیا ہے ۔ وہ بھی لاہور کی ان شخصیات کو سامنے لانے پر اپنی توانائیاں صرف کرتے ہیں ، جنہیں ادبی مؤرخین نے نظر انداز کر دیا تھا۔ تقسیم سے قبل لاہور کے ایک حجام کی ادبی اور شعری صلاحیتوں کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

> خدا بخش اظہر، مولانا مرتضی احمد خاں میکش، نظیر لدھیانوی شاعر تھے مگر مشاعروں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔۔۔۔انار کلی میں گنپت روڈ کی بنگالی گلی کے کونے پر ایک نوجوان حجام بیٹھتا تھا۔ استرے، قینچی کے ساتھ اس کا قلم بھی چلتا تھا۔ بڑا اچھا شاعر تھا۔ رسالہ میں غزلیں بھی چھپتی

تھیں۔مشاعرے میں نہیں جاتا تھا۔ اس کا نام حسرت عزیزی
شاہجہانپوری تھا۔(۵۱)

ان کے علاوہ دیگر آپ بیتیوں میں بھی تقسیم سے قبل لاہور کی مختلف ادبی شخصیات کا تذکرہ ملتا ہے جنھوں نے لاہور کے ادبی منظر نامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں انتظار حسین ہجرت کرنے کے بعد سکونت پذیر ہوئے تو اس وقت لاہور کا ادبی منظر نامہ جن شخصیات سے تشکیل پا رہا تھا، ان میں سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کا نام ادبی حلقوں میں تواتر سے گونج رہا تھا۔ منٹو تو تقسیم سے قبل بھی اپنی ادبی پہچان بنا چکے تھے لیکن محمد حسن عسکری اس وقت لاہور میں ایک نو آموز ادیب اور نقاد کے طور پر سامنے آ رہے تھے۔ انتظار حسین نے اپنی یادداشتوں "چراغوں کا دھواں" میں منٹو کی بزلہ سنجی اور محمد حسن عسکری کے ابتدائی ادبی تعارف کو بڑی مہارت سے بیان کیا ہے۔ محمد حسن عسکری اس وقت تک لاہور میں اپنی جو پہچان بنا چکے تھے وہ یہ تھی کہ کرشن چندر اور دیگر کئی ادبی شخصیات سے ان کے تعلقات بھی قائم ہو گئے تھے اور یہ ادبی شخصیات عسکری صاحب کے تنقیدی شعور کو بھی سراہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر مختلف ادبی محفلوں اور شخصیات کے سامنے محمد حسن عسکری کی تعریف کیا کرتے تھے۔ لاہور کے ادبی منظر نامے پر محمد حسن عسکری کے ظہور اور ادبی شخصیات سے ان کے تعارف کو انتظار حسین نے اپنی یادداشتوں میں سعادت حسن منٹو کے حوالے سے یوں بیان کیا ہے:

بارہ کھمبے سے تھوڑا آگے ہی ریڈیو اسٹیشن تھا اور ریڈیو جانے والے ادیبوں کا۔ کہ سواریوں میں ایک سواری منٹو صاحب بھی ہیں۔ سواریوں کے بیچ ٹھسا ٹھس بیٹھے ہوئے انہوں نے اپنا تعارف کرایا اور نام بتایا۔ منٹو صاحب نے غور سے عسکری صاحب کو دیکھا اور بولے "اچھا تم عسکری ہو" ۔۔۔ پھر رک کر بولے " یار کرشن تمہاری بہت تعریف

کرتا تھا"رکے پھر بولے " مگر کرشن کی بات کا کوئی اعتبار نہیں جھوٹ

بہت بولتا ہے۔(۵۲)

انتظار حسین کے اس بیان سے ایک تو لاہور کے ادیبوں کی ریڈیو سے وابستگی سے آگاہی حاصل ہوتی ہے تو دوسری طرف لاہور کے ادبی منظر نامے پر ظاہر ہونے والی نئی ادبی شخصیات کا تعارف بھی ہوتا ہے۔ سعادت حسن منٹو ایک بڑے تخلیق کار تھے۔لاہو ر میں ادبی حوالے سے ان کا طوطی بولتا تھا۔ دیگر ادیبوں سے بھی ان کے گہرے تعلقات تھے ۔ انتظار حسین نے یہاں محمد حسن عسکری کا تعارف کرواتے ہوئے کرشن چند، سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری جیسی شخصیات کو اس انداز سے بیان کیاہے کہ لاہور کے ادبی منظر نامے پر کہنہ مشق اور نو آموز ادیبوں کی کہکشاں کے رنگ بکھرتے دکھائی دینے لگتے ہیں۔

اردو آپ بیتیوں کا مطالعہ اس عہد کے ادبی ماحول، فکری فضاؤں اور معاشرتی کیفیات کو سمجھنے کا نہایت اہم ذریعہ فراہم کرتا ہے۔ آپ بیتی نگار اپنے ذاتی مشاہدات اور تجربات کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اس زمانے کے علمی و ادبی منظر نامے پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، جس کے نتیجے میں نہ صرف ہمیں اس عہد کی فضا کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس وقت کی معتبر اور نمایاں شخصیات سے بھی تعارف میسر آتا ہے۔ان شخصیات کے ذکر میں بعض اوقات معاصرانہ چشمک اور ذاتی اختلافات بھی جھلکتے ہیں، جو ان تذکروں کو جانداری عطا کرتے ہیں اور قاری کو اس زمانے کی ادبی محفلوں کی حقیقی کیفیت کا احساس دلاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود زیادہ تر آپ بیتی نگار ذاتی نقطہ نظر اور وقتی جذبات سے بالاتر ہو کر حالات کو پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں تاکہ ان کی تحریر محض ذاتی اظہار یا کسی فردِ واحد کی رائے تک محدود نہ رہے، بلکہ اس پورے عہد کی ادبی اور فکری روح کو سامنے لا سکے۔

یہی وجہ ہے کہ اردو آپ بیتیاں محض ایک شخص کی زندگی کا احوال نہیں ہوتیں بلکہ وہ اس دور کے اجتماعی شعور، ادبی تحریکوں، رجحانات اور فکری دھاروں کا معتبر حوالہ بن جاتی ہیں۔ اس طرح آپ

بیتیوں میں موجود یہ تذکرے نہ صرف ادیبوں کے ذاتی و سماجی رویوں کو اجاگر کرتے ہیں بلکہ ادب کی تاریخ اور تنقیدی شعور کو سمجھنے کے لیے بھی ایک لازمی ماخذ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

جب ایک ادیب کسی دوسرے ادیب کے ساتھ بیٹھتا ہے اور گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے تو یہ محض رسمی ملاقات نہیں رہتی بلکہ اس میں کئی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ اس طرح کی نشستوں میں ادیب اپنی ذاتی پسند و ناپسند کو غیر محسوس انداز میں آشکار کرتا ہے اور یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ کن رجحانات اور افکار کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ساتھ ہی اس کے ادبی حلقے اور فکری وابستگیاں بھی سامنے آتی ہیں کہ وہ کن شخصیات کو اپنا ہم خیال سمجھتا ہے اور کن نظریات سے اختلاف رکھتا ہے۔ ان ملاقاتوں میں ادیب کے مزاج کی جھلک، اور فکری ترجیحات بھی قاری تک پہنچتی ہیں۔ بعض اوقات یہ گفتگو صرف ذاتی ربط و ضبط تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کے ذریعے اس دور کی ادبی تحریکوں اور فکری مباحث کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے۔ یوں ایک ادیب کا دوسرے ادیب کے ساتھ بیٹھنا دراصل اس کے ذاتی، سماجی اور فکری تعارف کا در وا کرتا ہے اور اس سے اس عہد کی ادبی فضا کا ایک جامع اور حقیقت آشنا نقشہ ابھرتا ہے۔ ایسا ہی ادبی تذکرہ ڈاکٹر سلیم اختر کی آپ بیتی میں ملتا ہے جس سے نہ صرف ادبا سے تعارف ہوتا ہے ان کے معاصرین کا پتہ چلتا ہے بلکہ ان کی پسند ناپسند سے بھی واقفیت ہوتی ہے ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں :

> اگر ٹی ہاؤس کی تاریخ قلم بند ہوئی تو اس میں بعض ایسے اہل قلم کا خصوصی تذکرہ ہو گا جنھوں نے گویا عمر یہیں گزار دی ۔۔ میں یہ نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا کہ بیشتر ادیب، بالعموم مخصوص نشستوں پر صرف اپنے ہی ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا پسند کرتے ہیں۔ انتظار حسین، زاہد ڈار، سہیل احمد خاں، مسعود اشعر، اکرام اللہ، شاہد حمید ایک میز پر بلکہ ایک ہی ترتیب سے براجتے۔ اسرار زیدی کونے والی ایک نشست پر اتنا بیٹھتے کہ وہاں ایک گڑھا سا بن گیا۔ یونس جاوید، انیس ناگی، خالد احمد، نجیب احمد، ڈاکٹر خواجہ زکریا، رشید مصباح بھی آتے جاتے ہیں جبکہ اظہر جاوید اور

> سرفراز سید بالعموم خواتین کی میزوں کے ارد گرد پائے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ تاہم ادیبوں کی اکثریت کے لیے ٹی ہاؤس ایسا تکیہ ہے جس کی چھتری پر کچھ دیر بیٹھے، ستائے، غٹرغوں کی اور پھُر سے اڑ گئے جبکہ بعض کے لیے یہ جنرل بس سٹینڈ ہے جہاں سے ریڈیو، ٹیلیویژن، عہدوں، مراعات، مشاعروں اور شہرت کی منزلوں کے لیے سواریاں، کمر باندھے ہوئے چلنے کو تیار ملتی ہیں ۔(۵۳)

لاہور کی ادبی شخصیات کے حوالے سے اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں فیض احمد فیض کا ذکر ایک نمایاں اور تابناک حوالہ ہے۔ فیض نہ صرف اپنے عہد کے بڑے شاعر اور ادیب تھے بلکہ وہ اپنے نام کے عین مطابق "فیض" یعنی فیض رساں ثابت ہوئے۔ ان کی شخصیت اور ان کا فن اپنے اندر وہ کشش رکھتے تھے جو ان کے ہم عصروں کو بھی متاثر کیے بغیر نہ رہ سکا۔ فیض کے بارے میں مختلف یادداشتوں میں یہ بات ملتی ہے کہ وہ زمانۂ طالب علمی ہی سے اپنی انفرادیت اور کمالِ سخن کی بدولت نمایاں مقام رکھتے تھے۔ کالج کے دنوں سے ہی ان کی شاعری میں ایک خاص روانی، شگفتگی اور فکری گہرائی موجود تھی، جس نے ان کے معاصرین کو ان کی جانب متوجہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ رفتہ رفتہ فیض کی پہچان صرف ایک خوش گفتار اور باکمال نوجوان شاعر تک محدود نہ رہی بلکہ وہ ترقی پسند تحریک کے مرکزی کرداروں میں شامل ہو گئے۔ آپ بیتیوں میں ان کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی شخصیت میں ایک شائستگی، متانت اور دلکشی موجود تھی جس نے انہیں دوستوں اور ادیبوں کی محفل میں ہمیشہ ایک معتبر مقام پر رکھا۔ ان کا قلم محض تخلیقی اظہار کا وسیلہ نہیں تھا بلکہ عہد کے دکھ درد، طبقاتی ناہمواریوں اور انسانی جدوجہد کی بھرپور عکاسی بھی کرتا رہا۔ اس طرح فیض احمد فیض کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات اردو آپ بیتیوں میں نہ صرف لاہور کے ادبی منظرنامے کو جلا بخشتی ہیں بلکہ ان کے فکری اور تخلیقی کمالات کو بھی امر کر دیتے ہیں۔ اس کا اظہار احسان دانش یوں کرتے ہیں:

> فیض احمد کالج کے زمانے میں بھی آج کی طرح شعر کہتے تھے اور اس وقت بھی ان کے کلام میں ایسے ہی افسوں تھے جیسے آج ہیں۔ یہی سبک سبک اشارات اور یہی جاذبِ توجہ اظہار جذبات ان میں شروع ہی سے موجود تھا۔ وہی لطیف ایمائیت اور طلب افزا ابہام جو آج بھی ان کا طرہ امتیاز ہے۔ اس وقت بھی لہجے اور بیان کے اعتبار سے دھاردار اور دلنشیں تھا۔(۵۴)

اردو آپ بیتیوں میں جہاں معاصرین کی خوبیوں کو سراہنے اور ان کی ادبی خدمات کا اعتراف ملتا ہے، وہیں ان کے ساتھ شکووں اور گلے کا اظہار بھی کھل کر سامنے آتا ہے۔ انیس ناگی اور قیوم نظر کے اختلافات اب کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ انیس ناگی نے قیوم نظر سے تلمذ بھی حاصل کیا تھا لیکن وہ نظریاتی اور شخصی حوالے سے ان سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ یہ اختلاف زیادہ تر قیوم نظر کے اس رویے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے جو انہوں نے حلقہ ارباب ذوق پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے روا رکھا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انیس ناگی قیوم نظر جیسی شخصیت کا تعارف کرواتے ہوئے ان کے ادبی مقام و مرتبے سے زیادہ ان کے شخصی نقائص کو سامنے لاتے ہیں۔ لاہور کی ادبی شخصیات کے تعارف اور پہچان کی یہ جہت بھی آپ بیتیوں میں سامنے آتی ہے کہ آپ بیتی نگار کے جس شخصیت کے ساتھ نظریاتی یا شخصی اختلاف تھے، اس نے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ان اختلافات کی آڑ میں شخصی خامیاں بھی اجاگر کی ہیں۔ انیس ناگی کی آپ بیتی "ایک ادھوری سرگزشت" میں قیوم نظر کی شخصیت کی پرتیں اس طرح کھلتی دکھائی دیتی ہیں:

> قیوم نظر سے میں اردو پڑھا کرتا تھا اور انہوں نے مجھے عروض کی کچھ شد بد دی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ان سے کچھ حاصل نہیں کیا تھا۔ وہ ایک عجیب و غریب شخصیت تھے۔ وہ ایک طویل عرصہ تک اے جی آفس میں کلرک رہے تھے۔ پھر ایم اے اردو کر کے اردو کے لیکچرر

ہو گئے۔ وہ باتونی بہت تھے اور ہر ایک کے خلاف چغلی کھانے اور سازش کرنے میں ماہر تھے۔ پاک ٹی ہاؤس اور حلقہ ارباب ذوق پر ان کا مکمل قبضہ تھا۔(۵۵)

انیس ناگی کی آپ بیتی میں لاہور کے ادبی حالات کا بیان کرتے ہوئے بھی انہوں نے زیادہ تر اپنی شخصی پسند ناپسند کو سامنے رکھا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ بیتی نگار آپ بیتی میں اپنی زندگی کو ہی بیان کر رہا ہوتا ہے۔ اس عمل کے دوران میں اس کی پسند ناپسند بھی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ انیس ناگی نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ قیوم نظر سے وہ اختلاف رکھتے تھے تو ان کے شخصی نقائص کو خوب اجاگر کیا گیا ہے جب کہ صفدر میر سے وہ نظریاتی وابستگی رکھتے تھے، اگرچہ ان کے افکار و نظریات پر چلنے کی سزا بھی بھگتنا پڑی لیکن صفدر میر کا تعارف کرواتے ہوئے وہ انہیں ایک رجحان ساز اور اہم ادبی شخصیت قرار دیتے ہیں۔ وہ ان کے بارے میں لکھتے ہیں:

کالج کی زندگی کے دوران مَیں ایک شخص سے ملا جس نے ادب کی تفہیم اور تخلیق میں میری رہنمائی کی اور یہی شخص میری عملی زندگی میں میری تباہی کا باعث بنا۔ اس کے نظریات کی سزا میں نے برداشت کی۔ اس شخص کا نام محمد صفدر میر تھا۔ جنہیں ہم کالج میں میر صاحب کہتے تھے۔ اردو کے بہت اچھے شاعر تھے اور نئی اردو شاعری کے پیش رووں میں سے ایک ہیں۔ اگرچہ ان کا کلام ان کے واحد شعری مجموعے " درد کے پھول " میں محفوظ ہے۔ یہ کتاب انہوں نے ۱۹۶۴ء میں شائع کی۔ اس میں ان کے تین منظوم ڈرامے بھی شامل ہیں۔ میر صاحب پرانے مارکسی تھے۔(۵۶)

لاہور کے ادبی منظر نامے میں ان ادبی شخصیات نے اپنے حصے کا کردار بڑے احسن انداز میں ادا کیا ہے۔ صفدر میر کی مارکسزم پر کتابیں اب بھی ادبی دنیا میں اپنی اہمیت منوا رہی ہیں۔ انہوں نے مارکسی

نظریات کو جدید تقاضوں کے مطابق استعمال کرنے اور ان نظریات کی افادیت کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ انیس ناگی ان کے نظریات سے خاص متاثر تھے۔ دوسری طرف انیس ناگی کی آپ بیتی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو آپ بیتی نگاروں نے صرف لاہور کی ادبی شخصیات کو ہی متعارف نہیں کرایا بلکہ ان کے ادبی اور تنقیدی نظریات وافکار سے بھی آگاہی دلائی ہے۔ جس کی وجہ سے لاہور کے ادبی منظرنامے کو سامنے لانے میں ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے کردار سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لاہور کی ادبی فضا میں عہد بہ عہد پروان چڑھنے اور پنپنے والے ادبی نظریات وافکار ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں کی صورت میں بڑی صراحت سے سامنے آتے ہیں۔

اردو آپ بیتیوں میں بعض آپ بیتیاں ایسی بھی سامنے آئی ہیں جن میں لاہور کی ادبی شخصیات کے ساتھ ساتھ خود لاہوریوں کے ادبی مزاج سے بھی آگاہی ملتی ہے۔ لاہور مختلف اقوام اور مختلف خاندانوں سے تعلق رکھنے والے افراد کا ایک ایسا شہر ہے جس کا اپنا ایک خاص ادبی مزاج تشکیل پاچکا ہے۔ یہ ادبی مزاج اس وقت بھی سامنے آرہا تھا جب تقسیم نہیں ہوئی تھی اور یہ شہر مشترکہ سماجی منظرنامے کا عمدہ نمونہ پیش کرتا تھا۔ تقسیم کے بعد اگرچہ ہندوستان کے مختلف خطوں اور مختلف شہروں سے مختلف ادبی مزاج رکھنے والی شخصیات اور عوام الناس اس شہر میں آکر آباد ہوئے۔ جس سے ادبی منظرنامہ بھی متغیر ہوا لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ لاہوریوں اصل ادبی مزاج نہ صرف قائم رہا بلکہ اس میں پختگی بھی آتی گئی۔ احسان دانش کا شمار اردو کے ان آپ بیتی نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے لاہور میں اپنی زندگی کا بہت عرصہ گزارا۔ لاہور کے ادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ عوام الناس میں بھی ان کی پذیرائی تھی۔ کچھ ان کے حالات زندگی اور کچھ لاہوریوں کے مزاج نے انھیں عوام میں ایک ایسے شاعر کے طور پر معروف کردیا تھا جو شاعرِ مزدور کے لقب سے بھی جانے جاتے تھے۔ انہوں نے اپنی آپ بیتی "جہانِ دانش" میں لاہور کے ادبی منظرنامے کا تذکرہ کرتے ہوئے لاہوریوں کے ادبی مزاج کو بھی سامنے رکھا ہے۔ وہ لاہور کے ادبی مزاج کا تذکرہ کرتے ہوئے اپنی آپ بیتی "جہانِ دانش" میں لکھتے ہیں:

> لاہور میں تو بڑے بڑے شاعر عموماً ناکام رہتے تھے اور لاہور کی پبلک اس معاملے میں بڑی ہی بدنام تھی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ یہاں نغمہ پسند لوگ زیادہ اور شعر فہم لوگ کم ہیں۔ چنانچہ یہاں کوئی مشاعرہ ہو یا مناظمہ عموماً نغمہ گری کے پہیوں پر ہی چلتا تھا اور نتیجہ اس کا یہ ہوتا تھا کہ مشاعرہ کی شہرت کو تشنگی کو تو نغمہ کی تحسین پورا کر دیتی لیکن مضامین کی بلندی توجہ سے محروم رہ جاتی۔ اس کے علاوہ دھڑے بندی اور پارٹی بازی اس قدر تھی کہ خدا کی پناہ۔ (۵۷)

احسان دانش نے لاہور کی عوام کے ادبی مزاج کے ساتھ ساتھ لاہور کے ادبی حلقوں میں پائی جانے والے پارٹی بازی اور دھڑے بندیوں کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جہاں مختلف ادبی نظریات کے حامل لوگ بستے ہوں وہاں دھڑے بندی لازمی پیدا ہوتی ہے، لیکن ادبی فضا کو بہتر سے بہترین بنانے کے لیے یہ ضروری ہوتا ہے کہ ان ادبی دھڑے بندیوں اور پارٹیوں کو اختلاف کی حد تک رکھا جائے انہیں مخالفت میں نہ بدلنے دیا جائے۔ لاہور کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو بعض اوقات یہ دھڑے بندیاں مخالفت میں تبدیل ہوتی بھی نظر آتی ہیں۔ یہ عمل صرف ایک حلقے کے دوسرے حلقے کے درمیان نہیں بلکہ بعض اوقات ایک ہی ادبی حلقے سے تعلق رکھنے والی مختلف شخصیات ذاتی مفادات کی خاطر اختلافات کو مخالفت میں بدلنے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔ قیوم نظر اور انیس ناگی کی مثال سامنے ہے۔

ادبی حوالے سے لاہور کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ اس شہر میں ایسی قد آور ادبی شخصیات نے زندگی گزاری ہے جو آج ایک صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد بھی اردو ادب و تنقید پر چھائی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سے ہی ایک اہم شخصیت اقبالؒ کی ہے۔ سیالکوٹ میں پیدا ہونے والے اقبالؒ نے اپنی عملی زندگی کے لاہور کو ہی مسکن بنایا۔ لاہور ان کی شخصیت اور مزاج کا حصہ بن گیا تھا۔ اردو آپ بیتیوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور نے بھی اقبالؒ سے خوب وفا کی۔ یہ لاہور کا ہی

اعزاز ہے کہ علامہ اقبالؒ کی زندگی میں ہی پہلا یومِ اقبال بھی لاہور ہی میں منایا گیا۔ علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی آپ بیتی " اپنا گریباں چاک " میں اس اہم ادبی واقعے کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> لاہور میں پہلا یوم اقبال غالباً ۱۹۳۸ء میں والد کی زندگی ہی میں منایا گیا۔ جلسے کا اہتمام مینارڈ ہال میں کیا گیا اور اس کی صدارت کے لیے سید غلام السیدین مصنف کتاب اقبال کا فلسفہ تعلیم (انگریزی)بھارتی حکومت کے سابق سیکرٹری تعلیم دہلی سے تشریف لائے۔ میں بھی اس جلسے میں شریک ہوا۔(۵۸)

جاوید اقبال نے اپنی آپ بیتی میں اگرچہ لاہور کے مختلف امور پر روشنی ڈالی ہے لیکن ان کا زیادہ رجحان اپنی پیشہ ورانہ زندگی کی عکاسی اور نجی زندگی کی طرف رہاہے۔ ادبی حوالے سے اس آپ بیتی میں ماسوائے چند ادبی واقعات جن کا تعلق اقبال کی ادبی شخصیت سے ہے، کے علاوہ زیادہ بحث نہیں ملتی۔

قبل از تقسیم کے لاہور کے ادبی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو اس میں وہ رسائل وجرائد ادبی فضا کو متحرک کرنے اور ادبی ماحول تشکیل دینے میں مصروف عمل دکھائی دیتے ہیں، جو مختلف شخصیات نے مختلف ادوار میں جاری کیے تھے۔ رسائل وجرائد چوں کہ تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں اوران کے قارئین کی تعداد بھی کافی زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ان کے ذریعے کسی بھی خطے یا شہر کا ادبی منظرنامہ تشکیل دینے میں خاص معاونت ملتی ہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے قبل کے لاہور میں ادبی حوالے سے رسائل وجرائد کی اشاعت اور ان کے ذریعے ادبی فضا کی تشکیل کا عمل تیزی سے جاری تھا۔ کئی آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے ان رسائل وجرائد کا تذکرہ کیاہے جو تقسیم سے قبل لاہور میں شائع ہوتے تھے۔ شاہد حمید کی آپ بیتی "گئے دن کی مسافت" میں ان کا تذکرہ یوں ملتاہے:

ایک سکھ "پریت لڑی" کے نام سے ہفتہ وار یا ماہوار رسالہ نکالتا تھا۔ اس کے مضامین نظم و نثر اردو اور پنجابی دونوں زبانوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ایک فلمی رسالہ "چترا" بھی چھپتا تھا جو ملک گیر شہرت کا مالک تھا۔ ریلوے روڈ پر ممتاز علی کا اشاعتی ادارہ دارالاشاعت بھی واقع تھا جو درسی، علمی اور ادبی کتابوں کے علاوہ عورتوں کا رسالہ "تہذیب نسواں" اور بچوں کا "پھول" چھاپا کرتا تھا۔ ایک زمانے میں احمد ندیم قاسمی بھی پھول کے مدیر تھے۔(۵۹)

تقسیم سے قبل لاہور سے جو معروف ادبی رسائل شائع ہوتے تھے، ان میں ایک اہم نام "مخزن" کا ہے۔ یہ سر عبدالقادر کی سرپرستی میں شائع ہوتا تھا اور علامہ اقبالؒ سمیت اُس عہد کے معروف ادیبوں کی تخلیقی اور تنقیدی نگارشات اس میں شائع ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ دیگر جو رسائل و جرائد لاہور سے شائع ہو کر لاہور کی ادبی فضا کو متحرک رکھے ہوئے ان کا تذکرہ کرتے ہوئے شاہد حمید لکھتے ہیں:

> شیخ عبدالقادر کا اردو کا عہد ساز رسالہ "مخزن" بھی، جس نے پنجاب میں اردو کے فروغ میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا، اپنے ابتدائی دور میں اور یوسف حسن کا "نیرنگ خیال" یہیں (بھاٹی گیٹ) سے شائع ہوتا تھا۔ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے اپنا فقید المثال جریدہ "کارواں" یہیں سے نکالا تھا۔ اس کے صرف دو ہی شمارے شائع ہو سکے تھے کہ وہ مزید تعلیم کے لیے انگلستان سدھار گئے۔ یہ "نقوش" کے بعض شماروں کی طرح بہت ضخیم ہوتا تھا۔ یہ فقید المثال اس لیے تھا کیونکہ اس میں مضامین نظم و نثر کے علاوہ عبدالرحمٰن چغتائی کی لازوال تصاویر

painting اور ان پر تاثیر کے بصیرت افروز تبصرے اور پطرس کے
ترجمے شائع ہوتے تھے۔(۶۰)

لاہور تقسیم سے قبل رسائل وجرائد کے حوالے سے اپنا ایک خاص ادبی مقام ومرتبہ رکھتا تھا۔ یہاں سے شائع ہونے والے رسائل وجرائد ہندوستان بھر میں پڑھے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ ان میں لکھنے والوں میں لاہور سے باہر کی ادبی شخصیات بھی شامل ہوتی تھیں۔ جس وجہ سے ان ادبی رسائل وجرائد کی مقبولیت ہندوستان گیر تھی۔ طاہر لاہوری اپنی یادداشتوں میں تقسیم سے قبل لاہور کی ادبی فضا کی تشکیل وتعبیر میں مصروف عمل رسائل وجرائد کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لاہور میں ادبی رسائل میں مخزن ، ہمایوں، ادبی دنیا، ادب لطیف ، نیرنگ خیال ، عالمگیر جیسے بلند پایہ ادبی رسائل سارے ہندوستان میں شہرت رکھتے تھے۔ سر عبدالقادر، میاں بشیر احمد، حافظ محبوب عالم، حکیم یوسف حسن، مولانا صلاح الدین احمد، مرزا ادیب جیسے لوگ ان رسائل کی ادارت کرتے تھے۔ مخزن میں علامہ اقبالؒ کا کلام چھپتا تھا۔ ادب لطیف نے ترقی پسند ادیبوں کو بہت اچھالا، نیرنگ خیال میں تاریخ انسانی کے بڑے بڑے نایاب مضامین چھپتے تھے ۔ ان رسائل میں ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شاعروں کا کلام بھی چھپتا تھا۔(۶۱)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں تقسیم سے قبل لاہور کے ادبی منظر نامے پر متحرک ادبی رسائل وجرائد کی عکاسی بھی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ان رسائل وجرائد میں شائع ہونے والی ادبی شخصیات کے تعارف سے قارئین کو تقسیم سے قبل کے لاہور اور بیرون لاہور کی ادبی شخصیات سے بھی آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ یوں یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں تقسیم سے قبل کے لاہور کے ادبی منظر نامے سے آگاہی دلانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

تقسیم کے بعد اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے بدلتے ہوئے ادبی منظر نامے کی عکاسی کا ایک پہلو لاہور کے ادبی ناشرین اور تخلیق کاروں کے حوالے سے بھی سامنے آتا ہے۔ لاہور میں ادبی ناشرین اب تو کثیر تعداد میں موجود ہیں اور ہر سال ہزاروں کی تعداد میں کتب شائع ہو رہی ہیں، تقسیم سے قبل بھی لاہور میں معروف ادبی ناشرین موجود تھے ۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقسیم سے قبل لاہور میں اردو ناشرین نہ صرف موجود تھے بلکہ یہ اشاعتی سلسلے باقاعدہ خاندانی روایات اور اقدار کا حصہ بن چکے تھے۔ شاہد حمید اپنی آپ بیتی "گئے دن کی مسافت" میں لاہور کے ایک ایسے ہی اشاعتی خاندان کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> چودھری برکت علی اور ان کے بھتیجے نذیر احمد چودھری کا خوبصورت اور دیدہ زیب کتابیں اور رسالے چھاپنے والا مشہور چودھری خاندان بھی بھاٹی گیٹ کے اندر ہی رہتا تھا۔ اس خاندان کے سرخیل چودھری برکت علی نے ادبی کتابیں چھاپنے کے لیے مکتبہ اردو اور درسی کتابوں کی اشاعت کے لیے پنجاب بک ڈپو قائم کیا اور مشہور ادبی جریدے "ادب لطیف" کا اجراء کیا۔ جس نے اردو ادب پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔(۶۲)

اس کے علاوہ بعض ایسے ناشرین بھی تھے جو تقسیم کے عمل میں ہندوستان سے ہجرت کر کے پاکستان آ گئے تھے اور لاہور کو اپنا مسکن بنایا تھا۔ ان میں بعض نے تو مال مفت دل بے رحم کے مصداق یہاں کلیم میں ملنے والے نشریاتی اداروں سے بڑا بے رحمی کا سلوک کیا اور محض اپنے مفادات کو ہی پیش نظر رکھا جس کی وجہ سے لاہور ان معروف ادبی اداروں سے محروم ہو گیا۔ اس کی ایک مثال شاہد حمید کی آپ بیتی سے ملتی ہے جس میں وہ لاہور تقسیم سے قبل لاہور میں قائم ہونے والے معروف ادبی اشاعتی ادارے "عطر چند کپور اینڈ سنز" کی بربادی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

انار کلی بازار میں کتابوں کی دو بڑی دکانیں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام عطر چند کپور اینڈ سنز اور دوسری کا سُوری اینڈ سنز تھا۔ عطر چند کپور اینڈ سنز غالباً لاہور کے سب سے بڑے کتب فروش اور ناشر تھے ۔ ان کا اپنا عظیم الشان پریس تھا جو لکشمی بلڈنگ کے عین سامنے ایبٹ روڈ اور میکلوڈ روڈ کے سنگم پر واقع تھا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ چھاپہ خانہ دو صحافیوں میاں محمد شفیع عرف م ش اور ممتاز احمد کو الاٹ ہو گیا۔ دونوں نے کھا پی کر اسے چند سالوں میں برباد کر دیا۔(۶۳)

یہ ایک اشاعتی ادارے کی بربادی کا بیان ہے ، نہ جانے تقسیم کے عمل اوراس کے بعد کی مفاد پرستی نے ایسے کتنے ہی قیمتی اثاثوں کو بربادی کے کنویں میں دھکیل دیا ہو گا۔ درج بالا اقتباس کی تصدیق ہمیں طاہر لاہوری کے ہاں ملتی ہے جنہوں نے اسی طرح کا بیان لکھا ہے:

ہندو پبلشر زیادہ تر انارکلی کے آس پاس گنپت روڈ پر اور اردو بازار میں تھے۔ جے ایس سنت سنگھ چوک متی میں اور موتی بازار میں، رائے بہادر منشی گلاب سنگھ بھی مشہور پبلشر تھے۔ سب سے بڑے پبلشر عطر چند کپور تھے۔(۶۴)

اشاعتی اداروں اور اشاعتی شخصیات کے حوالے سے اردو کی آپ بیتیوں اوریادداشتوں میں مثبت رجحان بھی سامنے آتا ہے ۔ تقسیم کے بعد بعض ایسی شخصیات لاہور کے ادبی منظرنامے پر وارد ہوئیں جنہوں نے حقیقی معنوں میں اپنی پسند ناپسند کو پس پشت ڈالتے ہوئے صرف ادب کی ترویج اور مصنفین کی مرضی اور منشا کو مد نظر رکھا۔ انھی میں سے ایک اہم شخصیت چودھری عبدالحمید کی تھی۔ چودھری عبدالحمید کے بارے میں شاہد حمید اپنی آپ بیتی "گئے دن کی مسافت" میں لکھتے ہیں:

چودھری صاحب (چودھری عبدالحمید) بڑے باذوق تھے اور خود بھی شعر کہا کرتے تھے۔ وہ بے حد بھلے مانس ، شریف النفس اور قول کے

پکے انسان تھے۔ ادیبوں سے جو وعدہ کرتے اسے ہر حال میں پورا کرتے تھے۔ وہ مجھ پر بہت مہربان تھے۔ میری درخواست پر جب انہوں نے ناصر کاظمی کا پہلا مجموعہ کلام " برگِ نے" شائع کرنے کی ہامی بھری، ناصر کاظمی نے یہ شرط عاید کر دی کہ وہ ہر کتاب پر دستخط کریں گے۔ یہ انوکھی شرط تھی اور غالباً دنیا کے کسی بھی پبلشر کو اس سے واسطہ نہیں پڑا ہو گا۔ چودھری صاحب کی شرافت دیکھیں کہ انہوں نے یہ شرط بھی بلاچون وچرا ان مان لی۔ اس کا طریقہ یہ نکالا گیا کہ ناصر کاظمی ہر کتاب پر دیباچے کے آخر میں دستخط کر دیں۔ یہ دیباچہ دراصل مظفر علی سید نے لکھا تھا۔ مگر جب کتاب چھپ کر آئی تو اس دیباچے کے نیچے ناصر کاظمی کے دستخط تھے۔ مظفر علی سید نے شکایت کی تو ناصر کاظمی نے سگریٹ کا کش لگاتے اور پیک تھوکتے ہوئے بڑے اطمینان سے جواب دیا:" میں نے تمھیں دیباچہ لکھنے کو کہا تھا، یہ تو نہیں کہا تھا کہ یہ چھپے گا بھی تمھارے نام سے۔" مظفر علی منہ دیکھتا رہ گیا۔ انتظار حسین کے افسانوں کا پہلا مجموعہ " گلی کوچے " بھی چودھری صاحب نے ہی شائع کیا تھا۔(۶۵)

شاہد حمید نے بڑے بے باکانہ انداز میں لاہور کے ادبی منظر نامے کے ایک اہم رخ کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ ایک طرف ناشر عبدالحمید کی شرافت اور اصول پسندی کا تذکرہ ہے تو دوسری طرف ناصر کاظمی جیسے شعرا کے رویوں کی بھی عکاسی ہوتی ہے۔ ناصر کاظمی کا یہ رویہ صرف ناشر چودھری عبدالحمید کے ساتھ ہی نہیں تھا بلکہ مظفر علی سید سے دیباچہ لکھوانے کے بعد نیچے اپنے دستخط کرنے اور پھر یہ کہنا کہ ضروری نہیں کہ آپ کا لکھا ہوا، آپ کے نام سے ہی شائع ہو، یہ بھی کوئی مثبت رویہ

نہیں ہے۔ شاہد حمید نے لاہور کی ادبی فضا کے اس رخ کو بیان کرتے ہوئے مثبت اور منفی دونوں رویوں کو بڑے بے باکانہ انداز میں اپنی آپ بیتی کا حصہ بنایا ہے جس سے ان کی غیر جانبداری سامنے آتی ہے۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں چودھری خاندان نے نہ صرف اشاعتی سرگرمیوں کو جاری رکھا بلکہ ان میں مزید آگے بڑھتے ہوئے ادبی رسائل وجرائد کا اجرا بھی کیا ہے۔ " سویرا" کا شمار اردو کے ایسے ہی رسائل و جرائد میں ہوتا ہے جو ایک عرصہ تک ادبی دنیا میں کامیابیاں سمیٹتا رہا۔ اس ادبی پرچے کے پلیٹ فارم سے ادبی نظریات کے ساتھ ساتھ بہت سی ادبی شخصیت بھی ادبی حلقوں میں متعارف ہوئیں۔ گویا لاہور کی ادبی فضا کی تشکیل اور ارتقا میں " سویرا" کا کردار نمایاں ہے۔ " شاہد حمید اس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> چودھری برکت کے علی بڑے بھتیجے نذیر احمد پہلے ان کے کاروبار میں شریک رہے، پھر انہوں نے " نیا ادارہ" کے نام سے اپنی دکان کھول لی اور زندہ و تابندہ ادبی رسالے " سویرا" کا آغاز کیا۔ جسے اب بھی ان کے صاحبزادے ریاض احمد چودھری ، محمد سلیم الرحمٰن کے تعاون سے شائع کر رہے ہیں۔(٦٦)

چودھری خاندان نے لاہور کو ادبی حوالے سے بہت کچھ دیا۔ اس خاندان نے تین چار نسلوں تک لاہور کے ادب کی آبیاری کی اور ابھی تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ ادبی اشاعتی اداروں کے قیام کے ساتھ ساتھ ادب رسائل وجرائد کے اجرا اوراشاعت میں بھی اس خاندان نے بھرپور حصہ ڈالا۔ یہی وجہ ہے کہ لاہور کو کوئی تذکرہ بھی اس خاندان کی اشاعتی اورادبی صحافتی خدمات کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ لاہور کے ادبی منظرنامے میں اس خاندان کا تذکرہ ایک آپ بیتی میں ان الفاظ میں ملتا ہے:

> نذیر احمد چودھری کے چھوٹے بھائیوں بشیر احمد چودھری ، رشید احمد چودھری ، حنیف رامے اور محمد حفیظ چودھری نے اپنا اشاعتی ادارہ "مکتبہ جدید " کے نام سے قائم کیا۔ انھوں نے جدید ارد وادیبوں کی

کتابیں چھاپنے کے علاوہ قیام پاکستان کے بعد سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری کی ادارت میں " اردوادب " نام کا ادبی رسالہ بھی نکالا تھا۔(۶۷)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لاہور کے ادبی ماحول میں بدلتے ہوئے منظرنامے کی عکاسی اردو آپ بیتیوں میں لاہور کے اشاعتی اداروں اور رسائل وجرائد کے حوالے سے بھی بڑی مہارت سے کی گئی ہے۔ وہ آپ بیتی نگار جنھوں نے لاہور کے ادبی منظرنامے میں رسائل وجرائد سے وابستگی رکھی یا ان کے مستقل قارئین میں شامل تھے، ان کے ہاں ان اداروں اور رسائل وجرائد کا تذکرہ بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد لاہور کے ادبی منظرنامے پر کئی اشاعتی ادارے سامنے آئے اور کئی نئے ادبی رسائل وجرائد جاری ہوئے ، اردو آپ بیتی نگاروں اوریادداشتوں نے اپنی تخلیقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے۔ یوں آپ بیتی اوریادداشتوں میں لاہور کے ادبی منظرنامے کا یہ پہلو بھی بڑی شدت سے اجاگر ہوا ہے ۔ تقسیم کے بعد لاہور کے ادبی منظرنامے اشاعتی اداروں اور رسائل وجرائد کے حوالے سے جو تبدیلی پیدا ہوئی اس کا جائزہ لیا جائے تو دو اہم رخ سامنے آتے ہیں۔ ایک رخ ان اشاعتی اداروں کی بربادی کا ہے جو تقسیم سے قبل یہاں موجود تھے لیکن تقسیم کے بعد نااہل لوگوں کے ہاتھ جانے کے بعد بربادی کا شکار ہوگئے۔ دوسرا پہلو مثبت نوعیت کا ہے کہ بہت سے نئے اشاعتی ادارے وجود میں آئے اور کچھ پہلے سے موجود ادارے بھی متحرک ہوئے۔ جس کی وجہ سے ادبی کتب کی اشاعت کے ساتھ ساتھ رسائل وجرائد بھی کثیر تعداد میں شائع ہونے لگے۔ ان میں چھپنے والی دبی تخلیقات عوام تک پہنچنے سے لاہور کے ادبی مزاج کی تشکیل میں معاونت ہوئی۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی میں بدلتے ہوئے تنقیدی منظرنامے میں بہت سے ایسے تنقیدی رجحانات سامنے آئے جنھوں نے پہلے سے موجود تنقید ی رجحانات اور افکار سے الگ راہ اپناتے ہوئے ادب کی تفہیم وتعبیر کا فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ ان رسائل وجرائد میں شائع ہونے والے مضامین نے ان رجحانات سے بھی آگاہی دلائی ہے۔ اردو آپ

بیتیوں اور یادداشتوں میں ان اشاعتی اداروں اور رسائل وجرائد کی ادبی اور تنقیدی خدمات کو بڑے احسن انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

جب بھی کوئی خطہ یا شہر ادبی حوالے سے وسعت اختیا کرتا ہے تو اس خطے یا شہر میں آباد ادیبوں میں مختلف نظریات وافکار پروان چڑھنے لگتے ہیں۔ یہ افکار و نظریات ایک طرف ادبی منظرنامے کو وسعت عطا کرتے ہیں تو دوسری طرف ادبی شخصیات کے مابین چپقلش اور مخاصمت کا بھی سبب بنتے ہیں۔اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی بدلتی ہوئی ادبی صورت حال کا جائزہ لینے سے اس حقیقت سے بھی آشنائی ہوتی ہے کہ آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے مختلف ادیبوں کے مابین پائے جانے والے نظریاتی اختلافات کے ساتھ ساتھ باہمی چپقلش کو بھی نمایاں کیا ہے۔ انتظار حسین کی یادداشتوں کے مجموعے "چراغوں کا دھواں" میں لاہور کی ادبی شخصیات کا تذکرہ انہوں نے اس انداز میں کیا ہے کہ مختلف شخصیات کے درمیان ہونے والی چپقلش اور ادبی مخاصمت بھی سامنے آتی ہے۔ لاہور ادبی حوالے سے ایک بڑا مرکز ہے۔ماضی میں بھی اس میں ادیبوں کی کثیر تعداد آباد ہونے کے ساتھ ساتھ ہر ادبی تنظیم نے بھی یہاں سے عروج حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی وسیع ادبی فضا میں تمام ادیبوں کا ایک نظریے یا ایک ادبی نکتے پر متفق ہونا کسی طور پر بھی ممکن نہ تھا۔ مختلف ادبی اور تنقیدی نظریات اوران کے زیر اثر ادب تخلیق کرنے والی مختلف شخصیات سامنے آتی رہتی تھیں جن کی آپس میں چپقلش اور مخاصمت بھی چلتی رہتی تھی۔

انتظار حسین نے جب لاہور کو مسکن بنایا تو انھوں نے اپنی دیگر ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ مختلف ادبی رسائل وجرائد کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیے۔ خود چوں کہ رجعت پسندانہ افکار کے مالک تھے، اس لیے ترقی پسند مصنفین کو کسی قدر کھٹکتے بھی تھے۔ خاص طور پر کسی ترقی پسند جریدے کی ادارت ان کے ہاتھ میں آنا ترقی پسندوں کو کسی طور پر بھی قابل قبول نہ تھا۔ اگرچہ وہ خود بھی اس معاملے میں محتاط رہتے تھے، لیکن اس کے باوجود رجعت پسندوں اور ترقی پسندوں کے مابین نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔ جب ترقی پسند مصنفین پر زوال آیا اور بہت سے وہ رسائل وجرائد جو ترقی پسندیت کا

پرچار کررہے تھے، ان کی پالیسی بھی بدلتی چلی گئی۔ انہی دنوں انتظار حسین کو "ادب لطیف" کی ادارت سونپی گئی۔ اس کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کی چپقلش کو یوں سامنے لاتے ہیں:

> لیجیے پھر ایک ادبی پرچے کی ادارت میرے نام لکھی گئی۔ نذیر چودھری نے پہلے ناصر سے مسکوٹ کی، پھر افتخار چودھری کو لے کر ٹی ہاؤس آئے۔ کہا کہ ان دنوں تو تم اخبار سے فارغ ہو، ادب لطیف کی ادارت سنبھالو۔ میں نے کہا" چودھری صاحب، میں تو رجعت پسند ہوں" ادب لطیف" سدا کا ترقی پسند، میرا اس کا کیا جوڑ۔ مگر زمانہ ادھر بھی تو بدل گیا تھا۔ جب سویرا ترقی پسند نہ رہا تو ادب لطیف کتنے دن اس لکیر کا فقیر بنا رہ سکتا تھا۔ سو سمجھوتہ ہو گیا۔ مگر ادھر میری ادارت کی خبر نکلی ادھر ترقی پسندوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ ترقی پسندوں کا ایک ہی تو ٹھیا رہ گیا تھا۔ اس پر بھی ایک رجعت پسند کو لا کر بٹھا دیا۔(٦٨)

ایسا صرف انتظار حسین کے ساتھ ہی نہیں ہوا تھا بلکہ لاہور کی ادبی صورت حال کے بارے میں یادداشتوں اور آپ بیتیوں میں اس مخاصمت اور باہمی چپقلش کا دائرہ خاصا وسیع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ لاہور ادبی حوالے سے وسعت کا حامل ہونے کی وجہ سے ادیبوں اور شاعروں کا اہم مسکن رہا ہے۔ قیام پاکستان سے قبل بھی یہاں موجود ادیب اور شعرا اپنے افکار و نظریات کے حوالے سے اپنی خاص پہچان رکھتے تھے۔ نہ صرف بیرون لاہور بلکہ اندرون لاہور بھی مختلف ادیبوں کے نظریات اور افکار کو دیکھا جائے تو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادیب ایک دوسرے کے نظریات سے اختلاف بھی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ لاہور میں قائم ہونے والی ادبی تنظیموں اور مختلف رسائل و جرائد میں بھی ایک دوسرے کے نظریات وافکار پر تنقید کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ اس صورت حال سے ایک طرف ادیبوں میں پائے جانے والے نظریاتی اختلافات سے آگاہی ہوتی ہے

تو دوسری طرف لاہور کی ادبی فضا میں تحرک بھی سامنے آتا ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر اپنی خود نوشت میں ادبی اختلاف کے متعلق بیان کرتے ہیں اور یہ اختلاف ان کے مخالف کی طرف سے اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ان کی جان کو خطرہ لاحق تھا وہ لکھتے ہیں:

> اس کا جواب تھا کہ ادبی طور پر تو میں سلیم اختر کا کچھ نہ بگاڑ سکا، یہ پہلا موقع ہے کہ وہ میرے قابو آیا ہے اگر میں نے ملاؤں کے ہاتھوں اس کے گھر کو آگ نہ لگوا دی اور اسے قبر تک نہ پہنچا دیا تو میرا بھی نام۔۔۔ نہیں۔(۶۹)

لاہور کی ادبی فضا اسی صورت حال میں ترقی کے منازل طے کرتی چلی گئی۔ ایک طرف لاہور کے ادیبوں کے مابین نظریاتی اختلافات شخصی سطح پر موجود تھے تو دوسری طرف ان نظریات و افکار کا اظہار رسائل و جرائد میں شائع ہونے والے مختلف مضامین کی صورت میں بھی ہو رہا تھا جس کی وجہ سے ادب سے وابستہ نو آموز لکھاریوں کو بہت کچھ سیکھنے کو بھی مل رہا تھا اور کہنہ مشق لکھاریوں اور ناقدین کے درمیان پائے جانے والے اختلافات بھی سامنے آرہے تھے۔

لاہور جو کبھی ادبی میل جول اور محفلوں کا گہوارہ تھا، وقت کے تغیر کے ساتھ اپنی پرانی روایات سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ وہ زمانہ جب ادیب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر بیٹھتے، ادب پر بحث کرتے اور نئے رجحانات پر گفتگو کرتے تھے، رفتہ رفتہ کمزور پڑ گیا ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ آج کا زمانہ بہت تیز رفتار ہو چکا ہے اور ہر شخص وقت کی کمی کا شکار ہے، جس کے باعث وہ ادبی محفلوں اور ذاتی ملاقاتوں کے بجائے مصروفیات میں الجھا ہوا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ وہ پرانا رشتہ اور ذوقِ گفتگو مدھم پڑتا جا رہا ہے۔ انہی خیالات کا اظہار ڈاکٹر سلیم اختر نے یوں کیا ہے:

> لاہور کے چند احباب کا تذکرہ قلم بند کرنے کے بعد سوچ رہا ہوں کہ چند برس کے اندر اندر ہمیں کیا ہو گیا ہے؟ پہلے ہم ایک دوسرے کے گھروں میں جاتے، چائے پیتے، بحثیں کرتے، زبانوں کی اُلٹی اتارتے، شعر سنتے سناتے، نئی کتابوں یا

تازہ تحریروں پر گفتگو کرتے مگر اب جیسے کسی دیو پلید نے چھو منتر سے یک لخت
منظر تبدیل کر دیا۔ یوں کہ اب کسی کے پاس کسی سے ملنے کے لیے وقت ہی
نہیں رہا۔۔۔(۷۰)

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کا ادبی منظر نامہ عہد بہ عہد ارتقائی مراحل طے کرتے ہوئے دکھائی دیتا ہے۔ آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور میں زندگی کا جو حصہ بسر کیا، اس کی عکاسی کرتے ہوئے انہوں نے لاہور کے ادبی ٹھکانوں، مراکز، ادبی محافل، مشاعروں، ادبی شخصیات اور دیگر ادبی حوالوں کو بڑے معتبر انداز اور بے ساختہ انداز میں بیان کیا ہے۔ ادبی حوالے سے لاہور کو جو مرکزیت حاصل ہے، اس کی وجہ سے قیام پاکستان سے قبل اور بعد از تقسیم لاہور میں ادبا اور شعرا کی خاصی تعداد آباد رہی۔ ان ادیبوں اور شاعروں نے جن ادبی تنظیموں کا ڈول ڈالا، جن ادبی تحریکوں کی بنیاد ڈالی، جن ادبی محافل اور ادبی ٹھکانوں کی رونق بنے اور جس طرح ادیبوں کی آپس میں معاصرانہ چشمک پیدا ہوئی، ان سب کی عکاسی اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ملتی ہے۔

لاہور ادبی حوالے سے ایک ایسے مرکز کے طور پر سامنے آتا ہے، جس کی ادبی فضا میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تغیر بھی پیدا ہوتا گیا۔ اس تغیر کی بڑی وجہ وہ سیاسی، سماجی اور ادبی حالات تھے جن سے لاہور اور خاص طور پر اس کی ادبی فضا گزر رہی تھی۔ قیام پاکستان سے قبل مشترکہ سماجی اور ادبی منظر نامہ اور قیام پاکستان کے بعد ہجرت اور تقسیم کے مسائل اس شہر کی ادبی فضا کو متغیر کرنے میں اہم عنصر ثابت ہوئے۔ مختلف ادیبوں کا یہاں سے چلے جانا اور تقسیم کی وجہ سے بہت سے ادبا کا بھارت سے لاہور منتقل ہو جانا بھی لاہور کی ادبی فضا کو بدلنے کا باعث بنا۔ اس کے علاوہ بیسویں صدی میں اٹھنے والی مختلف ادبی تحریکیں اور وجود میں آنے والی ادبی تنظیموں نے بھی اس شہر بے مثال کے ادبی منظر نامے میں تحرک پیدا کیا۔ بیسویں صدی کے ادبی تنقیدی نظریات نے بھی شہر کی ادبی فضا کو بدلنے میں اپنا حصہ ڈالا یوں تغیر اور ارتقا کا یہ سفر ہر دور میں جاری رہا اور اردو آپ بیتی اور یادداشتوں میں اس کی

عکاسی بڑے عمدہ انداز میں کی گئی۔ لاہور کی ادبی فضا کو بدلتے ہوئے رجحانات کے مطابق سمجھنے میں یہ آپ بیتیاں اور یادداشتیں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

لاہور پر تحقیقی کام کرتے ہوئے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ یہ شہر محض اینٹ اور پتھر کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک ایسا سمندر ہے جس کی گہرائیوں میں ثقافت، ادب اور سماج کے بے شمار رنگ اور جہتیں پوشیدہ ہیں۔ اس کے ہر گوشے میں تہذیبی لطافت، فکری وسعت اور ادبی شگفتگی کی وہ جھلکیاں ملتی ہیں جو کسی اور خطے میں یکجا دکھائی نہیں دیتیں۔ لاہور نے صدیوں سے اپنے دامن میں ایسے تجربات اور کیفیات سمیٹ رکھے ہیں جو اس کے باسیوں کے طرزِ زندگی، ان کے ذوقِ سخن اور ان کی معاشرتی روش میں نمایاں ہو کر سامنے آتے ہیں۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے آئینے میں ان پہلوؤں کو ٹٹولنے کی کوشش کی گئی ۔ تاکہ ان پوشیدہ رنگوں کو اجاگر کیا جا سکے جو لاہور کو صرف ایک شہر نہیں بلکہ ایک زندہ اور سانس لیتا ہوا ثقافتی استعارہ بنا دیتے ہیں۔ ان تحریروں میں شہر کی محفلوں کی رونقیں، علمی و فکری نشستوں کی گہما گہمی اور معاشرتی اقدار کی جڑیں اپنی پوری صداقت کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہیں۔ یہی آپ بیتیاں اور یادداشتیں ہمیں لاہور کی ان شناختوں سے روشناس کراتی ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر رہیں مگر اپنی اصل روح کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ اس طرح لاہور پر یہ تحقیق نہ صرف اس کے ادبی اور ثقافتی پس منظر کو روشن کرتی ہے بلکہ قاری کو یہ احساس بھی دلاتی ہے کہ لاہور ایک عہد نہیں بلکہ صدیوں پر محیط تہذیبی تسلسل کا استعارہ ہے، جسے سمجھنے کے لیے بار بار اس کی وسعتوں میں جھانکنا پڑتا ہے اور ہر بار ایک نیا جہان سامنے آتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ سعدیہ نور، جدید شعری رویوں کا مرکز، قدیم لاہور : ایک تعارف، مشمولہ، تحقیق نامہ، شمارہ ۶، ۲۰۰۹ء گورنمنٹ کالج یونی ورسٹی، لاہور، ص ۲۲۱

۲۔ کنہیا لال ہندی، تاریخ لاہور، (مرتب) کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء، ص ۱۷

۳۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱

۴۔ ایضاً، ص ۱۸

۵۔ سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی، طبع ہشتم، ۱۹۸۹ء، ص ۳۰۰-۳۰۱

۶۔ ایضاً، ص ۲۹۵

۷۔ ایضاً، ص ۳۳۵

۸۔ شہرت بخاری، پنجاب کی ادبی تحریکیں، مشمولہ، اخبار اردو، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، مارچ اپریل ۲۰۰۴ء، ص ۲۳۴

۹۔ عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۲۲

۱۰۔ انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۹۹ء، ص ۳۲۹

۱۱۔ غلام حسین، ڈاکٹر، تاریخ یونیورسٹی اور ئینٹل کالج، جدید اردو پریس، لاہور، ۱۹۶۲ء، ص ۲۰

۱۲۔ علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستانِ شاعری، ص ۲۵۸

۱۳۔ ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، کراچی، ۱۹۹۲ء، ص ۱۹۵

۱۴۔ سجاد باقر رضوی، ڈاکٹر، پیش لفظ، لاہور کا دبستانِ شاعری مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء، ص ۹

۱۵۔ وہاج الدین علوی، اردو خود نوشت: فن و تجزیہ، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء، ص ۵۰

۱۶۔ محمد سعید، آہنگ باز گشت، کمانڈو پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۵۶

۱۷۔ اے حمید، یادوں کے گلاب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص ۳۴

۱۸۔ ایضاً، ص۳۹

۱۹۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء، ص۸۸

۲۰۔ ایضاً، ص۸۰

۲۱۔ اے حمید، لاہور۔لاہور اے، الفیصل ناشران کتب، لاہور ،۲۰۰۸ء، ص۱۳۵

۲۲۔ ایضاً، ص۱۳۴

۲۳۔ محمد سعید، آہنگ بازگشت، ص۵۶-۵۷

۲۴۔ ملک غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء ایضاً، ص۴۰

۲۵۔ احسان دانش، جہانِ دانش ، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۳۸۷

۲۶۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء، ص۱۶۵

۲۷۔ ایضاً، ص۱۶۶

۲۸۔ اے حمید، لاہور۔لاہور اے، ص۱۶۰

۲۹۔ مرزا ادیب، مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۴، ص۳۵۹

۳۰۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص۴۷

۳۱۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص۴۳

۳۲۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص۱۶۹

۳۳۔ نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ ،سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص۱۷۳

۳۴۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص۱۶۹

۳۵۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص۸۰

۳۶۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص۱۰۷

۳۷۔ مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوارگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص۲۸۳

۳۸۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص۴۴

۳۹۔ ایضاً، ص۸۶

۴۰۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۱۴۴

۴۱۔ شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، ص ۱۰۵-۱۰۶

۴۲۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۱۳

۴۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷، ص ۲۶۵

۴۴۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، ص ۱۱۶

۴۵۔ ایضاً، ص ۱۱۶

۴۶۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، القا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء، ص ۲۱۰

۴۷۔ ایضاً، ص ۲۲۱

۴۸۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۱۶۶

۴۹۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۳۴۹-۳۵۰

۵۰۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، ص ۲۱۱

۵۱۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۶۹-۷۰

۵۲۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۳۷

۵۳۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، ص ۲۶۴

۵۴۔ احسان دانش، جہانِ دانش، ص ۳۵۳

۵۵۔ انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، ص ۱۱۲

۵۶۔ ایضاً، ص ۱۱۵

۵۷۔ احسان دانش، جہانِ دانش، ص ۳۸۸

۵۸۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، اپنا گریباں چاک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء، ص ۳۴

۵۹۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، ص ۲۲۱

۶۰۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۶۱۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۱۷۱-۱۷۲

۶۲۔ شاہد حمید، گئے دن کی مسافت، ص ۲۲۲

۶۳۔ ایضاً، ص ۲۱۴

۶۴۔ طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور، ص ۱۷۳

۶۵۔ ایضاً، ص ۲۱۵

۶۶۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۶۷۔ ایضاً، ص ۲۲۲

۶۸۔ انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ص ۱۷۳

۶۹۔ سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، ص ۲۶۲

۷۰۔ ایضاً، ص ۲۵۰

باب پنجم

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ

لاہور کا شمار برصغیر کے ان شہروں میں ہوتا ہے جو صدیوں سے سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی روایات اور اقدار کے امین ہیں۔ برصغیر کی وہ روایات جو صدیوں سے اس خطے کا طرۂ امتیاز رہی ہیں، اس شہر نے بھی ان کی آبیاری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

تقسیم سے قبل کے سماج کا جائزہ لیا جائے تو ہندوستان پر اگرچہ انگریزوں کا قبضہ تھا اور بہت سی انگریزی روایات واقدار اس سماج کا حصہ بنتی جارہی تھیں، تاہم یہ سماج ایک ایسے مشترکہ سماج کا منظر پیش کرتا تھا جس میں مختلف مذاہب اور مختلف اقوام سے تعلق رکھنے والے لوگ باہمی سماجی منظرنامہ تشکیل دیے ہوئے تھے۔ اس سماجی منظرنامے میں لاہور میں بسنے والی مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے سماجی، تہذیبی اور ثقافتی رنگ بکھرتے دکھائی دیتے ہیں۔

تقسیم ہند کا واقعہ برصغیر کی تاریخ کا ایسا واقعہ تھا جس نے ہر شعبہ زندگی کو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ صدیوں سے بنے بنائے سماجی ڈھانچے کو بھی شکست وریخت کا شکار کر دیا۔ اس واقعے سے جو شہر سب سے زیادہ متاثر ہوئے، ان میں لاہور بھی شامل تھا۔

ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو لاہور مغلیہ سلطنت سے قبل ہی ادب کا گہوارا بننا شروع ہو گیا تھا۔ غزنی عہد میں یہ شہر علم وادب کے حوالے اپنی اہمیت منوا رہا تھا۔ بعد میں مغل شہنشاہ اکبر کے دور میں یہ شہر علم وادب اور تہذیب وثقافت میں تیزی سے ترقی کرتا دکھائی دیتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے دیگر خطوں کی طرح یہ شہر بھی مختلف حکمرانوں کے زیر تسلط رہا، جن میں سے بعض نے یہاں علم وادب کے فروغ میں اہم اقدامات کیے۔

اردو ادب میں آپ بیتی اور یادداشت نگاری ایسی اصناف ہیں جو تخلیق کار کے ذاتی حالات، ذاتی تجربات اور شخصی میلانات اور رجحانات کا منبع ہوتی ہے۔ ایک تخلیق کار زندگی کے جن مراحل سے گزرتا ہے اور جن سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی، معاشی اور ادبی حالات میں اس کے شب وروز بسر ہوئے ہوتے ہیں، جب وہ آپ بیتی کی صورت میں اپنی زندگی کی کتھا بیان کرتا ہے تو یہ تمام حالات اس کے لیے تخلیقی مواد فراہم کرتے ہیں۔ اس نے زندگی میں جن حالات وواقعات کا سامنا کیا ہوتا ہے وہ جب اس کے تخلیقی تجربے میں ڈھل کر آپ بیتی یا یادداشت کی صورت میں سامنے آتے ہیں تو یہ آپ بیتی اور یادداشتیں نہ صرف اس تخلیق کار کی زندگی کو سامنے لاتی ہیں بلکہ اس خطے، شہر اور عہد کی عکاسی بھی کرتی ہیں جن سے تخلیق کار کا تعلق ہوتا ہے۔ اس تناظر میں لاہو ر کے حوالے سے اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ لاہور چوں کہ سیاسی، سماجی اورادبی حوالے سے خاصا متحرک شہر رہاہے۔ ہر عہد میں اس کی سیاسی، سماجی اور ادبی حیثیت مسلم رہی ہے، اس لیے اردو آپ بیتیوں اوریادداشتوں میں بھی یہ شہر پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتاہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ تقسیم سے قبل اور بعد میں یہ شہر ادب اور سیاست کا بھی اہم مرکز رہاہے۔ اب بھی یہی صورت حال ہے۔ یوں اروو آپ بیتی اور یادداشت نگاروں میں سے اکثریت ایسے تخلیق کاروں کی سامنے آتی ہے جنہوں نے اپنی زندگی اس شہر میں گزاری یا کسی بھی طرح اس سے وابستہ رہے۔ ایسے تخلیق کاروں نے جب آپ بیتی اوریادداشتوں کی صورت میں اپنی زندگی کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا تو شعوری اور لاشعوری طور پر ان آپ بیتیوں میں لاہور کے مختلف رنگ اور مختلف پہلو سموتے چلے گئے۔ یوں ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میں آپ بیتی اور یادداشت نگاری پر مبنی تخلیقات میں تخلیق کاروں کے عہد کے ساتھ ساتھ لاہور کا سماج، تہذیب، ثقافت اور ادبی صورت حال کی عکاسی بھی بڑے مؤثر انداز میں ہوئی ہے۔ زیر نظر مقالہ میں اردو آپ بیتیوں اوریادداشتوں میں لاہور کی سیاسی، سماجی، تہذیبی اورادبی صورت حال قبل از تقسیم اور بعد از تقسیم کے بدلتے ہوئے تناظر میں تلاشنے کی کوشش کی گئی ہے۔

سیاسی حوالے سے دیکھا جائے تو اردو میں ہمارے سامنے دو طرح کی آپ بیتیاں آتی ہیں۔ ایک وہ آپ بیتیاں ہیں جو اردو کے مختلف ادیبوں اور شعرا نے تخلیق کی ہیں۔ ان میں وہ ادیب اور شعرا جن کی زندگی کا کچھ حصہ لاہور میں گزرا یا انہوں نے زندگی بھر لاہور کو ہی اپنا مسکن بنایا ہے۔ وہ لاہور کے سماجی منظر نامے سے بھی متاثر ہوئے۔ لاہور میں ہونے والی سرگرمیاں ان کی زندگی کا حصہ رہی ہیں جس کی وجہ سے یہ سرگرمیاں آپ بیتی اور یادداشت نگاری کے وقت ان کے تخلیقی تجربے کا بھی حصہ بنی ہیں۔ اس میں بھی ہمارے سامنے دو طرح کے ادیب آتے ہیں۔ پہلی قسم کے وہ ادیب ہیں جنہوں نے قیام پاکستان کے قبل سے لے کر اپنی زندگی کے آخری ایام تک مستقل طور پر لاہور کو اپنا مسکن بنائے رکھا۔ ایسے ادیبوں کی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں قیام پاکستان سے قبل اور بعد از تقسیم لاہور کی سیاسی زندگی کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ ان ادیبوں میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو کسی خاص سیاسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی زندگی کی نشیب و فراز میں سیاسی رنگ بھی جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔ سیاسی وابستگی کی وجہ سے ان کی آپ بیتیوں میں عموماً اپنی پسندیدہ سیاسی جماعت کی تعریف و توصیف بھی ملتی ہے اور مخالف سیاسی نظریات رکھنے والوں پر تنقید بھی۔ دوسری قسم کے ادیب وہ ہیں جو تقسیم کے عمل کے دوران ہجرت کر کے ہندوستان سے پاکستان آئے اور لاہور کو اپنا نیا مسکن بنایا۔ ان ادیبوں کی آپ بیتیوں کا سیاسی حوالے سے جائزہ لینے سے اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ ایسے ادیبوں کے ہاں لاہور کو جو سیاسی منظر نامہ سامنے آتا ہے، اس میں زیادہ مؤثر بیان ان سیاسی عناصر اور سیاسی واقعات کا ہے جو تقسیم کے بعد لاہور میں واقع ہوئے۔

قیام پاکستان کے بعد کے لاہور کے سیاسی منظر نامے کا جائزہ لیا جائے تو تقسیم کے بعد کا لاہور تقسیم سے قبل کے لاہور سے سیاسی حوالے سے خاصا مختلف دکھائی دیتا ہے۔ اس کی وجہ وہ سیاسی مقاصد ہیں جو سیاسی منظر نامے کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ لاہور سے قبل کا سیاسی منظر نامہ اقتدار کے حصول کے ساتھ ساتھ فرنگی سامراج سے نجات یا ان کی حمایت کے عنصر پر بھی مشتمل تھا۔ اس سیاسی منظر نامے میں ہونے والی سیاسی سرگرمیاں بھی انہی مقاصد کے تحت تھیں۔ فرنگی سامراج لاہور کی تاریخی اور جغرافیائی اہمیت کے پیش نظر سیاسی حوالے سے اسے اہم سمجھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی من پسند شخصیات کو

اقتدار سونپنے کے لیے اقلیت کو اکثریت اور اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کا رواج اس وقت بھی جاری تھا۔ یوں اس دور کی عکاسی کرتے ہوئے جن ادیبوں نے اپنی یادداشتوں اور آپ بیتیوں میں تقسیم سے قبل کے لاہور کا نقشہ کھینچا ہے انہوں نے انہی منفی طرز کی سیاسی روشوں اور سیاسی سوچ کی بھی عکاسی کی ہے۔ اس کے علاوہ ان آپ بیتیوں میں بعض ایسے عناصر بھی سامنے آتے ہیں جن میں سیاسی حوالے سے قیام پاکستان کی جدوجہد بھی شامل ہے۔ مسلم قائدین نے سیاسی محاذ پر قیام پاکستان کی جو جنگ لڑی اور ہندوستان کی دیگر اقوام بھی اس عمل میں جس طرح شریک کار رہیں، ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اس کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔

لاہور کے سیاسی منظرنامے کی عکاسی کرتے ہوئے ان ادبا کی آپ بیتیوں کا مطالعہ بھی شامل ہے جو تقسیم کے بعد لاہور میں آئے اور پھر یہاں بس گئے۔ ان کی آپ بیتیوں میں اگرچہ تقسیم سے قبل کے بھی سیاسی حالات ملتے ہیں لیکن لاہور کے حوالے سے انہوں نے تقسیم کے بعد کی سیاست کو ہی موضوع بنایا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تقسیم کے بعد وہ لاہور کے سیاسی منظرنامے میں خود شامل تھے۔ انہوں نے یہاں مختلف سیاسی جماعتوں کے قیام اور پروان چڑھنے کا مشاہدہ کرنے کے ساتھ ساتھ مختلف انتخابات اور بنتی ٹوٹتی حکومتوں کی روش کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پر اس کے اثرات بھی محسوس کیے۔ یہی وجہ ہے کہ ان آپ بیتیوں میں ان عناصر کی پیش کش زیادہ ملتی ہے جو تقسیم کے بعد پاکستان کے سیاسی منظرنامے کی تشکیل میں معاونت کرتے ہیں۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کی پیش کش کے حوالے سے وہ آپ بیتیاں بھی اہمیت کی حامل ہیں جو مختلف سیاسی قائدین نے تحریر کی ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں اگرچہ پاکستان بھر کے سیاسی حالات کی پیش کش ملتی ہے تاہم وہ سیاسی اکابرین جن کا تعلق لاہور یا پنجاب سے تھا اور لاہور کے سیاسی مرکز ہونے کی وجہ سے وہ یہاں کے سیاسی حالات کو قریب سے دیکھتے تھے، انہوں نے لاہور کی سیاست کے بدلتے رنگ اپنی آپ بیتیوں میں بڑے احسن انداز میں بیان کیے ہیں۔ یوں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں لاہور کی سیاسی تاریخ کو اپنے دامن میں سموئے

ہونے کے ساتھ ساتھ برصغیر کے بدلتے ہوئے سیاسی منظر نامے کے تناظر میں لاہور کی سیاسی فضا میں آنے والی تبدیلیوں کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں سے لاہور کے سیاسی منظر نامے کی تفہیم میں خاصی معاونت ملتی ہے۔ یہ آپ بیتیاں چوں کہ براہ راست مشاہدے پر مبنی ہیں اس لیے ان میں لاہور کی سیاست کے مختلف رنگ حقیقی انداز میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

اردو آپ بیتیوں میں لاہور کے حوالے سے جو دوسرا اہم پہلو سامنے آتا ہے وہ لاہور کی سماجی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی ہے۔ لاہور تقسیم سے قبل مشترکہ سماج کا ایک عمدہ نمونہ تھا۔ یہاں دیگر مذاہب اور اقوام کے لوگ بھی آباد تھے۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے تقسیم سے قبل کے اس مشترکہ سماجی منظر نامے کی عکاسی ہوتی ہے جس میں دھرم کی اہمیت تو تھی لیکن وہ سماجی معاملات میں رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔ ایک ہی جگہ پر کام کرنے والے ایک دوسرے کے ساتھ سماجی روابط میں بندھے ہوتے تھے اور ایک دوسرے کی عزت اور توقیر لازم سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہندو جو گائے کا ماں کا درجہ دیتے ہیں اور ہندوستان میں گائے ذبح کرنے پر مسلمانوں کو اذیت کا نشانہ بنایا جاتا ہے، لاہور کے اس مشترکہ سماج میں وہ بڑے خلوص اور لگاؤ کے ساتھ مسلمان ساتھیوں کے ساتھ بیٹھ کر اسی گائے کا گوشت بھی کھالیتے تھے اور دیگر سماجی روابط بھی قائم رکھتے تھے۔ اردو آپ بیتی اور یادداشتوں میں تقسیم سے قبل کے اس مشترکہ سماج کا نقشہ دکھائی دیتا ہے۔

سماجی اور تہذیبی حوالے سے لاہور کا دوسرا اہم زاویہ مختلف تہواروں کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ تہوار کسی بھی سماج کی شناخت میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں۔ اردو آپ بیتیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے تقسیم سے قبل اور بعد از تقسیم کے لاہور میں بھی سماجی اور تہذیبی سطح پر تہواروں کو خاص انداز سے منایا جاتا تھا۔ اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہ تھی بلکہ جس مذہب کا بھی تہوار ہوتا، اس تہوار پر لاہور کی اکثریت اسی تہوار کے رنگ میں ڈوبی دکھائی دیتی۔ سماجی حوالے سے تہواروں پر ایک دوسرے سے ملنا اور ایک چاہت کا اظہار کرنا بھی لاہور کی سماجی اقدار میں اہم مقام رکھتا ہے۔ تہوار مذہبی عقیدت کے ساتھ ساتھ سماجی حوالے سے بھی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ وہ لڑائیاں اور رنجشیں جو

پورا سال جاری رہتی تھیں، تہواروں پر ایک دوسرے کے گلے لگ کر وہ بھی ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ لاہور کے سماج کا وہ حسین چہرہ ہے جو ماضی میں موجود تھا اور آج بھی کسی نہ کسی صورت میں یہ اپنا وجود برقرار رکھے ہوئے ہے۔ آپ بیتی نگار اور یادداشت نگار بھی چوں کہ سماجی شخصیات ہوتی ہیں۔ سماج سے نہ صرف ان کا قریبی تعلق ہوتا ہے بلکہ وہ اپنے تخلیقی موضوعات بھی اسی سماج سے ہی اخذ کرتے ہیں۔ لاہور کے حوالے سے دیکھیں تو ان سماجی تخلیقی شخصیات نے لاہور کے سماجی اور تہذیبی منظر نامے کو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے ذریعے بڑے احسن انداز میں پیش کیا ہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے سماجی منظر نامے کے حوالے سے ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان تخلیق کاروں نے لاہور کے سماج کے متنوع رنگوں کو نمایاں کیا ہے۔ یہ سماجی شخصیات اپنی یادداشتوں کے ذریعے اس لاہور کو سامنے لاتے ہیں ،جو حقیقی سماج تھا اور اس میں ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس کرنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ سماجی تعلقات کی استواری اور مضبوطی کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس سلسلے میں ہر کوئی پہل کرنے کی کوشش کرتا تھا جس کی وجہ سے سماج میں امن اور آشتی اور بھائی چارے کی فضا قائم تھی۔

سماجی اور تہذیبی حوالے سے لاہور کے تہواروں کی ایک جہت ثقافتی حوالے سے بھی سامنے آتی ہے۔ یہ تہوار لاہور کی ثقافت کے رنگوں کی عمدہ ترجمانی کرتے ہیں۔ آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے اس حقیقت سے آشنائی ہوتی ہے کہ لاہور کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں اور آپ بیتیوں میں مختلف تخلیق کاروں نے لاہور کی ثقافت کے کئی رنگ بھی نمایاں کیے ہیں۔ ان آپ بیتیوں میں لاہور کی وہ ثقافت جو مختلف مذاہب اور مختلف اقوام کی ثقافتی اقدار سے تشکیل پاتی ہے، اس کی عکاسی ملتی ہے۔ تہوار کے موقع پر ایک دوسرے کے گلے ملنا اور پھر خود دعوت دے کر دوسروں کو اپنے گھر لے جانا اور مٹھائی اور دیگر لوازمات کے ساتھ تواضع کرنا دراصل لاہور کے سماج کا وہ حقیقی روپ سامنے لاتا ہے، جو پرانے لاہور کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ آج بھی بعض گھرانوں میں رواج موجود ہے اور تہواروں کے مواقع پر ایک دوسرے کے گھروں کا رخ کیا جاتا ہے، لیکن مجموعی طور پر یہ سماجی روابط اب معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی جگہ اپنے

گھر والوں کے ساتھ مختلف پارکوں، سیر گاہوں اور قابل دید مقامات کا رخ کرنے کا رواج پروان چڑھ رہا ہے۔ اس کی وجہ مختلف سماجی عناصر اور بدلتا ہوا سماجی منظر نامہ ہے۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں اس سماجی منظر نامے کی عکاسی بڑے جاندار انداز میں ہوئی ہے۔ آپ بیتی نگاروں نے لاہور کی ثقافتی اور سماجی زندگی میں آنے والی ان تبدیلیوں کے محرکات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ تخلیق اس بدلاؤ کے عمل میں خود شریک رہے ہیں۔ انہوں نے بدلتے ہوئے حالات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اور خود پر محسوس کیا ہے۔ اس بدلاؤ کے سماجی اور ثقافتی اثرات ان کی تخلیقات میں آپ بیتی اور یادداشتوں کی صورت میں جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو لاہور کے سماج کی جو عکاسی اردو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے کی ہے، اس میں ایک طرف مشترکہ سماج کی عکاسی ملتی ہے تو دوسری طرف ایسے سماج کی عکاسی بھی ملتی ہے جس میں کسی حد تک مذہبی بنیاد پر قائم کیے گئے تعصب کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ لاہور کا ذکر جن آپ بیتیوں میں ہوا ہے اور جن تخلیق کاروں نے اپنی یادداشتیں ترتیب دی ہیں ان میں انتہائی غیر جانب داری کے ساتھ ساتھ لاہور کے سماج کے ان دونوں پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے۔ اس سے ایک طرف لاہور کے سماج کی عکاسی ہوتی ہے تو دوسری طرف اس سماج کی عکاسی کرنے والے آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں کی غیر جانبداری بھی سامنے آتی ہے۔

اردو آپ بیتی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جن آپ بیتی نگاروں نے اس شہر کی رونق سے لطف اٹھایا اور اپنی زندگی کے ایام اس شہر میں بسر کیے ہیں، وہ اس کی سماجی حیثیت سے نہ صرف واقف ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی زندگی کے وہ تجربات جو اس شہر میں حاصل ہوئے ہیں، انھیں اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بھی بنایا ہے۔ اس شہر میں بسنے والے آپ بیتی نگاروں کی تخلیقات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ، یہ شہر انھیں اپنے اندر سرائیت کرتا ہوا محسوس ہوا اور دوسری اہم حقیقت یہ ہے کہ بہت سے آپ بیتی نگار ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی کا بہت سا حصہ اس شہر لاہور کے علاوہ دیگر شہروں میں بھی بسر کیا ہے، لیکن جس

طرح انھوں نے اس شہر کی سماجی اقدار کو اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے، ایسا دیگر شہروں کے ساتھ نہیں ہوا۔

لاہور مختلف اقوام کے ساتھ ساتھ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کا مسکن راہ ہے۔ قیام پاکستان سے قبل تو لاہور میں ہندو اور سکھ اس قدر زیادہ تعداد میں موجود تھے کہ پورے کے پورے محلے ہندوؤں اور سکھوں کے محلے کہلاتے تھے۔ آپ بیتی اور یادداشت نگاروں نے لاہور کے سماج کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس میں ہندوؤں کا اپنی مذہبی عبادات کی طرف رخ کرنا اور صبح سویرے گنگا نہانا کا نقشہ بھی بڑی مہارت سے کھینچا ہے۔ یہ ایک ایسا سماجی منظر نامہ ہے جو ہر مذہب کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسے مشترکہ سماج کی عکاسی کرتا ہے جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی سماجی اقدار کے امین بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ لاہور کے باسیوں کا صبح سویرے اٹھ کر تازہ ہوا میں سانس لینا، سیر کے لیے نکلنا ایک ایسی سماجی قدر کا درجہ اختیار کر چکا تھا، جس میں مذہب، قوم اور عمر کی تفریق کوئی معنی نہیں رکھتی تھی بلکہ ہر مذہب، ہر قوم اور ہر عمر کے لوگ اس سماجی عمل میں شریک ہوتے تھے۔ یہ عمل اگرچہ انفرادی سطح پر ہوتا تھا لیکن پورے لاہور کی اس میں شمولیت کی وجہ سے یہ ایک مجموعی سماجی قدر کا درجہ اختیار کر چکا تھا۔ لاہور کی سماجی اقدار اور تہذیبی روایات کے حوالے سے جن آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے اپنی تخلیقات میں نقشے کھینچے ہیں انہوں نے لاہور کے سماج کے ان مختلف پہلوؤں کو نمایاں کیا ہے، جن میں وہ خود شریک رہے ہیں۔ یوں ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے حقیقی سماج کے رنگ جھلکتے دکھائی دیتے ہیں۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے حوالے سے ایک اہم پہلو لاہور کی ادبی فضا کا بھی نمایاں ہوتا ہے۔ لاہور صدیوں قبل سے اپنی ادبی اور علمی حیثیت کا حامل رہا ہے۔ غزنوی عہد سے لے کر جدید عہد تک پہنچتے پہنچتے لاہور نے بے شمار ادبی نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے اس نشیب و فراز کو بھی بڑے احسن انداز میں اپنے تخلیقی تجربے کا حصہ بنایا ہے۔

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی ادبی صورت حال کا جائزہ لیا جائے تو آپ بیتی نگاروں اور یادداشت نگاروں نے تقسیم سے قبل اور بعد از تقسیم لاہور کے ادبی منظر نامے کی بھرپور انداز میں عکاسی کی ہے۔ اکثر آپ بیتی نگار خود ادیب تھے۔ وہ ادبی محفلوں اور ادبی سرگرمیوں میں شرکت کرنے کے ساتھ ساتھ لاہور کی ادبی فضا کا اہم حصہ بھی رہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات میں لاہور کی ادبی فضا کا حقیقی منظر نامہ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

ادبی حوالے سے دیکھا جائے تو لاہور انیسویں صدی اور بیسویں صدی میں بہت سی ادبی تنظیموں اور تحریکوں کا مرکز بھی رہا ہے۔ انجمن پنجاب، ترقی پسند تحریک، حلقہ ارباب ذوق اور دیگر بے شمار ادبی تنظیمیں اور تحریکیں اسی شہر سے اٹھیں اور ادبی دنیا میں نامور ہوئیں۔ ان تنظیموں اور تحریکوں کے اثرات بھی دیرپا تھے۔ لاہور کے بارے میں لکھی گئی یادداشتوں اور لاہور کی ادبی تنظیموں کی بہترین عکاسی ان آپ بیتیوں میں ملتی ہیں۔

لاہور میں ادیبوں کی کثیر تعداد موجود ہونے کی وجہ سے یہاں کے ادبی مراکز بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دور میں لاہور میں ادیبوں کے ٹھکانے موجود رہے ہیں۔ یہ ٹھکانے سماجی جگہیں ہوتی تھیں لیکن یہاں بڑے بڑے ادبی معرکے ہوتے تھے۔ کافی ہاؤس، پاک ٹی ہاؤس، نگینہ بیکری اور بے شمار ایسے ادبی ٹھکانوں کی نشاندہی اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ملتی ہے ۔ ان ادبی ٹھکانوں کی عکاسی کرنے کے ساتھ ساتھ آپ بیتی اور یادداشتوں کے تخلیق کاروں نے ان ٹھکانوں پر ہونے والی ادبی سرگرمیوں کے نقشے بھی کھینچے ہیں ۔ اس کے علاوہ ان ٹھکانوں پر ہی مختلف ادیبوں کے درمیان پائی جانے والی چپقلش، نظریاتی اختلافات اور اختلافات کے مخالفت میں بدلنے کے رجحانات کی عکاسی بھی ان آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ملتی ہے۔

لاہور کے ادبی منظر نامے میں ان رسائل وجرائد کا بھی نمایاں ہے جنہوں نے تقسیم سے قبل اور بعد از تقسیم لاہور کے ادبی منظر نامے کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرنے کے ساتھ ساتھ برصغیر کی ادبی فضا کو بھی متحرک کیا۔ مخزن، سویرا، ادب لطیف سمیت بے شمار ایسے ادبی رسائل وجرائد ملتے ہیں جن کے اجرا میں

لاہور کی ادبی فضا کا اہم عمل دخل ہے۔ لاہور سے جاری ہونے والے رسائل وجرائد کے مدیر بھی زیادہ تر ادیب ہی تھے۔ اس کے علاوہ دیگر ادیب ان رسائل وجرائد میں چھپتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تخلیق کاروں کی لکھی ہوئی آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کے ان رسائل وجرائد کا تذکرہ بھی بڑے احسن انداز میں ملتا ہے۔ لاہور سے جاری ہونے والے ان رسائل وجرائد نے ادبی فضا کو کس طرح متحرک کیا اور ان کے لاہور کے ادب پر کیا اثرات مرتب ہوئے ان کی عکاسی بھی اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں ملتی ہے۔ اس کے علاوہ لاہور میں ہونے والے مشاعرے اور دیگر ادبی سرگرمیاں بھی ان آپ بیتیوں کے ذریعے سامنے آتی ہیں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کا عہد بہ عہد بدلتا ہوا سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اور ادبی منظر نامہ جھلکتا دکھائی دیتا ہے۔

ب۔ نتائج

اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں لاہور کی عہد بہ عہد بدلتی ہوئی سیاسی، سماجی، تہذیبی، ثقافتی اورادبی صورت حال کا تفصیلی جائزہ اس مقالے میں پیش کیاجاچکاہے۔اس تحقیقی و تنقیدی مقالے کی تکمیل کے دوران میں جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ کچھ یوں ہیں:

۱. لاہور نہ صرف ایک تاریخی شہر ہے بلکہ اپنے منفرد سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی پس منظر کے باعث ایک نمایاں شناخت رکھتاہے۔ جس کی مخصوص روایات اور اقدار اسے دیگر شہروں سے ممتاز کرتی ہیں اور اس شہر نے ہر گزرتے عہد کے ساتھ اپنی شناخت کو سنوارا ہے۔

۲. لاہور سے جڑے تخلیق کاروں کی اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں میں شہر کی ادبی اور سماجی زندگی کی حقیقی عکاسی ملتی ہے جہاں ایک جانب ادب کی آبیاری جاری تھی تو دوسری جانب مختلف نظریات رکھنے والے اہل قلم کے مابین فکری چپقلش بھی نمایاں نظر آتی ہے۔

۳. اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں تقسیم سے قبل اور بعد کے سیاسی منظر نامے کو تفصیل سے بیان کرتی ہیں جن میں سیاست دانوں کے رویے، عوام کے سیاسی شعور اور سیاست کے بدلتے روپ واضح جھلکتے ہیں۔

۴. اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں لاہور کی ثقافتی زندگی کا اہم حوالہ ہیں جو تقسیم سے قبل کی مشترکہ تہذیبی اقدار اور تقسیم کے بعد ابھرنے والے متنوع ثقافتی رنگوں کی عکاسی کرتی ہیں۔

۵. آپ بیتیاں اور یادداشتیں محض ذاتی حالات وواقعات کی عکاس نہیں کرتیں بلکہ اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی منظر نامے کا معتبر حوالہ فراہم کرتی ہیں۔اردو آپ بیتیاں اور یادداشتیں لاہور کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی اقدار کے عہد بہ عہد ارتقااور بدلتی صورت حال کو نمایاں کرتی ہیں۔

ج۔ سفارشات / تجاویز

۱. اردو آپ بیتیوں میں اسلوب اور زبان کے تنوع کا منظم تحقیقی مطالعہ کیا جائے تا کہ اس تنوع کے پس منظر اور اسباب کو واضح کیا جا سکے۔

۲. اردو آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے غیر دریافت شدہ پہلوؤں کو تنقید اور تحقیق کا موضوع بنایا جائے۔

۳. لاہور کے علاوہ پنجاب کے مختلف خطوں کی سیاسی، سماجی، ثقافتی اور ادبی زندگی کو الگ الگ تحقیقی موضوعات کے طور پر سامنے لایا جائے۔

۴. لاہور اور پنجاب کے دیگر علاقوں کی ادبی فضا کے اشتراکات و افتراقات کا آپ بیتیوں اور یادداشتوں کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔

۵. آپ بیتیوں میں مذکور اہم ادبی و سیاسی شخصیات پر الگ تحقیقی کام کروایا جائے تا کہ ان کے نظریات اور کردار کو بہتر طور پر سمجھا جا سکے۔

کتابیات

بنیادی ماخذات:

ابوالحسن نغمی، یہ لاہور ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء

احسان دانش، جہانِ دانش ، خزینہ علم وادب، لاہور، ۲۰۰۲ء

انتظار حسین، جستجو کیا ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء

انتظار حسین، چراغوں کا دھواں ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

انیس ناگی، ایک ادھوری سرگزشت، جمالیات، لاہور، ۲۰۰۸ء

اے حمید، لاہور لاہور اے، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۸ء

اے حمید، یادوں کے گلاب، مکتبہ عالیہ، لاہور، ۱۹۸۸ء

جاوید اقبال، اپنا گریباں چاک، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

خلیق ابراہیم، منزلیں گرد کے مانند ، فضلی سنز، کراچی، اشاعت دوم۲۰۱۶ء

رانا نذرالرحمٰن، صبح کرنا شام کا ، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، اشاعت دوم ۲۰۱۶ء

سلیم اختر، ڈاکٹر، نشان جگر سوختہ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

سید مینو چہر، میرے شب وروز ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۹ء

شاہد حمید، گئے دن کی مسافت ، القا پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۶ء

شہرت بخاری، کھوئے ہوؤں کی جستجو، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

طاہر لاہوری، سوہنا شہر لاہور ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۳ء

غلام نبی، قصہ ایک صدی کا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ، ۲۰۰۴ء

فرخندہ بخاری، یہ بازی عشق کی بازی ہے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲ء

محمد سعید، آہنگ بازگشت ، کمانڈو پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۹ء

مرزا ادیب، مٹی کا دیا، سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۴ء
منیر احمد منیر، مشمولہ، اب وہ لاہور کہاں ؟ آتش فشاں، لاہور، ۲۰۲۰ء
منیر احمد منیر، مٹتا ہوا لاہور، ، ماہنامہ آتش فشاں، لاہور، ۲۰۱۹ء
مستنصر حسین تارڑ، لاہور آوار گی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۰ء
نثار عزیز بٹ، گئے دنوں کا سراغ ، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء
واصف ناگی، وہ لاہور کہیں کھو گیا ، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، جولائی ۲۰۲۱ء

ثانوی ماخذات

ابوالفضل علامی، آئین اکبری، (مترجم محمد فدا علی طالب)، جامعہ عثمانیہ سرکار عالی، حیدر آباد دکن، ۱۹۳۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو کراچی، پاکستان، ۱۹۹۹ء
انور سدید، ڈاکٹر، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمٹیڈ، دہلی، ۲۰۱۴ء
ایس ایم ناز، ڈاکٹر، لاہور نامہ، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء
ایل لاک ھارٹ، نادر شاہ، مترجمہ طاہر منصور فاروقی، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۸ء
بزم اردو (مرتب)، لاہور گائیڈ، رفاہ عام اسٹیم پریس، لاہور، ۱۹۰۹ء
تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، اردو ادب کی تاریخ (ابتدا سے ۱۸۵۷ تک)، سنگ میل پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۱۶ء
جی سی واکر، لاہور، مترجمہ یاسر جواد، الفیصل ناشران، لاہور، ۲۰۱۸ء
خاور جمیل (مرتب)، ادب، کلچر اور مسائل (ڈاکٹر جمیل جالبی کے ۵۶ تنقیدی و فکری مضامین)، رائل بک کمپنی، کراچی، ۱۹۸۶ء
سوم آنند، باتیں لاہور کی ، سیونتھ سکائی پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء
سید سبط حسن، پاکستان میں تہذیب کا ارتقا، مکتبہ دانیال، کراچی، طبع ہشتم ، ۱۹۸۹ء
سید محمد لطیف، تاریخ پنجاب، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۴ء

سید محمد لطیف، تاریخ لاہور، تخلیقات، لاہور، ۲۰۰۴ء

شری پرکاش، پاکستان: اس کا قیام اور ابتدائی حالات، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ۱۹۶۸ء

شمس الرحمان فاروقی، کئی چاند تھے سرِ آسماں، کراچی، شہر زاد، ۲۰۱۱ء

شیخ عزت اللہ، ہمارا پنجاب، فرینڈز لائبریری، لاہور، ۱۹۴۱ء

شیخ محمد اقبال، ڈاکٹر / لالہ رام پرساد، تاریخ ہند، ایجوکیشنل پبلشرز، لاہور ۱۹۱۳ء

شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور، ۲۰۰۵

صفدر محمود، ڈاکٹر، پاکستان: تاریخ وسیاست (۸۸ء- ۱۹۴۷ء)، جنگ پبلشرز، لاہور، ۱۹۹۰ء

طاہر طیب، ڈاکٹر، لاہور میں اردو افسانے کی روایت، مثال پبلشرز، فیصل آباد، ۲۰۱۵ء

عارف ثاقب، انجمن پنجاب کے مشاعرے، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء

عبد الحمید شیخ، قصے لاہور کے، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء

علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان، شاعری، مقبول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۲ء

غافر شہزاد، لاہور کے مینار، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷

غافر شہزاد، لاہور: گھر، گلیاں، دروازے، ادراک پبلی کیشنز، لاہور، اگست ۲۰۰۲ء

غلام حسین، ڈاکٹر، تاریخ یونیورسٹی اور ئینٹل کالج، جدید اردو پریس، لاہور، ۱۹۶۲ء

کنہیالال ہندی، تاریخ لاہور، (مرتب) کلب علی خاں فائق، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۷ء

کنول دھیر، ڈاکٹر، میں لاہور ہوں، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۲۰ء

گوہر نوشاہی، ڈاکٹر، لاہور کے چشتی خاندان کی اردو خدمات، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی، لاہور، ۱۹۹۳ء

ماسٹر امر ناتھ، لاہور کی سیر، انقلاب پریس، لاہور، ۱۹۲۸ء

محمد حفیظ الرحمن، ڈاکٹر، تصوف اور صوفیا کی تاریخ (عرب سے ہندوستان تک)، شاکر پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

محمد خلیل اللہ، تحریک پاکستان، ادارہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی، ۱۹۸۲ء

محمد دین فوق، لاہور عہد مغلیہ میں، ظفر برادرس تاجرانِ کتب، لاہور، ۱۹۲۷ء
محمد عبد اللہ چغتائی، ڈاکٹر، مساجد لاہور، کتاب خانہ نورس، لاہور، ۱۹۷۶
محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ (جلد اول)، مترجمہ عبد الحی خواجہ، مکتبہ ملت دیوبند، ۱۹۸۳ء
محمد نوشاد عالم، ڈاکٹر، اردو خود نوشت سوانح حیات: آزادی کے بعد، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۱
ممتاز حسین، پروفیسر، ادب اور شعور، فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹیڈ، کراچی، ۱۹۹۲ء
نور احمد چشتی، تحقیقاتِ چشتی، الفیصل پبلشرز، لاہور، ۲۰۱۴ء
وہاج الدین علوی، اردو خود نوشت: فن و تجزیہ، شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی، ۱۹۸۹ء
یونس ادیب، میرا شہر لاہور، علم و عرفان پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۳ء

مضامین

ریحانہ کوثر، اردو ناول میں لاہور کی تہذیب و ثقافت، مشمولہ، ادراک، مانسہرہ، شمارہ ۱۶
سعدیہ نور، جدید شعری رویوں کا مرکز، قدیم لاہور: ایک تعارف، مشمولہ، تحقیق نامہ، شمارہ ۶، شعبہ اردو جی یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۹ء
شہرت بخاری، پنجاب کی ادبی تحریکیں، مشمولہ، اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، مارچ۔ اپریل ۲۰۰۴ء
محمد زمان چیمہ، پنجاب: تہذیبی و ثقافتی اور اسلامی پس منظر کی روشنی میں، (مشمولہ) اوریئنٹل کالج میگزین، والیم ۸۴، پرچہ ۳، ۲۰۰۹ء

رسائل وجرائد

اخبار اردو، اسلام آباد، مقتدرہ قومی زبان، مارچ۔ اپریل ۲۰۰۴ء
ادراک، ہزارہ یونیورسٹی، مانسہرہ
الزبیر، آپ بیتی نمبر، بہاولپور، شمارہ نمبر ۷، ۱۹۶۴ء
تاریخ، سلسلہ نمبر ۳۳، تاریخ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۷ء

تاریخ، سلسلہ نمبر ۱۵، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۲ء
تاریخ، لاہور نمبر، تھاپ پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء
تحقیق نامہ، شعبہ اردو جی یونی ورسٹی لاہور، ۲۰۰۹ء
نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور، جلد اوّل، ، ۱۹۶۴ء
نقوش، لاہور نمبر، ادارہ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۶۲ء

مقالہ جات

حمیر اماجد، بیسویں صدی کے لاہور کا ادبی ماحول، مقالہ جی سی یونیورسٹی، لاہور، ۲۰۱۲ء
علی محمد خان، ڈاکٹر، لاہور کا دبستان شاعری، تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی، لاہور، ۱۹۸۸ء
ممتاز اختر مرزا، پنجاب میں اردو ادب کا ارتقا، ، مقالہ برائے پی ایچ ڈی، پنجاب یونیورسٹی، ۱۹۷۸
نسیمہ رحمان، اردو نثر کے ارتقا میں لاہور کی خدمات، مقالہ برائے پی ایچ ڈی اردو، لاہور ، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، ۲۰۱۰ء